زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
آتشِ زر
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

فہرست

آتشِ زر

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا.... دولت میں بڑی طاقت ہے' اس سے ہر شے خریدی جا سکتی ہے۔ یہ ہر مسئلے کو چٹکی بجاتے میں حل کرنے' ہر الجھن کو سلجھن میں بدلنے کی قدرت رکھتی ہے اور کسی بھی ناممکن کام کو پلک جھپکتے میں ممکن کر دکھاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر دولت حل المشکلات ہے۔

دولت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ بے شک اس سے بہت کچھ خریدا جا سکتا ہے' بلاشبہ یہ بہت سے معاملات میں بے حد آسانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ دولت کی فراوانی آپ کی زندگی کو پر آسائش' خوش گوار اور سہل بنا سکتی ہے مگر زندگی کے ہر شعبے میں دولت کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور دین و ایمان بنا لینا کسی بھی طور مثبت اور صحت مندرویہ نہیں کہلا سکتا۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی مثالیں بھی عام ہیں جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہے۔ وہ چاہیں بھی تو اپنی تمام دولت کو گن نہیں سکتے لیکن اس بے حد و بے شمار دولت کے باوجود بھی ان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی گوشہ کرب ناک محرومیوں سے جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی صاحب ثروت کسی ایسی بیماری میں مبتلا نظر آتا ہے جس کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا' کوئی دولت مند اپنے عارضے کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہے کہ پرہیز کے نام پر' اللہ کی پیدا کردہ چنیدہ نعمتیں اس کے لیے ممنوع اور خطرناک قرار دی جا چکی ہیں۔ کوئی لاولد ہے اور کوئی صاحب اولاد ہے تو اپنی اولاد کی نالائقی اور بے راہ روی کے ہاتھوں صبح و شام ایک نئی اذیت سے آشنا ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز کو وہ اپنی دولت سے خرید سکتا ہے مگر خالص گھریلو سکون اسے میسر نہیں۔ دولت کا پھاہا اس کے درد کا درماں نہیں بن سکتا۔

پس ثابت ہوا' تن درستی اور اولاد صالح دولت سے بڑی نعمتیں ہیں۔ دولت کبھی ان کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ اس درجہ بندی میں وہ ہمیشہ تیسرے قدمچے پر کھڑی نظر آتی ہے۔

آج میں آپ کی خدمت میں ماضی کے جس کیس کی روداد پیش کر رہا ہوں اس میں دولت کے لالچ کے باعث رونما ہونے والی تباہی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ ویسے تو کراچی میں پورا سال ہی موسم میں حدت کا عنصر شامل رہتا ہے لیکن جون جولائی واقعتاً موسم گرما کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک تپتی دوپہر کو میں عدالتی

مصروفیات سے فارغ ہو کر جب اپنے دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں دو افراد کو اپنا منتظر پایا۔ مذکورہ افراد میں سے ایک شخص وہیل چیئر پر تھا۔ میں ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے چیمبر میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری سیکریٹری نے انٹر کام پر مجھ سے پوچھا۔

"سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو کلائنٹ کو اندر بھیج دوں؟"

میں نے پوچھا۔ "کیا آج صرف دو کلائنٹ ہی اب تک آئے ہیں یا...؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "یا مجھ سے پہلے کوئی آ کر چلا گیا ہے؟"

کبھی کبھار ایسا ہو جاتا تھا کہ میرے دفتر پہنچنے سے قبل کوئی کلائنٹ ہو کر چلا جاتا تھا۔ ایسا عموماً اس صورت میں ہوتا تھا جب میں ذرا تاخیر سے دفتر پہنچتا تھا اور آج بھی میں لگ بھگ ایک گھنٹہ دیر سے دفتر آیا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنی سیکریٹری سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ علاوہ ازیں آج ایک شخص نے بھی مجھ سے ملنے آنا تھا۔

سیکرٹری نے جواب دیا۔ "نو سر! آپ کی آمد سے قبل کوئی شخص آ کر واپس نہیں گیا۔ ابھی تک بس یہی دو افراد آئے ہیں۔" پھر اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "ان میں بھی کلائنٹ تو ایک ہی ہے، دوسرا اس کے ساتھ آیا ہے۔"

"کلائنٹ کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "وہیل چیئر والا یا...؟"

"وہیل چیئر والا سر!" سیکریٹری نے بتایا۔ "دوسرا اس کا پڑوسی ہے جو بطور مددگار اس کے ساتھ یہاں آیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ان دونوں کو میرے پاس بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد وہ میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہیل چیئر والا شخص تو پہلے ہی اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا تاہم اس کا ساتھی، دوسرا شخص میری پیشکش پر ایک کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

میں چند لمحات تک سوالیہ نظر سے ان کا جائزہ لیتا رہا لیکن جب وہ دونوں خاموش رہے تو میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جی فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہیل چیئر پر براجمان شخص نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اچانک خواب سے چونک گیا ہو۔ پھر اس نے نحیف سی آواز میں اپنا تعارف کروایا۔ "وکیل صاحب! میرا نام انوار علی ہے اور یہ میرا پڑوسی عبدالقادر ہے۔ میں عبدالقادر کے سہارے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے امید ہے، آپ میرا مسئلہ حل کر دیں گے۔ میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے بیگ صاحب!"

میں نے کہا۔ "تعریف اس خدا کی جس نے مجھے، آپ کو اور ہم سب کو بنایا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" انوار علی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "بے شک اصل تعریف کے لائق تو وہی ذات پاک ہے مگر اس دنیا میں ایک انسان ہی دوسرے انسان کے کام آتا

ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے انوار علی صاحب!" میں نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

میرے اس سوال پر انوار علی نامی شخص خیالوں میں کھو گیا۔ وہ خاصا نڈھال اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہو گی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ دونوں ٹانگوں سے معذور تھا جس کی وجہ سے وہ وہیل چیئر استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ انوار علی کے ساتھ آنے والے شخص کی عمر کم و بیش پینتالیس سال تھی۔ وہ ایک صحت مند اور چاق چوبند شخص تھا۔

انوار علی بدستور خیالوں میں گم تھا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو انوار علی کے بجائے عبدالقادر نے جواب دیا۔ "وکیل صاحب! دراصل انوار بھائی آج کل بہت پریشان ہیں۔ انہیں ایک وہم سا ہو گیا ہے۔"

"مجھے کوئی وہم نہیں ہے۔" انوار علی نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ وہ عبدالقادر کی بات سن کر اچانک خیالوں سے لوٹ آیا تھا اور خاصا ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے شکایتی انداز میں اپنے ساتھی عبدالقادر کو دیکھا۔ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! سب لوگوں کا خیال ہے حتیٰ کہ عبدالقادر بھی یہی سمجھتا ہے کہ میں خواہ مخواہ کسی وہم میں مبتلا ہوں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں وہ وہم نہیں بلکہ سچائی ہے۔"

"اور وہ سچائی کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

میرے سوال پر انوار علی ایک مرتبہ پھر کسی گمبھیرتا میں ڈوب گیا۔ میں نے عبدالقادر کی جانب دیکھا۔ وہ میری نظر کا مفہوم سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

"بیگ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ انوار بھائی کو شک.... میرا مطلب ہے، انوار بھائی کا خیال ہے کہ ان کا داماد انہیں قتل کرنا چاہتا ہے۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ انوار علی نے دوبارہ ہوشیار ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ عارف میری جان لینا چاہتا ہے۔ جس طرح اس نے میری غزالہ کی جان لی ہے۔" اپنی بات کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے وہ خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔

میں اس وقت عجیب صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میں نے انوار علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "محترم! آپ کی الجھن زدہ باتوں سے میں کچھ بھی سمجھ نہیں پایا ہوں۔ آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔ عارف اور غزالہ کون ہیں اور آپ کا داماد کیوں آپ کی جان لینا چاہتا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں.... سب کچھ بتاتا ہوں۔" انوار علی وہیل چیئر میں سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا "بیگ صاحب! عارف محمود میرے اس خبیث داماد کا نام ہے جو میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ غزالہ

میری اکلوتی بیٹی تھی۔ اس ظالم نے میری پیاری بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اب....'' اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے حالات کی نزاکت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا۔ ''انوار صاحب! آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے داماد عارف محمود نے آپ کی اکلوتی بیٹی کو قتل کر دیا ہے؟''

''جی ہاں، یہ حقیقت ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''انوار صاحب! اگر واقعی آپ کے داماد نے آپ کی اکلوتی بیٹی کو قتل کیا ہے تو اس وقت اسے قانون کی گرفت میں ہونا چاہیے۔ وہ آپ کو قتل کرنے کی کوشش کس طرح کر سکتا ہے؟''

''قانون کی گرفت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو بے بس اور بے سہارا ہوتے ہیں۔'' انوار علی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''عارف محمود جیسے شاطر چالباز قانون کو اپنے ہاتھوں کا کھلونا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس سے کھیلتے رہتے ہیں۔ عارف بھی آزادانہ دندناتا پھرتا ہے۔ قانون اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا اور اب وہ مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی پلاننگ کر رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انوار علی صاحب! یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ آپ کو میرے پاس آنے کے بجائے اپنے علاقے کے تھانے میں جانا چاہیے تھا۔ میں بھلا اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''آپ مایوس کرنے والی باتیں نہ کریں بیگ صاحب!'' انوار علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں بہت آس امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے نہایت ہی اہم سوال کیا۔ ''میرے پاس آنے کے بجائے آپ نے پولیس کی مدد لینے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''میں تھانے بھی گیا تھا۔'' انوار علی مایوس کن لہجے میں بتایا۔ ''مگر تھانے دار کو میری بات پر اعتبار نہیں آیا۔ اس کا خیال ہے کہ غزالہ کی بہیمانہ موت نے مجھے ذہنی طور پر متاثر کیا ہے اور میں اپنے داماد کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا ہوں حالانکہ نہ تو عارف نے غزالہ کو قتل کیا تھا اور نہ ہی وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ غزالہ کا قتل ایک حادثہ تھا...... ڈکیتی کی واردات میں مزاحمت پر ایک ڈاکو نے اس کا گلا گھونٹ کر جان سے مار ڈالا تھا مگر میں پولیس والوں کی اس تھیوری پر یقین نہیں کر سکتا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ عارف ہی نے ڈکیتی کا ڈراما رچا کر غزالہ کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا اور اب مجھے بھی اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بہت کائیاں اور مکار شخص واقع ہوا ہے حالانکہ شادی کے وقت اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک وہ بہت اچھا اور بااخلاق ثابت ہوا تھا مگر یہ سب اس کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ اچھائی کا لبادہ اوڑھ کر رفتہ رفتہ اپنے مقصد کی جانب قدم بڑھا رہا تھا اور وہ اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا ہے۔ صرف میرا کانٹا باقی ہے۔ شاید وہ مجھے بھی جلد از جلد اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا ہے تاکہ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا حتمی مالک بن سکے۔''

انوار علی کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ جائیداد کے حتمی مالک بننے کا کیا قصہ ہے؟''

انوار علی نے میرے سوال کا طویل ترین جواب دیا جس کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ عارف محمود کی حیثیت گھر داماد ایسی تھی۔ اس نے دولت و جائیداد کے لالچ میں غزالہ سے شادی کی تھی۔ انوار علی اپنی بیٹی کے ساتھ گلشن اقبال کے جس بنگلے میں رہ رہا تھا وہ غزالہ کے نام تھا۔ علاوہ ازیں ایک چلتی ہوئی گارمنٹ فیکٹری بھی غزالہ کے نام تھی۔ جب تک ٹریفک کے ایک حادثے میں انوار علی اپنی ٹانگوں سے معذور نہیں ہوا تھا، وہ گارمنٹ فیکٹری کی دیکھ بھال از خود کرتا تھا۔ معذوری اور لاچاری نے اسے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا تھا پھر جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ وہ عارضہ قلب میں بھی مبتلا ہو چکا ہے تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ غزالہ اس وقت تک جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ انوار علی نے پہلی فرصت میں بنگلا اور گارمنٹ فیکٹری بیٹی کے نام منتقل کر دی تاکہ اس کی ''رخصت'' کے بعد غزالہ کے لیے کسی قسم کی پریشانی پیدا نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی انوار علی نے غزالہ کی شادی کا منصوبہ بھی بنا ڈالا۔ اس نے اخبار میں رشتے کا اشتہار دیا اور اس بات کی وضاحت کر دی کہ صرف وہی حضرات رجوع کریں جو گھر داماد بن کر رہنا پسند کر سکیں۔ اشتہار میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ لڑکی ایک شاندار دو منزلہ بنگلے اور ایک گارمنٹ فیکٹری کی مالک تھی۔ یہ ایک طرح کا لالچ تھا اور یہ لالچ اس لیے دیا گیا تھا کہ غزالہ میں ایک نقص موجود تھا۔ ویسے تو وہ صحت مند اور قبول صورت لڑکی تھی لیکن اس کی آنکھوں کے زاویے میں کچھ ''فرق'' تھا۔ وہ بہ یک وقت مشرق و مغرب میں تکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ خیر یہ کوئی بہت بڑا عیب نہیں تھا خاص طور پر بنگلے اور گارمنٹ فیکٹری کی مالک ہوتے ہوئے ایسے نقائص کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انوار علی کا اپنی بیٹی غزالہ کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور اب اس کا بھی چل چلاؤ تھا اس لیے وہ غزالہ کو کسی مضبوط ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔

انوار علی کی اشتہاری کوشش کے نتیجے میں عارف محمود اس کا داماد بن کے بنگلے میں آ گیا۔ انوار علی کے بہ قول، شادی کے بعد کچھ عرصے تک وہ نہایت ہی فرمانبردار داماد اور ذمے دار شوہر ثابت ہوا۔ پھر اس نے سینگ نکالنا شروع کر دیے۔ رفتہ رفتہ انوار علی کو یقین ہو گیا کہ عارف محمود نے محض دولت و جائیداد کے لیے غزالہ سے شادی کی تھی پھر ایک رات ڈکیتی کی واردات میں غزالہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انوار علی کا خیال تھا کہ وہ سب کچھ عارف محمود کا کیا دھرا تھا۔ غزالہ کی موت کے بعد تمام دولت و جائیداد کا وہ مالک بن جاتا چنانچہ اس نے ڈکیتی کا خودساختہ ڈراما رچا کر غزالہ کو اپنے راستے سے ہٹا دیا اور اب انوار علی کو محسوس ہو رہا تھا کہ عارف محمود اسے بھی اپنے راستے سے، کسی کنکر کی طرح ٹھوکر مار کر دور پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس خیال نے انوار علی کو خاصا خوف زدہ کر رکھا تھا۔

میں نے پوری توجہ اور تحمل سے انوار علی کا موقف سنا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔

''آپ کی بیٹی کی موت واقع ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''تقریباً چھ ماہ قبل وہ واقعہ پیش آیا تھا۔''

''غزالہ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''دو سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔''

''اوہ تو گویا شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد وہ اندوہناک سانحہ پیش آیا تھا'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''یعنی ڈکیتی کی واردات والا واقعہ!''

انوار علی نے کہا۔ ''وہ کسی بھی طرح ڈکیتی نہیں تھی۔ میں اسے عارف کی سازش ہی کہوں گا۔''

''بہر حال۔'' میں نے باری باری عبدالقادر اور انوار علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو ہونا تھا' وہ تو ہو گیا مگر اس کے بعد آپ کا کردار کیا رہا تھا؟'' آخری جملہ میں نے انوار علی کو مخاطب کرتے ہوئے ادا کیا تھا۔ ''کیا آپ نے پولیس کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا تھا؟''

انوار علی نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔ ''میں نے انہیں سب کچھ تفصیلاً بتایا تھا مگر پتہ نہیں' پولیس والوں کے سوچنے کا انداز کیا ہوتا ہے۔ عارف محمود پر میرے شک کو انہوں نے ذرا اہمیت نہ دی۔ وہ بس یہی کہتے رہے کہ ڈکیتی کی واردات میں مزاحمت کرنے پر غزالہ نے اپنی جان گنوائی ہے تاہم انہوں نے مجھے تسلی دی تھی کہ وہ بہت جلد ڈاکوؤں کو ڈھونڈ نکالیں گے اور مال مسروقہ بھی برآمد کر لیں گے۔''

''مال مسروقہ میں کیا' کیا شامل تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''نقدی بچپن ہزار' مختلف قسم کے زیورات مالیت لگ بھگ ایک لاکھ روپے اور تیس ہزار کے پرائز بانڈز وغیرہ۔''

''گویا لگ بھگ دو لاکھ کا نقصان ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔

''دو لاکھ پر لعنت بھیجیں جناب۔'' انوار علی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اصل نقصان تو غزالہ کی جان کا زیاں ہے جو کسی بھی طور اور کسی بھی قیمت پر پورا نہیں کیا جا سکتا اور اس سازش کا روح رواں عارف میرے گھر میں میری نظر کے سامنے دندناتا پھرتا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اب میری جان لینے کی پلاننگ بھی کر رہا ہے۔ میں سخت خوف زدہ ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا' اس کا کیا علاج کروں۔ آپ ہی میری مدد فرمائیں۔ میں اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔''

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''محترم انوار علی صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ آپ کے معاملات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ اب آپ ہی بتا دیں کہ میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

''پولیس کے پاس تو پہلے بھی جا کر دیکھ لیا ہے۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ ''وہ کچھ نہیں سنتے۔ اپنی ہی بولتے رہتے ہیں۔ مجھے ان سے تعاون کی کوئی امید نہیں ہے۔''

''پھر میں آپ کے لیے کیا کروں؟''

''آپ کسی طرح اس ناگ کا علاج کر دیں بیگ صاحب!''

''ناگ سے آپ کی مراد عارف محمود ہے؟''

''جی ہاں' بالکل وہی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو کس طرح محسوس ہوا کہ آپ کا داماد آپ کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہا ہے؟''

''بس مجھے محسوس ہوتا ہے۔''

''بس سے کام نہیں چلے گا انوار صاحب!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ کے محسوسات کی کوئی مضبوط وجہ ہونا چاہیے۔ کیا کوئی ایسا ثبوت ہے آپ کے پاس جس سے ثابت کیا جا سکے کہ عارف محمود آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ کیا اس نے اس ذیل میں کوئی عملی کوشش کی ہے؟''

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس اس مردود کے عزائم کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''کیا' یہ آپ کا وہم نہیں ہو سکتا۔''

''آپ بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو دوسرے لوگ کہتے ہیں۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔''

میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں انوار صاحب! بات آپ کو جھوٹا یا سچا سمجھنے کی نہیں ہے۔ میں ایک وکیل ہوں اور میرا کام عدالت میں مقدمات لڑنا ہے۔ میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عدالت دل کے کہنے پر یقین نہیں کرتی۔ وہ ہر دعوے کے لیے ٹھوس اور سچا ثبوت مانگتی ہے۔ عدالت میں اپنے موقف کو سچا ثابت کرنے کے لیے بہت زور لگانا پڑتا ہے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کا داماد آپ کی بیٹی کا قاتل ہے اور اب آپ کو بھی موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے تو آپ کو پہلی فرصت میں پولیس سے رجوع کرنا چاہیے۔''

''پولیس سے رجوع کرنے پر مایوسی ہوئی جناب!''

میں نے پوچھا۔ ''انوار صاحب! جب غزالہ کو سانحہ پیش آیا تھا تو آپ نے پولیس کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تھا؟''

''جی ہاں کیا تھا۔'' اس نے بد دلی سے کہا۔

''پھر انہوں نے اس سلسلے میں کیا کارروائی کی تھی؟''

''وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ غزالہ کو اس کے شوہر نے ٹھکانے لگایا تھا'' انوار علی نے بتایا۔ ''وہ بھی ڈاکوؤں والی کہانی کو سچا سمجھ رہے تھے۔ ان کا سارا زور اس بات پر تھا کہ جب غزالہ کی موت واقع ہوئی' اس وقت عارف اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔''

"یعنی عارف کی رات کی ڈیوٹی تھی؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں اس کی ہمیشہ رات ہی کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔"

"عارف محمود کرتا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک اخبار میں سب ایڈیٹر ہے۔" انوار علی نے بتایا۔ "رات سات بجے سے صبح دو بجے تک وہ ڈیوٹی دیتا ہے۔ میری بدقسمتی کہ میں نے غزالہ کی شادی کے لیے اسی اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ نتیجے میں عارف محمود میرا داماد بن گیا۔ اس نے خود کو تن تنہا بتایا تھا اس لیے بھی میں نے فوراً اس کا رشتہ قبول کرلیا۔ ایک گھر داماد کے لیے اس میں ساری خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہی شخص بعد میں میری بیٹی کا قاتل بن جائے گا۔"

وہ روہانسا ہوگیا۔ اس کے لہجے سے سچائی ٹپکتی تھی مگر افسوس کا مقام یہ تھا کہ وہ اپنی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اپنے پاس کوئی سامان نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ یہ دنیا بڑی ظالم جگہ ہے۔ یہاں بعض اوقات سچ کو تسلیم کروانے کے لیے اُسے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ انوار علی بھی دنیا کے اسی ظلم کا شکار نظر آتا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ ایک بنگلے میں رہ رہا تھا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی اکلوتی چہیتی بیٹی کا قاتل تھا اور اب اس کی جان لینے کے درپے تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انوار علی ٹانگوں سے معذور تھا مگر موجودہ صورتِ حال نے اسے ذہنی طور پر بھی مفلوج کررکھا تھا۔

میں نے پرخلوص انداز میں کہا۔ "انوار صاحب! اگر پولیس نے آپ کے خدشات کو اہمیت نہیں دی تھی تو آپ انصاف کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے۔"

"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا بیگ صاحب!"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے داماد کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کرسکتے تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ کام سرکاری وکیل کے ذریعے ہی ہوتا۔ آپ اپنے داماد پر مقدمہ کرنے کے لئے پرائیویٹ وکیل کی خدمات بھی حاصل کرسکتے تھے مگر بات وہی ہے کہ آپ کے پاس اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب!" انوار علی نے تصدیقی لہجے میں کہا۔ "مجھے اسی وقت عارف کے خلاف استغاثہ دائر کردینا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں' مجھے اس وقت یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا..... اور جہاں تک اپنے موقف کی سچائی ثابت کرنے کی بات ہے تو جب انسان کسی راہ پر قدم رکھ دیتا ہے تو راستہ خود بخود بننے لگتا ہے۔"

میں نے تائید کی۔ "آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ غزالہ کی موت کے پیچھے عارف کا ہاتھ ہے تو کوئی ہوشیار وکیل آپ کے یقین کو عدالت میں سچ ثابت کرنے کے لیے چار جوئی کرسکتا تھا۔ جب حالات کی کوئی ایک کڑی ہاتھ میں آجائے تو باقی کڑیاں خود بخود سامنے آتی چلی

جاتی ہیں۔ پھر بہت جلد زنجیر مکمل ہوجاتی ہے۔ آپ کو ضرور کسی پرائیویٹ وکیل سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔"

اس کے چہرے پر ایک چمک نمودار ہوئی۔ وہ جب بولا تو اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کا اعتماد تھا۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "بیگ صاحب! میں اس موقع پر یہی کہوں گا..... دیر آید درست آید۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں انوار صاحب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ بھی تو ایک پرائیویٹ وکیل ہیں اور میری نظر اور معلومات کے مطابق آپ خاصے چابک دست اور ہوشیار وکیل ہیں۔ کیوں نہ آپ کی مدد سے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے!"

گڑے مردے اکھاڑنا ایک محاورہ ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ جب بھی کوئی گڑا مردہ اکھاڑا جاتا ہے تو وہ کوئی کہانی ضرور سناتا ہے۔ کوئی انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے موجودہ تجویز پر غور کیا اور انوار علی کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"انوار علی صاحب! آپ کی پیشکش کو قبول کرنے میں' میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا مگر اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "اگر مجھے عارف کے آسیب سے نجات مل جائے تو اس سے زیادہ اچھی اور کیا بات ہوگی۔ میں آپ کی فیس ایڈوانس دینے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "فیس تو میں پیشگی ہی لیتا ہوں مگر....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "مگر کیا بیگ صاحب؟"

میں نے کہا۔ "مگر یہ کہ پہلے آپ مجھے اوّل تا آخر تمام حالات سے آگاہ کریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کیس کی نوعیت کیا بنتی ہے۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق واقعی عارف نے آپ کی بیٹی غزالہ کو قتل کیا ہے تو پھر میں اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

"اگر ایسا ہوجائے تو میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔"

"ایسا ہونا عین ممکن ہے انوار علی صاحب!"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!"

میں نے کہا۔ "انوار صاحب! میرے روز و شب جرم وسزا کی فضا میں گزرتے ہیں۔ بہت سے بے گناہ اور مجرم میری نظر سے گزرتے ہیں۔ میں کھوٹے اور کھرے کی بخوبی پہچان رکھتا ہوں۔ آپ کی باتوں نے مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔ مجھے آپ کے لہجے میں سچائی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے بیگ صاحب۔" وہ ممنونیت سے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور اس مردہ کیس میں جان ڈال دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "حقائق کو سامنے لانا آپ کا کام ہے پھر آگے آگے دیکھتے جائیں' کیا ہوتا ہے۔ کوشش کرنا میرا کام ہے اور مجھے اپنا کام کس طرح کرنا ہوگا' یہ میں بخوبی جانتا ہوں۔"

"تو میں آپ کو پوری کہانی ابتدا سے سناتا ہوں۔" انوار علی نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔" میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں ہمہ تن گوش ہوں۔ آپ شروع ہو جائیں۔"

اور وہ شروع ہوگیا۔

قارئین کرام! انوار علی کی کہانی لگ بھگ تین گھنٹے میں مکمل ہوئی تھی۔ آپ کی دلچسپی اور معلومات کی خاطر میں چیدہ چیدہ اور نہایت ہی اہم باتیں یہاں تحریر کروں گا تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہ بتاتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں اور کچھ باتوں کا پتہ میں نے اپنے طور پر چلایا تھا تاہم واقعات کی ترتیب کے پیشِ نظر میں ایک ساتھ بیان کر رہا ہوں۔

❁ ❁ ❁
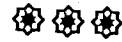
انوار علی نے محبت کی شادی کی تھی۔

انوار علی کو نورین نامی ایک لڑکی سے شدید قسم کا عشق ہوگیا تھا۔ اس دور کے لوگ ان دونوں کی حالت دیکھ کر اسے افلاطونی عشق کا نام دیتے تھے۔ انوار علی کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی کوشش بار آور ثابت ہوئی اور ہزار مخالفت کے باوجود بھی نورین سے اس کی شادی ہوگئی۔

غزالہ ان کی پہلی اور اکلوتی اولاد تھی۔ غزالہ جب تین سال کی تھی تو نورین اپنے عاشق شوہر کو داغِ مفارقت دے گئی۔ اس موقع پر اکثر لوگوں نے انوار علی کو یہی مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے تاکہ غزالہ کو کسی کمی کا احساس نہ ہو مگر انوار علی کسی اور ہی انداز سے سوچتا تھا۔ اس نے نورین سے سچی محبت کی تھی۔ اسے کسی بھی طرح یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی اور عورت نورین کی جگہ لے پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ غزالہ پر سوتیلی ماں کا سایہ پڑے چنانچہ اس نے دوسری شادی کی تمام تجاویز کو رد کر دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ بیک وقت ماں اور باپ بن کر غزالہ کی پرورش کرے گا۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا جو اس نے خود کو دیا تھا۔

پھر اس نے ایسا کر بھی دکھایا۔ غزالہ کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جب غزالہ نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو انوار علی پوری سنجیدگی سے اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگا جیسا کہ ہر معقول باپ سوچتا ہے۔

غزالہ بے انتہا خوب صورت نہ سہی مگر واقعتاً قبول صورت ضرور تھی۔ اس کے ساتھ وہ تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار بھی تھی۔ اس کے لیے ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ وہ صاحب جائداد بھی تھی۔ ایک حادثے میں انوار علی اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم ہوگیا تھا۔ اس پر دل کے مرض نے اس کا حوصلہ توڑ دیا تھا۔ اسے اپنی زندگی کا بھروسا نہیں رہا تھا چنانچہ اس نے فرسٹ ہارٹ اٹیک کے بعد شان دار دو منزلہ بنگلا اور چلتی ہوئی گارمنٹ فیکٹری اپنی زندگی ہی میں غزالہ کے نام کر دی تھی۔ وہ ایسا نہ بھی کرتا تو یہ سب کچھ قانوناً غزالہ ہی کا تھا مگر وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو کسی قسم کی قانونی پیچیدگی میں الجھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے زندگی ہی میں اس نے اپنا سب کچھ غزالہ کے نام کر دیا تھا۔

اس پس منظر میں غزالہ کی پوزیشن خاصی مستحکم تھی۔ اس کے لیے اچھے سے اچھا رشتہ آ سکتا تھا مگر اس قدر استحکام کے باوجود بھی اس میں ایک ایسا عیب تھا کہ انوار علی کو کوئی معقول اور مناسب رشتہ تلاش کرنے میں دانتوں پسینہ آ گیا۔ غزالہ کی دونوں آنکھوں کے زاویے میں کچھ گڑبڑ موجود تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بیک وقت دائیں اور بائیں دیکھ رہی ہو۔

دنیا میں لولوں' لنگڑوں اور اندھوں' بہروں کی بھی شادیاں ہو جاتی ہیں مگر اس سلسلے میں کہیں نہ کہیں مصلحت کوشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ انوار علی کا ایک مطالبہ ایسا تھا کہ اگر کہیں بات بننے بھی لگتی تھی تو بنتے بنتے بگڑ جاتی تھی۔ انوار علی کی خواہش تھی کہ اسے کوئی گھر داماد مل جائے۔ دراصل اس طرح وہ اپنی تنہائی دور کرنا چاہتا تھا۔ اگر غزالہ بیاہ کر کسی اور گھر چلی جاتی تو دو منزلہ بنگلا چند ہی روز میں اس کا مدفن بن جاتا۔ وہ غزالہ کے بغیر وہاں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غزالہ درحقیقت اس کی محبت کی نشانی تھی۔ وہ اسے اپنی نگاہ سے دور کیسے کر سکتا تھا۔

جب بھری پری فیملی والوں میں اسے اپنے مطلب کا رشتہ نہ ملا تو اس نے کسی ایسے شخص کی تلاش شروع کر دی جو اس دنیا میں تنہا ہو تاکہ گھر داماد بنتے ہوئے اسے کسی قسم کے معاشرتی اور خاندانی دباؤ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک روزنامے میں اشتہار بھی دیا۔ اشتہار میں اس امر کو فلیش کیا گیا تھا کہ لڑکی ایک خوب صورت دو منزلہ بنگلے اور گارمنٹ فیکٹری کی اکلوتی مالک ہے۔ لڑکے کو گھر داماد کی حیثیت سے اپنی سسرال میں رہنا ہوگا۔ اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی تھی کہ سسرال میں غزالہ اور اس کے باپ کے سوا اور کوئی فرد نہیں ہے۔

اس اشتہار کے شائع ہونے کے بعد بہت سے من چلے طالع آزما انوار علی کے بنگلے پر پہنچنے لگے۔ انوار علی نے ابتدائی انٹرویو میں ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ سب گارمنٹ فیکٹری اور بنگلے کے لالچ میں وہاں حاضر ہوئے تھے۔ آخر تیسرے روز ایک معقول اور مناسب رشتے پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔

یہ رشتہ عارف محمود کا تھا۔ عارف ہر لحاظ سے انوار علی کے معیار اور مطالبے پر پورا اترتا تھا۔ وہ اس دنیا میں تن تنہا تھا' تعلیم یافتہ اور خوب رو بھی تھا۔ اس کے پاس باعزت ملازمت تھی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ انوار علی نے جس اخبار میں وہ اشتہار دیا تھا' عارف محمود کی ملازمت بھی اسی اخبار میں

تھی۔ وہ وہاں سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔ صحافت کو ہمیشہ سے معاشرے میں قابلِ احترام پیشہ سمجھا جاتا ہے اور صحافی کو لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

جب انوار علی نے عارف محمود کا انٹرویو کیا تو وہ پاس ہو گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد انوار علی نہایت ہی اہم امور کی جانب آ گیا۔ اس نے عارف محمود سے سوال کیا۔

"تم آج کل کہاں رہ رہے ہو؟"

"محمود آباد میں انکل۔" عارف محمود نے جواب دیا۔

"گھر تمہارا اپنا ہے؟"

"جی نہیں' میں ایک گھر کے پورشن میں رہ رہا ہوں۔" عارف نے بتایا۔ "اور وہ پورشن کرایے کا ہے۔ میں ہر ماہ باقاعدگی سے اس کا کرایہ دیتا ہوں۔"

انوار علی نے کہا۔ "فکر نہیں کرو بیٹا! اگر ہمارے درمیان کوئی بات بن جاتی ہے تو تمہیں ہمیشہ کے لیے کرایے کے مکان سے نجات مل جائے گی۔"

عارف' انوار کی بات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ تاہم پھر بھی انوار نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا اور کہا۔ عارف اس دوران میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

"عارف صاحب! آپ نے اشتہار تو اچھی طرح پڑھ لیا ہے نا۔"

"جی انکل!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مودب لہجے میں بولا۔ "یہ اشتہار تو چھپنے سے پہلے بھی میری نظر سے گزرا تھا۔ بس آپ کو اپروچ کرنے میں چند دن لگ گئے شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہو۔"

انوار علی نے تصدیقی لہجے میں کہا۔ "بالکل بیٹے! قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ تم دیر سے آئے ہو مگر بالکل درست آئے ہو۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس اشتہار کو پڑھ کر کیسے کیسے رشتے میری بیٹی کا ہاتھ تھامنے چلے آئے تھے۔ لالچ اور حرص و ہوس کے بہت سے شیڈ دیکھے ہیں میں نے ان چند دنوں میں۔"

"جی انکل' یہ دنیا ہے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ بستے ہیں۔" عارف محمود نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

انوار علی زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "ویسے میں ایک بات کا قائل ہو گیا ہوں۔"

"کون سی بات انکل؟" عارف نے پوچھا۔

"بھئی یہی بات کہ تمہارے اخبار کا ریسپونس بہت اچھا ہے۔" انوار علی نے کہا۔ "میں نے گزشتہ دو تین دن میں لگ بھگ پچاس افراد کے انٹرویو کئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے میری نگاہِ انتخاب صرف ایک رشتے پر ٹھہری ہے۔"

اتنا کہہ کہ انوار علی ٹٹولتی ہوئی نظر سے عارف محمود کا جائزہ لینے لگا۔ عارف نے صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک دو مرتبہ پہلو بدلا اور سوالیہ نگاہ سے انوار علی کو دیکھنے لگا۔ انوار علی نے بات کو آگے بڑھاتے

ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹا! میں کسی بھی طرح سے تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ شادی کے بعد تمہیں مستقلاً ہمارے ساتھ اسی بنگلے میں رہنا ہو گا۔ یعنی گھر داماد کی حیثیت سے۔ تمہیں کوئی بزرگ مل جائے گا اور مجھے ایک بیٹا۔ تم نے اپنی جو کہانی سنائی ہے اس کے مطابق تم اس دنیا میں یکہ و تنہا ہو۔ تمہارے لیے تو یہ ایک آئیڈیل سچویشن ہو گی۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

عارف محمود نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔ "انکل! میرا خیال آپ کے خیال کی تائید کرتا ہے۔ میں نے آپ کی باتوں سے محسوس کیا ہے کہ آپ نے مجھے ہونے والے داماد کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟"

"ہاں بیٹا' تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" انوار علی نے کہا۔ "بس دو چار ضروری باتیں طے کرنا باقی ہیں۔"

"آپ حکم کریں' میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔" عارف پر جوش لہجے میں بولا۔

انوار علی نے کہا۔ "یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ مجھے تمہاری یہ ادا بہت پسند آئی ہے بیٹے۔ مجھے امید ہے اب میں تم سے جو باتیں کرنے والا ہوں' تم ان سے بھی اتفاق کرو گے۔"

عارف محمود باادب باملاحظہ ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ انوار علی چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ شادی کے بعد تم ہمارے ساتھ اسی بنگلے میں رہو گے۔ میں اور کتنے دن جی لوں گا۔ میرے بعد یہ سب کچھ تم دونوں کا ہی ہے۔ غزالہ ایک عرصے سے میرے کاروبار کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اب تم بھی پوری طرح اس کا ساتھ دو گے کیونکہ تم دونوں زندگی کے ساتھی بننے جا رہے ہو۔"

"میں آپ کی ہر ہدایت پر عمل کروں گا انکل!"

انوار علی نے کہا۔ "تم اب تک یہ تو جان ہی چکے ہو کہ یہ بنگلا اور گارمنٹ فیکٹری غزالہ کے نام ہے۔ بس میں نے ایک چھوٹی سی بات ابھی تک تم سے پوشیدہ رکھی ہے۔ میرا خیال ہے' اب اس مسئلے پر بھی بات کر ہی لی جائے۔"

عارف محمود چوکنا ہو گیا' اضطراری لہجے میں بولا۔ "آپ کس مسئلے کا ذکر کر رہے ہیں انکل؟"

انوار علی نے پوچھا۔ "کیا تم نے کبھی غزالہ کو دیکھا ہے؟"

عارف نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آج میں پہلی مرتبہ آپ کے گھر آیا ہوں۔ غزالہ کو دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

انوار علی کچھ سوچنے لگا۔ عارف محمود کو انوار کا انداز کسی شک میں ڈال رہا تھا۔ جب چند لمحے انوار علی خاموش رہا تو اس نے تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔ "انکل! آپ کسی مسئلے کے بارے میں کچھ بتانے جا رہے تھے؟"

انوار علی نے نگاہ اٹھا کر عارف محمود کو دیکھا اور نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں بولا ''بیٹا! جو بات بعد میں کھلنا ہے اس کا ذکر پہلے ہی کر لینا مناسب ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ عارف محمود کی تشویش فزوں تر ہو گئی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد انوار علی نے بتایا۔ ''بات دراصل یہ ہے عارف کہ غزالہ میں ایک چھوٹا سا جسمانی نقص ہے۔ ویسے وہ کوئی خطرناک نقص نہیں۔ آج کل امریکا اور برطانیہ وغیرہ میں میڈیکل کے مختلف شعبوں میں بہت ایڈوانس کام ہو رہا ہے۔ تم اگر اسے علاج کے لیے بیرون ملک لے جاؤ تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اس طرح تم لوگوں کی تفریح بھی ہو جائے گی۔ میں ناکارہ آدمی اس سلسلے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھا سکتا۔ ہاں' البتہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ غزالہ کے علاج کے تمام اخراجات میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔''

عارف اس طولانی گفتگو سے کوفت محسوس کر رہا تھا۔ انوار علی کی بات ختم ہوئی تو اس نے جلدی سے کہا۔ ''آپ غزالہ کے کون سے جسمانی نقص کے بارے میں بات کر رہے ہیں انکل؟''

اس سوال کے جواب میں انوار علی نے اپنے ہونے والے داماد کو غزالہ کی آنکھوں کے نقص کے بارے میں بالتفصیل بتا دیا۔ عارف محمود پوری توجہ سے اپنے ہونے والے سسر کی بات سنتا رہا اور آخر میں نہایت ہی جذباتی لہجے میں بولا۔

''انکل! یہ کون سی خاص بات ہے۔ میں تو اسے کوئی جسمانی عیب نہیں سمجھتا۔ غزالہ کے ساتھ جو مسئلہ ہے اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ یہ سب تو قدرت کی طرف سے ہے۔ میرے خیال میں اس نقص کے علاج کے لیے امریکا یا انگلینڈ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ہر حال میں غزالہ سے شادی کرنا منظور ہے۔''

''میں اٹھ کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔'' انوار علی نے فرط جذبات سے کہا۔ ''ورنہ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر تمہیں گلے سے لگا لوں۔ تم ایک عظیم انسان ہو عارف محمود!''

عارف نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''انکل! آپ مجھے خواہ مخواہ شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں کہاں عظیم ہوں۔ عظیم تو آپ ہیں جو مجھے اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میں اس وقت خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''اور جہاں تک گلے لگنے یا لگانے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود آپ کے گلے لگ جاتا ہوں۔''

پھر عارف محمود نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے الفاظ کو عمل کا لباس پہنا دیا۔

''تم واقعی میرا بیٹا ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں عارف۔'' انوار علی اسے بھینچتے ہوئے بولا۔

''بس آج سے تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے غزالہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔''

پھر آئندہ ماہ عارف محمود گھر داماد کی صورت انوار علی کے بنگلے میں منتقل ہو چکا تھا۔ انوار علی اپنی جگہ بے پناہ خوش تھا کہ اس کی بیٹی ایک ٹھیک ٹھاک ٹھکانے سے لگ گئی۔ دوسری جانب عارف محمود کی

خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کے دل میں مسرت کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اس کی تو بیٹھے بٹھائے لاٹری کھل گئی تھی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد تک تو سب کچھ ٹھک ٹھاک چلتا رہا۔ عارف محمود انتہائی مہذب اور شائستہ داماد ہونے کے ساتھ ساتھ ذمے دار شوہر بھی ثابت ہوا مگر پھر رفتہ رفتہ اس کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ اب وہ پہلے والا عارف نہیں رہا تھا۔ انوار علی حالات کی بدلتی ہوئی صورت سے بخوبی آگاہ تھا۔ ایک روز اس نے اپنی بیٹی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت عارف محمود حسب معمول اپنی ڈیوٹی پر تھا اور گھر میں انوار علی اور غزالہ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

''غزالہ! آج کل تمہارے ساتھ عارف کا رویہ کیسا ہے؟''

''بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے ابو۔'' غزالہ نے مبہم سے لہجے میں جواب دیا۔

''تم کچھ چھپا رہی ہو!''

''میں بھلا آپ سے کیا چھپا سکتی ہوں۔'' وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

انوار علی نے کہا۔ ''غزالہ! میں کافی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ تم کچھ بجھی بجھی رہنے لگی ہو۔ اگر تمہاری یہ حالت عارف کی وجہ سے ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس سے خود اس سلسلے میں بات کروں گا۔''

غزالہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''چھوڑیں ابو' آپ بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ کوئی اور بات کریں۔ سنائیں' آپ کی طبیعت کیسی ہے!''

''میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں اور ایسا ہی رہوں گا بیٹی۔'' انوار علی نے غزالہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے خود محسوس کیا ہے کہ عارف کے تیور ہر گزرتے دن کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔ اگر تمہارے علم میں کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ ابتدائی اسٹیج پر ہر مرض کا علاج بہت سہل ہوتا ہے ورنہ بعد میں پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ کسی بھی خطرناک مرض یا برائی کو یا تو شروع ہی میں ختم کیا جا سکتا ہے یا پھر کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔''

''ابو! ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔'' غزالہ نے کہا۔ ''میری قسمت میں جو لکھا تھا وہ مجھے مل گیا۔ عارف جو بھی ہے' جیسا بھی ہے میں ہر حال میں اس کے ساتھ گزارہ کروں گی۔''

انوار علی نے اپنے الفاظ میں زور بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں بیٹی! عارف کیا ہے اور کیسا ہے؟ یہ بات تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اب ویسا نہیں رہا جیسا شروع شروع میں نظر آتا تھا۔''

غزالہ نے خاموشی اختیار کرنے پر اکتفا کیا۔ انوار علی پدرانہ محبت سے اسے ٹٹولنے لگا۔ بالآخر وہ پھٹ پڑی۔ اس نے عارف کا سارا کچا چٹھا کھول کر باپ کو سنا دیا۔ انوار علی صورتِ حال کو جان کر تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ایک معذور باپ بیٹی کے بارے میں ایسی باتیں جان کر تشویش میں ہی مبتلا ہو سکتا ہے۔

غزالہ نے انوار علی کو بتایا تھا کہ عارف محمود انتہائی لالچی اور خود غرض انسان واقع ہوا تھا۔ اس کی نظر گارمنٹ فیکٹری اور دو منزلہ بنگلے پر لگی ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی طرح انہیں ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس نے اس سلسلے میں کھل کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ تاہم اس کے روزمرہ کے رویے سے غزالہ نے یہ بات بخوبی جانچ لی تھی۔ وہ عارف کے آئندہ کے عزائم سے آگاہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ اس طرح پلاننگ کر رہا تھا کہ غزالہ کے نام کی جائداد کسی طور اس کی ہو جائے اگرچہ یہ غزالہ کی مرضی کے بغیر ناممکن تھا تاہم وہ اپنی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے غزالہ سے چھوٹی بڑی رقمیں بھی لیتا رہتا تھا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے وہ غزالہ سے رقم نکلواتا رہتا تھا۔ اگر کبھی وہ اس کا مطالبہ ماننے سے انکار کرتی تھی یا کسی طریقے سے اسے ٹالنا چاہتی تھی تو وہ پہلے ناراض ہوتا تھا' پھر جھگڑے پر اتر آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ وہ غزالہ پر ہاتھ بھی اٹھا چکا تھا۔ غزالہ نے اپنی ازدواجی زندگی کے مدوجزر سے باپ کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ انوار علی اگر آج خود ہی اس سے بات نہ کرتا تو ممکن تھا وہ خاموش ہی رہتی۔

جب تک بات صرف اندازوں تک محدود تھی تو انوار علی کی تشویش اتنی شدید نہیں تھی۔ اب غزالہ کی زبانی اس کے تمام اندیشے اور خدشے سچے ثابت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خطرناک سوال نے سر اٹھایا۔ کیا عارف محمود سے نجات حاصل کر لی جائے؟

یہ سوال جتنا خطرناک تھا' بظاہر اتنا ہی ناقابلِ عمل بھی تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ عارف آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا پھر انوار علی کو غزالہ کا خیال بھی آتا تھا۔ خدا خدا کر کے اس کی کہیں شادی ہوئی تھی۔ اگر میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جاتا تو پھر کیا ہوتا؟ انوار علی کے لیے یہ سوال کہیں زیادہ بھیانک اور خوفناک تھا۔ وہ کسی بھی صورت بیٹی کا گھر اجڑتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سر دست یہ فیصلہ کیا کہ کسی طرح عارف محمود کو سدھارنے کی کوشش کی جائے۔ اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔

''غزالہ! تم ایک کام کرو۔''

''جی ابو' کہیے۔'' وہ فرماں برداری سے بولی۔

انوار علی نے کہا۔ ''تم رقم کے معاملے میں اپنا ہاتھ ذرا کھینچ کر رکھو۔ عارف کا کوئی بھی بڑا مطالبہ پورا نہ کرو اور اگر وہ تین پانچ کرے تو اس سے کہہ دو گارمنٹ فیکٹری کے مالی امور ابو نے اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں وہ کیا رویہ اپناتا ہے۔''

''مجھے تو امید نہیں' وہ کوئی مثبت رویہ اختیار کرے۔'' غزالہ مایوسی سے بولی۔

انوار علی نے کہا۔ ''سب پوائنٹ آف ویو کا فرق ہے۔ اگر عارف اپنی لالچی فطرت کا مظاہرہ نہ کرتا اور تمہارے ساتھ مخلص رہتا تو یہ جائداد اور کاروبار اسی کا تھا۔ ظاہر ہے' جو چیز تمہاری ہے وہ اس کی بھی ہے مگر اب صورتِ حال مختلف ہو گئی ہے۔ وہ تمہاری دولت و جائداد کو مختلف ہتھکنڈوں سے حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ تم سے مخلص نہیں ہے اور یہی سب سے زیادہ

نقصان دہ بات ہے۔ اب اس کی نیت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اگر اس کے رویے میں خلوص اور نیت میں سچائی ہوتی تو وہ تمہارا دل جیتنے کی کوشش کرتا۔ اس کے برعکس وہ تمہاری دولت و جائداد جیتنے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے۔ گویا اس نے یہ شادی دولت کے لالچ میں کی تھی۔ ایسا ناقابلِ اعتبار شخص کسی بھی موقع پر دھوکا دے سکتا ہے۔''

غزالہ نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''ابو! میرے ساتھ مسئلہ بھی تو ایسا ہے نا کہ یا تو کوئی کسی بڑے فائدے کے لیے مجھے اپناتا یا پھر اس میں بھی کوئی عیب ہوتا۔''

بیٹی کی بات پر باپ کا دل کٹ کر رہ گیا' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''بیٹی' میں نے تو ہر مرحلے پر تمہارا بھلا سوچا ہے۔ تمہارا مستقبل سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا' عارف بعد میں ایسا ثابت ہوگا حالانکہ ابتدا میں وہ اپنی گفتگو اور رویے سے انتہائی مہذب اور نستعلیق دکھائی دیتا تھا۔''

غزالہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابو! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ پوائنٹ آف ویو مختلف ہونے سے بہت فرق پڑتا ہے۔ ہم از خود یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا سب کچھ عارف کا ہو جائے۔ وہ بھی یہی چاہتا ہے مگر ہمارے پوائنٹ آف ویو میں فرق ہے۔ اگر وہ بدستور اخلاص اور محبت کا رویہ اختیار کیے رکھتا تو میں اس کا ہر جائز' ناجائز مطالبہ مان لیتی لیکن اس کی لالچی اور مطلبی فطرت کی قلعی کھلنے کے بعد میں اس کو ایک پیسہ دینے کی روادار نہیں ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اضافہ کیا۔ ''ابو! ایک بات کہوں' اگر آپ کو برا نہ لگے تو؟''

''ہاں ہاں' کہو بیٹی۔ میں بھلا تمہاری بات کا برا کیسے مان سکتا ہوں۔''

غزالہ نے کہا۔ ''میں اپنے تئیں عارف کو راہِ راست پر لانے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ اگر مجھے اس مقصد میں ناکامیابی ہوئی تو پھر یہ رشتہ ختم کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہے گا۔ میں گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی۔ جن عورتوں کے شوہر نہیں ہوتے یا جن لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی وہ بھی تو زندہ رہتی ہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ شادی ایک تجربہ ہے۔ سو میں نے یہ تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ اس تجربے کے بہتر نتائج حاصل کرنے کی میں پوری کوشش کروں گی۔ اگر تجربہ ناکام رہا تو میں اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لوں گی۔ آپ کو اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ابو!''

''تمہارے لیے اگر میں فکرمند نہیں ہوں گا تو پھر اور کون ہوگا غزالہ!''

''میں آپ کے جذبات کو بخوبی محسوس کر سکتی ہوں۔''

''تمہاری خوشی کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔''

''مجھے یہ بات معلوم ہے۔'' وہ تیقن سے بولی۔ ''مگر میں کسی بھی صورت آپ کی جان لینے کا تصور نہیں کر سکتی ابو! آپ نے تو اپنی دانست میں میرے لیے جو بھی کیا تھا' اچھا ہی کیا تھا۔ اب یہ میرا مقسوم کہ عارف لالچی اور کم ظرف ثابت ہو رہا ہے۔ ویسے ایک بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔''

انوار علی نے سوالیہ نظر سے بیٹی کو دیکھا' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''انسانی جذبات

احساسات اور خواہشات کا تعلق اس کی فطرت سے ہوتا ہے۔ پاکیزہ فطرت افراد کی سوچ کمینہ فطرت لوگوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ دونوں کے رویّوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کسی کی فطرت کو بدلا نہیں جا سکتا لیکن میں پھر بھی عارف میں مثبت تبدیلی لانے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گی تا کہ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکوں حالانکہ میں بخوبی جانتی ہوں وہ کس قماش کا انسان ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے' سچی اور حقیقی خوشی دولت سے نہیں خریدی جا سکتی اور...... شاید ہم نے ایک ایسی ہی کوشش کی ہے۔''

غزالہ کے لہجے میں اداسی بھر گئی۔ انوار علی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''بیٹی! تم اس وقت بہت جذباتی ہو رہی ہو۔ ہم اس گفتگو کو یہی ختم کرتے ہیں پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔''

غزالہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''ابو! انسان جذبات کا مجموعہ ہے۔ جس شخص کے اندر جذبات نہ ہوں وہ انسان نہیں' پتھر ہے۔ اگر میں جذباتی ہو رہی ہوں تو یہ عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں عارف کو ہینڈل کر لوں گی۔''

''اللہ کرے تمہیں تمہارے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔''

''اگرچہ اس کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں ابو!'' غزالہ مایوسی سے بولی۔

''بس تم ایک بات کا خیال رکھنا۔'' انوار علی نے کہا۔ ''عارف کو کوئی بڑی رقم نہ دے دینا اور جائداد و کاروبار کے قانونی کاغذات کو کسی محفوظ مقام پر رکھنا۔ یہ پاکستان ہے بیٹی۔ تم تو جانتی ہی ہو یہاں' غیر قانونی کام زیادہ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ میں نے کسی ایک ہی جائداد کے دو مختلف اور بالکل اصلی کاغذات بھی دیکھتے ہیں۔ ایک ہی پلاٹ یا فلیٹ کئی بار بک جاتا ہے اور بیک وقت اس کے ایک سے زیادہ دعوے دار موجود ہوتے ہیں۔ کالی بھیڑیں ہر محکمے میں موجود ہیں جن کی ملی بھگت سے ہر ناممکن اور غیر قانونی کام ممکن اور قانونی ہو جاتا ہے۔''

''آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں ابو!'' غزالہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمام قانونی دستاویزات کو محفوظ مقام پر رکھ چھوڑا ہے۔ عارف محمود کو ان کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ میں اس ضمن میں اسی وقت سے محتاط ہوں جب سے عارف کی نیت مجھ پر عیاں ہوئی ہے۔''

چند روز بعد غزالہ نے انوار علی کو بتایا۔ ''ابو! عارف نے ایک لاکھ روپے مانگے ہیں۔''

''ایک لاکھ روپے!'' انوار علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''بھئی' یہ تو ایک بڑی رقم ہے۔''

''ہاں' ہے تو۔'' غزالہ نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''وہ یہ رقم مجھ سے ادھار مانگ رہا ہے۔''

''ادھار...... مگر کس لیے؟''

''کس لیے۔ یہ اس نے بتایا نہیں۔'' غزالہ نے کہا۔ ''اس نے کہا ہے کہ ایک ماہ بعد وہ یہ رقم مجھے لوٹا دے گا۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔'' انوار علی نے خیال ظاہر کیا۔

''مجھے بھی نہیں لگتا۔'' غزالہ بولی۔ ''آج تک اس نے جو بھی چھوٹی بڑی رقم مجھ سے لی ہے وہ

واپس نہیں کی۔''

انوار علی سوچ میں ڈوب گیا پھر غزالہ سے سوال کیا۔ ''اب تم اس معاملے میں کیا کرو گی؟''

''آپ جو کہیں گے وہی کروں گی ابو!''

''میں رقم دینے کا مشورہ تو ہرگز نہیں دے سکتا۔''

''پھر کیا کروں؟''

''تم اسے حیلوں بہانوں سے ٹالنے کی کوشش کرو۔'' انوار علی نے تجویز پیش کی پھر پوچھا۔ ''تم نے اسے یہ تو بتا دیا ہے نا کہ گارمنٹ فیکٹری کا حساب کتاب اب میرے ہاتھ میں ہے؟''

غزالہ نے کہا۔ ''جی ابو' میں نے اسے ساری صورتِ حال بتا دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ آپ سے ایک پیسا بھی نہیں مانگے گا۔ میں ہی آپ سے رقم لے کر اسے دوں۔ میں نے محسوس کیا ہے' وہ آج کل آپ سے زیادہ بات چیت بھی نہیں کرتا۔''

''تم نے بالکل ٹھیک محسوس کیا ہے بیٹی!'' انوار علی نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''جب سے میں بنگلے کی بالائی منزل پر شفٹ ہوا ہوں' اس نے مجھ سے ملنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ جب تک زیریں منزل پر تھا تو علیک سلیک ہو جاتی تھی۔''

''وہ مجھ سے بھی خفا خفا رہتا ہے۔'' غزالہ نے کہا۔

انوار علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اسے رقم فراہم کرنے سے صاف انکار کر دو۔ اس سے کہو کہ جو بھی بات کرنا ہے' مجھ سے کرے۔ مالی امور اب مکمل طور پر میرے ہاتھ میں ہیں۔''

''ٹھیک ہے ابو' میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گی۔'' غزالہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں' تھیلے سے کیا برآمد ہوتا ہے!''

آئندہ رات عارف محمود نے غزالہ سے رقم کا مطالبہ کیا تو اس نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے جواب دیا۔ وہ غزالہ کا جواب سن کر بھنا گیا اور ان میں تلخ کلامی ہونے لگی۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ عارف نے واضح طور پر کہہ دیا۔

''میں سب سمجھ گیا ہوں' تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے ورنہ ایک لاکھ روپے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ تم مجھے رقم دینا ہی نہیں چاہتیں تو پھر بات ہی ختم ہو گئی۔ میں ہی بے وقوف تھا جو تم سے بڑی بڑی امیدیں باندھ لی تھیں۔ میں تو اس گھڑی کو پچھتا رہا ہوں جب میں نے......''

عارف نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ غزالہ بھی اس وقت غصے میں تھی۔ اس کے جملے کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''تم یقیناً یہی کہنا چاہتے ہو' تم اس گھڑی کو پچھتا رہے ہو جب تم مجھ سے شادی کرنے کی ہامی بھری تھی۔ ہے نا یہی بات؟''

''تم خواہ مخواہ بات کو غلط رنگ دے رہی ہو!''

''پھر صحیح رنگ کیا ہے' تم ہی بتا دو۔'' غزالہ نے تپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

عارف محمود نے کہا۔ ''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا' بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب تم سے ایک پائی نہیں لوں گا۔ تم نے مجھے باور کروا دیا ہے کہ جو کچھ تمہارا ہے اس پر مجھے کوئی حق نہیں۔ آیندہ ہمارے درمیان رقم کے لین دین کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے مگر آج تم نے بہت گھٹیا بات کی ہے غزالہ۔'' وہ نفرت سے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرے بارے میں اس انداز سے سوچتی ہو۔ اگر تمہارا دل مجھ سے بھر گیا ہے یا میں تمہیں اتنا ہی برا لگتا ہوں تو صاف صاف بتا دو۔ میں خاموشی سے کہیں چلا جاؤں گا اور دوبارہ کبھی تمہیں اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا۔ تم مجھے فریبی' دھوکے باز اور لالچی سمجھتی ہو اس لیے اپنی بہت سی باتیں مجھ سے چھپا کر رکھتی ہو۔ اگر تمہاری خوشی یہی ہے تو میں تمہاری جاں بخشی کرنے کو تیار ہوں۔''

غزالہ تذبذب کا شکار ہوگئی۔ عارف نے اچانک ایک عجیب پینترا بدلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ بالآخر اس نے پوچھ لیا۔ ''میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں اور تم مجھے کیا سمجھتے ہو' اس بات کو فی الحال رہنے دو۔ بس اتنا بتا دو کہ میں تم سے کون سی باتیں چھپا کر رکھتی ہوں۔ تم نے ابھی کچھ اسی قسم کی بات کی ہے نا!''

''یہ موضوع خاصا طویل اور تکلیف دہ ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''اب ایسی باتوں کے ذکر سے کیا فائدہ' تم مجھ پر مکمل بے اعتمادی کا اظہار کر چکی ہو۔''

''پھر بھی پتا تو چلے؟'' غزالہ نے اصرار کیا۔

وہ بولا۔ ''اگر تم ضد کر رہی ہو تو میں صرف ایک بات کا ذکر کروں گا۔ تمہارے لیے ایک مثال ہی کافی ہوگی۔ تم نے بنگلے اور گارمنٹ فیکٹری کے ڈاکومنٹس مجھ سے چھپا کر کہیں رکھے ہوئے ہیں۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار ہوتا تو وہ تم مجھے ضرور دکھاتیں۔''

ڈاکومنٹس کا ذکر کرتے ہوئے عارف کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی تھی۔ غزالہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس وقت وہ بڑی حریصانہ نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ان کے درمیان پہلے ہی بہت تلخی پیدا ہو چکی تھی' غزالہ نے بات کو مزید بڑھانے کے بجائے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب کافی دیر تک اس نے کوئی بات نہیں کی تو عارف نے کہا۔

''غزالہ! اگرچہ تم نے مجھے ڈاکومنٹس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا مگر ان کے بارے میں معلوم کرنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں۔ وہ تو مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ورنہ میں چٹکی بجاتے میں ان تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں۔''

عارف کی اس بات نے غزالہ کے کان کھڑے کر دیے۔ وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم

خواہ مخواہ بدگمانی کا شکار ہو رہے ہو۔ میں نے کسی خاص وجہ سے تم سے ڈاکومنٹس نہیں چھپا رکھے۔ اگر تم یقین نہیں کر رہے تو میں چند روز میں تمہیں وہ کاغذات دکھا دوں گی۔ شاید پھر تمہیں مجھ پر اعتبار آ جائے۔''

ان کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ ازاں بعد غزالہ نے انوار علی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ انوار علی نے بیٹی کو ہدایت کی کہ وہ عارف کو ڈاکومنٹس کی ہوا بھی نہ لگنے دے اور اس پر خاص نظر رکھے۔

غزالہ نے کہا۔ ''ابو وہ ڈاکومنٹس میں نے اسی بنگلے میں ایک محفوظ مقام پر رکھ چھوڑے ہیں مگر عارف کبھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں' اس پر کڑی نگاہ رکھو۔'' انوار علی نے کہا۔ ''انشاء اللہ میں جلد از جلد اس مسئلے کا کوئی حل سوچتا ہوں۔''

والد کی ہدایت کے مطابق غزالہ اپنے شوہر کی کڑی نگرانی کرتی رہی اور انوار علی اپنے وعدے کے مطابق اس مسئلے کا حل سوچنے میں مصروف ہی تھا کہ وہ اندوہناک واقعہ پیش آ گیا۔

پولیس کے مطابق وہ ڈکیتی کی ایک واردات تھی جس میں ڈاکو زیورات اور نقدی لوٹنے کے ساتھ مزاحمت پر غزالہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار گئے تھے۔ وقوعہ دسمبر کے مہینے میں پیش آیا تھا جب موسم میں اچھی خاصی خنکی در آئی تھی۔ اب اس واقعے کو کم و بیش چھ ماہ گزر چکے تھے۔

انوار علی کی داستان ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''انوار صاحب! آپ کی بیٹی کی موت کو چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ آپ کے مطابق غزالہ کی موت کا ذمے دار آپ کا داماد عارف محمود ہے۔ اس کے باوجود بھی آپ اس کے ساتھ رہ رہے ہیں حالانکہ آپ نے بتایا ہے کہ آپ کو اس کی طرف سے بہت خطرہ بھی ہے؟''

''میں کہاں اس کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ وہ کم بخت میرے ساتھ رہ رہا ہے۔'' انوار علی نے کہا۔ ''غزالہ کی موت کے بعد بنگلا اور گارمنٹ فیکٹری اس کے پاس جاتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ میں ایک معذور شخص ہوں' اس پر دل کا مریض بھی ہوں۔ آپ ہی بتائیں' میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے پوچھا۔ ''کیا بنگلے اور گارمنٹ فیکٹری کے ڈاکومنٹس عارف کے ہتھے چڑھ گئے ہیں؟''

''مجھے تو یہی لگتا ہے۔'' انوار علی نے بتایا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج کل وہ کسی جوڑ توڑ میں لگا ہوا ہے۔ ممکن ہے' ڈاکومنٹس کی تبدیلی کے مراحل سے گزر رہا ہو۔''

''آپ نے یہ تمام باتیں پولیس والوں کو بتائی تھیں؟''

''سب کچھ بتایا تھا جناب!'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مگر ان کا کہنا یہی ہے کہ غزالہ ڈکیتی کی واردات میں جان سے گئی ہے اور یہ کہ عارف محمود ایک شریف آدمی ہے۔ میں خواہ مخواہ اس پر شک کا اظہار کر رہا ہوں۔ وہ مجھے قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ پولیس والوں نے وعدہ کیا ہے کہ

وہ بہت جلد ڈاکوؤں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''اور پولیس کی تلاش گزشتہ چھ ماہ سے جاری ہے؟''

''جی ہاں' ان کے مطابق وہ سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' میں نے پرسوچ انداز میں ہنکاری بھری۔

انوار علی نے کہا۔'' بیگ صاحب! پولیس والے کچھ زیادہ ہی عارف کی طرف داری کرتے ہیں۔ مجھے تو شک ہے' اس نے ان کی مٹھی ضرور گرم کی ہوگی۔''

''ہاں' ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔'' اس کے علاوہ یہ بات بھی ہوسکتی ہے کہ عارف کا تعلق پریس سے ہے۔ پولیس والے صرف پریس والوں اور وکیلوں سے سیدھے منہ بات کرتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی وہ اس کی حمایت کر رہے ہیں۔''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''واقعی آپ بہت بڑے بحران سے گزر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔'' اپنی بیٹی کے مبینہ قاتل کے ساتھ رہتے ہوئے آپ اپنے وجود میں صبح شام قتل ہوتے ہوں گے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا۔'' اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔ اب آپ ہی میرے اس مسئلے کو حل کریں گے۔''

''مسئلہ مجھ تک آ گیا ہے تو میں اسے حل کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

'' لیکن اس سلسلے میں آپ کو بہت صبر اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔''

''میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا بیگ صاحب!''

میں نے پوچھا۔'' بہ ظاہر عارف کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا ہے؟''

''وہ آج کل بہت اچھے رویے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔'' انوار علی نے بتایا۔'' مگر مجھے لگتا ہے اس کے اچھے برتاؤ کے پیچھے کوئی سازش پنپ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔'' اگر وہ آپ کے ساتھ اچھا سلوک کر رہا ہے تو پھر اس سے نمٹنے کے لیے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میں نے ساری صورتِ حال آپ کی بتا دی ہے۔'' اس نے کہا۔'' اب جو کچھ بھی کرنا ہے' آپ ہی کو کرنا ہے۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔'' وقوعہ کی رات آپ کہاں تھے؟''

''میں بنگلے پر ہی تھا۔''

''میرا مطلب ہے' بنگلے کی بالائی منزل پر رہ رہا تھا۔'' انوار علی نے بتایا۔'' حالانکہ میرے جیسے اپاہج شخص کو نچلی منزل پر رہنا چاہیے مگر یہ عارف ہی کی تجویز تھی کہ میرے لیے بالائی منزل زیادہ موزوں رہے گی۔ اس کا موقف تھا کہ اوپر والی منزل سے میں اردگرد کا نظارہ دیکھ سکوں گا جس سے میرا

دل لگا رہے گا۔ میں اسی کے ایما پر بالائی منزل پر شفٹ ہوا تھا۔ وقوعہ کی رات بھی میں اوپری منزل پر ہی تھا۔''

میں نے پوچھا۔'' آپ بنگلے کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ زیریں منزل پر ڈکیتی ہوئی اور ڈاکو جاتے ہوئے آپ کی بیٹی کو بھی موت کے گھاٹ اتار گئے۔ کیا آپ کو اس واقعے کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔''

''آپ کہیں گے کہ میں کیسی عجیب بات کر رہا ہوں۔'' انوار علی نے کہا۔'' مگر حقیقت یہی ہے کہ میں اس رات بے خبر سوتا رہا۔ موسم اچھا خاصا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں خاصی گہری نیند سویا تھا۔ مجھے تو اس سانحے کا اس وقت پتا چلا جب عارف محمود نے مجھے بتایا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ صبح جب تین بجے گھر واپس آیا تو یہ اندوہناک واقعہ رونما ہو چکا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا۔

''عارف نے بڑی افراتفری کے انداز میں مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ اس وقت تو میں نے خیال نہیں کیا تاہم بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس کی وہ پریشانی مصنوعی تھی۔''

انوار علی سے مزید آدھا گھنٹا بات ہوتی رہی۔ میں نے واضح طور پر اسے بتایا کہ میں وہ کیس لینے کو تیار ہوں مگر اس سلسلے میں کچھ بھاگ دوڑ اسے بھی کرنا ہوگی۔ وہ ایک معذور شخص تھا۔ کسی قسم کی عملی کوششوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بھاگ دوڑ سے میری مراد یہ تھی کہ مجھے جس قسم کی معلومات درکار ہوں' وہ کسی بھی طریقے سے مجھے فراہم کرنے کا انتظام کرے۔ اس سلسلے میں اس کے ساتھ آئے ہوئے پڑوسی عبدالقادر نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''بیگ صاحب! آپ کی جو بھی ڈیمانڈ ہو' مجھے بتائیں۔'' عبدالقادر نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔'' میں ہر قسم کی فٹیک کے لیے تیار ہوں۔''

''میں آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گا۔'' میں نے کہا۔'' لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ اس کام میں آپ کا بہت سا وقت برباد ہوگا۔ آپ کو میرے بتائے ہوئے افراد سے ملنا ہوگا۔ ان میں سے کچھ کو میرے پاس لانا ہوگا۔ عارف محمود کے خلاف مقدمہ دائر کرنے سے پہلے ہمیں بڑی خاص الخاص تیاری کرنا ہوگی۔ وہ اس وقت خاصی مضبوط پوزیشن میں ہے۔ اس پر کچا ہاتھ ڈالنا نقصان دہ ہوگا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب!'' عبدالقادر نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔'' میں انوار بھائی کی خاطر یہ دردسری مول لینے کو تیار ہوں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور وکالت نامہ نکال کر انوار علی کے سامنے رکھ دیا پھر ایک جگہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔'' آپ یہاں دستخط کر دیں۔''

انوار علی نے دستخط کرنے کے بعد پوچھا۔'' آپ نے اپنی فیس کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں بیگ صاحب؟''

میں نے اس استفسار پر اسے اپنی فیس کی رقم سے آگاہ کیا۔ اس نے میری مطلوبہ فیس ادا کرنے

میں ذرا تامل نہیں کیا۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید کاٹ کر اس کے حوالے کر دی۔

عبدالقادر نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے۔''

''آپ اس خیال کو ذہن سے باہر لے آئیں۔''

''اس صورت حال میں کیا انوار بھائی کو اس بنگلے میں رہنا چاہیے؟'' عبدالقادر نے کہا۔ ''میں نے یہ بات ان کی معذوری اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے حوالے سے کی ہے۔ ہم عارف محمود پر مقدمہ کرنے جا رہے ہیں۔''

''آپ کی بات غور طلب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال، میرا مشورہ تو یہی ہے کہ انہیں بنگلا چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہیے۔ میں کل متعلقہ تھانے جا کر تھانہ انچارج سے بات کروں گا اور انوار صاحب کی حفاظت کا مکمل انتظام کروا دوں گا۔ ویسے بھی میں کیس کچھ اس نوعیت کا بناؤں گا کہ عارف محمود بنگلے میں مزید قیام نہیں کر سکے گا۔ اس کا دارومدار ان معلومات پر ہے جو مجھے درکار ہیں۔ وہی معلومات جو میں عبدالقادر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں بےفکر رہیں۔''

''کیا تھانے والے میری حفاظت کی ذمے داری لینے کو تیار ہو جائیں گے؟'' انوار علی نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ آپ لوگ مجھ پر چھوڑ دیں۔ وہ میری بات نہیں سمجھیں گے تو خود ہی پچھتائیں گے۔ ہر تھانے دار اپنے تھانے کی حدود میں امن و امان قائم رکھنے کا ذمے دار ہوتا ہے اور وہاں بسنے والے انسانوں کی زندگیوں کی حفاظت بھی اس کے فرائض کا حصہ ہوتی ہے۔ میں ذرا طریقے، سلیقے سے بات کروں گا تو وہ سمجھ جائے گا۔ ویسے ایک مرتبہ کیس عدالت میں لگ گیا تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں رہے گی۔ عارف محمود کوئی ایسا ویسا قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔''

انوار علی مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے عبدالقادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''قادر صاحب! آپ انوار علی کے پڑوسی ہیں اور رضاکارانہ طور پر ان کی مدد کا بیڑا آپ نے اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں، میں آپ کو ایک تاکید ضرور کروں گا اور وہ یہ کہ جب تک باقاعدہ مقدمہ عدالت میں نہیں لگ جاتا، مکمل رازداری اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب!'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں اس معاملے کی نزاکت کو سمجھ رہا ہوں۔ آپ کو انشاء اللہ مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

اس کے بعد میں نے عبدالقادر کو بالتفصیل وہ باتیں سمجھائیں جن کا اسے خیال رکھنا تھا اور وہ کام اس کے سپرد کیے جو اس مقدمے میں کلیدی حیثیت کے حامل تھے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔

میں نے یہاں تک اس کیس کے بارے میں جو تفصیلات تحریر کی ہیں، اس کے علاوہ بھی مجھے کچھ باتوں کا پتا چلا تھا لیکن سردست ان کا بیان مناسب نہیں ہوگا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ ت

بات سے آگاہ ہو جائیں گے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ آئندہ تین چار روز میں عبدالقادر نے بہت سرگرمی دکھائی تھی۔ اس نے وہ تمام کام کر دکھائے تھے جو میں نے اسے سونپے تھے۔ اب میں خاصی واضح پوزیشن میں تھا۔ مجھے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئی تھیں جو انوار علی کے شک کی تصدیق کرتی تھیں۔ بس اب انہیں عدالت میں جج کے روبرو ثابت کرنا تھا۔

میں نے اپنے طور پر بھی کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ ضروری بھی تھا۔ اس کیس کی نوعیت کا تقاضا یہی تھا کہ میں بھی اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دوں۔ اس سلسلے میں، میں نے متعلقہ تھانا انچارج کا تفصیلی انٹرویو کیا تھا اور بہت سی مفید باتیں اس سے اگلوالی تھیں۔

❁ ❁ ❁

میں نے تمام تیاری مکمل کرنے کے بعد کیس عدالت میں دائر کر دیا۔ استغاثہ اتنا جاندار، مدلل اور پرتاثر تھا کہ عدالت نے پہلی فرصت میں ملزم عارف محمود کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ گویا گڑے ہوئے مردے کو اکھاڑنے کا آغاز ہو گیا تھا۔ کدال کی پہلی ہی ضرب نشانے پر لگی تھی۔ جج استغاثہ کے مضمون اور اس میں درج نکات سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے متعلقہ عدالتی عملے کے ذریعے انوار علی کے علاقے کے تھانہ انچارج کو ہدایات بھجوائیں کہ وہ ملزم عارف محمود کو جلد از جلد گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرے۔ عدالت کے حکم سے سرتابی متعلقہ تھانے والوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

چوتھے روز عارف محمود ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنے پولیس کے نرغے میں عدالت میں پہنچ گیا تھا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ اگر پولیس کچھ کرنے کی ٹھان لے تو سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ اس کیس کا تفتیشی افسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ ملزم کو جج کے سامنے پیش کر کے ریمانڈ کی درخواست کی گئی جو عدالت نے فوراً منظور کر لی۔ عارف محمود کو سات روزہ ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔

ملزم عارف محمود کا تعلق پریس سے تھا چنانچہ اس کی گرفتاری کے حوالے سے تقریباً تمام اخبارات میں خبریں بھی لگیں تاہم اس سے پولیس کے کام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ ملزم کی گرفتاری کے وارنٹ عدالت کی طرف سے جاری کیے گئے تھے اس لیے عارف محمود کے لیے کوئی کچھ نہ کر سکا۔ ویسے بھی اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا جو شد و مد سے اس کے لیے کوشش کرتا۔ اخبار کے مالک نے بس اتنا کیا کہ اس کے لیے ایک وکیل کا بندوبست کر دیا تھا۔ فی زمانہ یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔

پولیس کے لیے ریمانڈ کی مدت بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ملزم قانون کی گرفت میں آ چکا تھا اس لیے انوار علی خاصا مطمئن اور خوش دکھائی دیتا تھا۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ اب اس کے ساتھ ضرور انصاف کیا جائے گا۔

سات روز کے اندر اندر پولیس نے اپنی تفتیش مکمل کر کے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ چھ ماہ

قبل جائے وقوعہ پر پولیس نے جو رپورٹ تیار کی تھی، موجودہ چالان اس کا نیا ایڈیشن تھا۔ بعض مقامات پر تھوڑی رد و بدل کی گئی تھی۔ پولیس نے اپنی سابقہ نالائقیوں کو چھپانے کے لیے اس امر پر زور دیا تھا کہ وہ مبینہ ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے زور و شور سے چھاپے مار رہے ہیں اور انشاء اللہ بہت جلد وہ انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ پولیس کے موقف کے مطابق غزالہ کا قتل ڈاکوؤں کی انتقامی کارروائی کا نتیجہ تھا کیونکہ اس نے ان کی راہ میں مزاحمت کرنے کی کوشش کی تھی۔ چالان میں اس بات کا بھی ذکر تھا کہ ملزم عارف محمود نے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ چالان کی رپورٹ سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ انہیں عارف کے مجرم ہونے کا زیادہ یقین نہیں تھا۔ اب تمام تر ذمے داری میرے کندھوں پر آن پڑی تھی کہ میں عدالت کے روبرو عارف محمود کو مجرم ثابت کروں اور میں...... اس نیک کام کی بڑی بھرپور تیاری کیے بیٹھا تھا۔

عدالت کی ابتدائی کارروائی مکمل ہوئی تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم عارف محمود نے بڑے تحمل سے جج کا کلام سنا اور نہایت ہی مضبوط انداز میں صحت جرم سے انکار کر دیا۔ جج نے باقاعدہ سماعت کے لیے دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آیندہ پیشی پر ملزم کے وکیل نے اس کی ضمانت کروانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کی پیش نہ چلی۔ میرے تیار کردہ استغاثہ کے سامنے اس کی کوشش ریت کی دیوار سے زیادہ کچھ ثابت نہ ہو سکی۔ میں نے ملزم کی ضمانت رکوانے کے لیے اتنے مضبوط دلائل دیے تھے کہ وکیل صفائی بغلیں جھانکنے لگا۔

اگلی پیشی پر ملزم نے عدالت کے روبرو جو بیان ریکارڈ کروایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

ملزم کے بیان کے مطابق وقوعہ کی رات وہ حسب معمول اپنی ڈیوٹی پر گیا تھا۔ وہ روزانہ شام کو سات بجے دفتر جاتا تھا اور صبح دو بجے اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ وقوعہ کے روز جب وہ اپنے گھر سے نکلا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کا سسر بالائی منزل پر موجود تھا جبکہ اس کی بیوی غزالہ زیریں منزل پر تھی۔ غزالہ نے ہمیشہ کی طرح اسے رخصت کیا۔ اس نے معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی نبھائی اور جب واپس گھر آیا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ غزالہ بیڈروم میں موجود تھی مگر مردہ حالت میں۔ وہ بیڈروم کے فرش پر چت پڑی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ گھر کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں خاصی افراتفری مچائی گئی تھی۔ بیڈروم کی الماریاں کھلی پڑی تھیں اور میزوں کی درازیں الٹ دی گئی تھیں۔ وہ سیدھی سیدھی ڈکیتی کی واردات نظر آتی تھی۔ ملزم صورت حال معلوم کرنے جب بالائی منزل پر پہنچا تو اس کا سسر گہری نیند سو رہا تھا۔ ملزم نے اپنے سسر کو جگایا اور زیریں منزل پر برپا ہونے والی قیامت کے بارے میں اسے آگاہ کیا۔ انوار علی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ہی ملزم نے پولیس کو فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔

پولیس کی کارکردگی کو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے جائے واردات کا نقشہ تیار کرنے کے

بعد اعلان کر دیا کہ وہ سب کچھ نامعلوم ڈاکوؤں کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ پھر ملزم کی مدد اور تعاون سے انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ڈاکو جاتے ہوئے اپنے ساتھ پچپن ہزار کی نقدی، لگ بھگ ایک لاکھ روپے کے طلائی زیورات اور تیس ہزار کے پرائز بانڈ بھی لے گئے تھے۔ غزالہ کی موت کا سبب پولیس نے یہ بیان کیا کہ اس کو مزاحمت کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ پولیس نے ڈاکوؤں کی تلاش کا وعدہ کر کے کیس کو ٹھنڈا اٹھار کر دیا تھا۔

ملزم کا بیان ختم ہوا تو وکیل صفائی رسمی سی جرح کے لیے آگے بڑھا۔ وہ اکیوزڈ باکس کے نزدیک آ کر عارف محمود کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"عارف صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے بنگلے پر ڈکیتی کی واردات کس تاریخ کو ہوئی تھی؟"

ملزم نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں وکیل صاحب! مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی شب تھی۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے، پچھلے سال کے دسمبر میں وہ اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا۔" وکیل صفائی نے کہا۔ "جس میں مالی زیاں کے ساتھ ساتھ آپ کی عزیز از جان بیوی کی جان بھی چلی گئی تھی۔"

ملزم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بجا فرمایا آپ نے۔ وہ گزشتہ سال کے دسمبر ہی کی ایک خونیں رات تھی، جب میں انتہائی محبت کرنے والی بیوی سے محروم ہو گیا تھا۔ مال و دولت کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ یہ تو آنی جانی چیزیں ہیں۔ مجھے قلق تو اس بات کا ہے کہ غزالہ کو میں کسی بھی صورت واپس نہیں لا سکتا۔ کاش میری زندگی میں وہ منحوس رات نہ آئی ہوتی۔"

وہ بڑی شاندار ایکٹنگ کر رہا تھا۔ وہ اپنے بیان سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے اپنی مرحومہ بیوی سے بہت محبت تھی۔ وکیل صفائی نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"عارف صاحب! گزشتہ سال دسمبر کی آٹھ اور نو تاریخ کی وسطی شب آپ کہاں تھے؟"

"ظاہر ہے، میں اس وقت اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھا۔"

"کون سی ڈیوٹی؟"

"میں ایک معروف اخبار میں سب ایڈیٹر ہوں۔"

"آپ کی ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں؟" وکیل صفائی نے پوچھا۔

"شام سات بجے سے صبح دو بجے تک۔"

"کیا ان اوقات میں تبدیلی بھی آتی رہتی ہے؟"

"عام طور پر نہیں۔" ملزم نے جواب دیا۔ "مگر کبھی کبھار کسی خاص وجہ سے ایسا ہو سکتا ہے۔"

''عارف صاحب!'' وکیل صفائی نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وقوعہ کی شب یعنی گزشتہ سال آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی شب بھی آپ کی ڈیوٹی کے اوقات یہی تھے جو تھوڑی دیر پہلے آپ نے بیان کیے ہیں؟''

ملزم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وکیل صفائی نے کہا۔ ''اس روز آپ کتنے بجے ڈیوٹی پر پہنچے تھے؟''

''میں مذکورہ روز لگ بھگ ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلا تھا۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''اور کم بیش سات بجے ڈیوٹی پر پہنچ گیا تھا۔''

''اس روز آپ نے کتنے بجے آف کیا تھا؟''

''حسبِ معمول دو بجے!''

''اور گھر کب پہنچے تھے؟''

''تین بجے!''

''وقوعہ کے روز ڈیوٹی کے دوران میں تمام عرصہ آپ اپنے دفتر ہی میں رہے تھے یا کچھ وقت کے لیے آپ کہیں گئے بھی تھے؟'' وکیل صفائی نے سوال کیا۔

''میں اس تمام عرصے کے دوران میں اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''البتہ ایک مرتبہ تھوڑی دیر کے لیے چائے پینے دفتر سے باہر گیا تھا۔''

''عارف صاحب!'' وکیل صفائی نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز صبح تین بجے جب آپ گھر پہنچے تو کس قسم کی صورتِ حال نے آپ کا استقبال کیا؟''

وکیل صفائی کے اس سوال کے جواب میں ملزم نے وہی تفصیل دہرا دی جس کا ذکر اس کے ریکارڈ شدہ بیان میں موجود تھا۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو وکیل صفائی نے پوچھا۔

''کیا پولیس نے ان ڈاکوؤں کا کوئی سراغ لگایا جو وقوعہ کی رات آپ کو بہت بڑا مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کی محرومی سے بھی آشنا کر گئے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے وضاحت آمیز انداز میں کہا۔ ''میرا اشارہ مرحومہ غزالہ کی جانب ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے ان کی محبوب ہستی کا زیاں زندگی بھر کی محرومی ہی ہوتا ہے۔''

ملزم ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ بار بار غزالہ کا ذکر کر کے میرے زخموں کو کرید رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا چاہتے تھے۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔'' وکیل صفائی معذرت خواہانہ انداز میں بولا ''میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آپ کی مرحومہ بیوی غزالہ کا ذکر کم سے کم آئے۔''

ملزم نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! بہت بہت مہربانی آپ کی۔'' پھر وہ وکیل صفائی کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''پولیس تا حال ان نامعلوم ڈاکوؤں کا سراغ لگانے میں

ناکامیاب رہی ہے البتہ وہ بڑے تواتر سے مجھے تسلیاں دے رہے ہیں۔''

وکیل صفائی نے استفسار کیا۔ ''عارف محمود صاحب! کیا پولیس نے آپ کی عزیز بیوی غزالہ کا پوسٹ مارٹم بھی کیا تھا؟''

''جی ہاں' غزالہ کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟''

ملزم نے بتایا۔ ''جناب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ غزالہ کی موت آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی شب گیارہ سے بارہ بجے کے دوران میں واقع ہوئی تھی۔''

''یعنی اس وقت جب آپ اپنے دفتر میں موجود تھے؟''

''جی ہاں' میں اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔''

وکیل صفائی نے فخریہ انداز میں میری جانب دیکھا پھر دوبارہ اپنے موکل اور اس مقدمے کے ملزم عارف محمود کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عارف صاحب! آپ کا اپنے سسر انوار علی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''جناب! میں نے انہیں ہمیشہ اپنے باپ کی جگہ سمجھا ہے۔'' عارف محمود کی اداکاری دیدنی تھی۔

''حیرت ہے۔'' وکیل صفائی نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''جس شخص کو آپ آج تک اپنے والد کے مقام پر فائز کیے رہے اسی نے آپ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے اور آپ کو اپنی بیٹی کا قاتل سمجھتا ہے۔''

عارف محمود مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''جناب! میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو اب بھی انہیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ وہ میرے لیے اپنے دل میں کس قسم کے جذبات رکھتے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا دل صاف ہے' نیت صاف ہے اور ہاتھ صاف ہیں اس لیے میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تو گرفتاری سے پہلے آخری لمحے تک انوار انکل کا خیال رکھے ہوئے تھا۔ غزالہ کی اندوہناک موت کے بعد میں نے انوار انکل پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ میں جانتا تھا' اب میرے سوا ان کا اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے تو ان پر زور دیا تھا کہ وہ بالائی منزل سے زیریں منزل پر منتقل ہو جائیں مگر نہ جانے وہ مجھ سے اس قدر خفا کیوں ہیں!''

عارف محمود کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنی باتوں کو پُرتاثر بنا کر پیش کرے اور اس سعی میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ثابت ہو رہا تھا۔

وکیل صفائی نے سوالات کے سلسلے کو اختتامی مرحلے میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ ''عارف صاحب! استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ آپ ایک لالچی اور دھوکے باز انسان ہیں۔ آپ مختلف حیلوں وسیلوں سے مرحومہ غزالہ سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کی نظر اس کی جائداد اور کاروبار پر بھی لگی ہوئی تھی۔ آپ نے پوری کوشش کی تھی کہ بنگلے اور گارمنٹ فیکٹری کی قانونی

دستاویزات آپ کے ہتھے چڑھ جائیں۔ یہ بھی خبریں عام ہیں کہ آپ نے دولت و جائداد کے لالچ میں ایک عیب زدہ یعنی عیبی لڑکی سے شادی کی تھی۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

وکیل صفائی کے ان سوالات پر ملزم زیرلب مسکرایا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''استغاثہ مجھ پر جس قسم کی الزام تراشیاں کر رہا ہے' وہ نہایت ہی بچکانہ بلکہ احمقانہ ہیں۔ میں اس پر اظہار افسوس ہی کر سکتا ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے حاضرین عدالت کا جائزہ لیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جناب وکیل صاحب! آپ میرا خیال جاننا چاہتے ہیں تو سنیں۔ میں قطعاً لالچی اور دھوکے باز نہیں ہوں۔ آپ اس بات کی تصدیق میرے ملنے والوں سے کر سکتے ہیں۔ میں نے کسی حیلے بہانے سے اپنی مرحومہ بیوی سے کوئی رقم نہیں اینٹھی۔ ہاں' اس کی موت سے چند روز قبل مجھے ایک خاص مقصد کے لیے کچھ رقم کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جب غزالہ سے ذکر کیا تو اس نے کہا کہ فیکٹری کا حساب کتاب انوار انکل کے ہاتھ میں ہے۔ میں رقم کے حصول کے لیے ان سے بات کروں۔ میں نے انکل سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان سے رقم مانگنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ میری نظر اپنی بیوی کی جائداد اور کاروبار پر لگی ہوئی تھی تو یہ بھی صریحاً غلط ہے۔ غزالہ تو از خود کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکی تھی کہ میں اخبار کی ملازمت چھوڑ کر گارمنٹس کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاؤں۔ وہ تو اپنی خوشی سے فیکٹری میرے نام لگانے کی بات کرتی تھی۔ میں نے ہی ہر مرتبہ انکار کیا۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بنگلے اور فیکٹری کی قانونی دستاویزات ہر وقت میری رسائی میں رہی ہیں۔ جہاں تک ایک عیبی لڑکی سے شادی کا تعلق ہے تو عرض کروں گا کہ مجھے غزالہ سے شادی پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے از خود یہ رشتہ منظور کیا تھا۔ اگر میں نے کسی طمع میں غزالہ سے شادی کی ہوتی تو پھر کوئی نہ کوئی اپنا مطالبہ بھی پیش کرتا۔ میں نے ایسی کوئی ڈیمانڈ نہیں رکھی جس کا مطلب ہے کہ میں ایک فیئر انسان ہوں۔''

وکیل صفائی نے کہا۔ ''عارف صاحب! آپ پر لگائے گئے الزامات استغاثہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس مقدمے کا مدعی آپ کا سسر انوار علی ہے۔''

''میں سمجھ نہیں سکا ہوں کہ انوار انکل کو مجھ سے ایسی کون سی دشمنی ہے۔'' ملزم نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ میں نے ہمیشہ ان کا خیال رکھا ہے۔ میری اب بھی یہی خواہش ہے کہ وہ میرے ساتھ رہیں۔ اگرچہ غزالہ کی موت کے بعد میں ہی قانوناً اس کی دولت اور جائداد کا مالک ہوں مگر میں کسی بھی صورت انکل انوار کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

''ایک آخری سوال۔'' وکیل صفائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''غزالہ کی موت کو کم و بیش چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ کیا آپ نے بنگلے اور گارمنٹ فیکٹری کو اپنے نام منتقل کروانے کی کوشش شروع کر دی ہے؟''

ملزم نے کہا۔ ''تا حال میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی مگر ایک نہ ایک دن تو ایسا کرنا ہی ہوگا۔

کتنا ہی اچھا ہو اس مرحلے پر انوار انکل بھی میرے ساتھ ہوں۔ انہوں نے کبھی مجھے بیٹا بولا تھا۔ میری کوشش ہوگی کہ میں ان کو واقعی بیٹا بن کر دکھاؤں۔''

وکیل صفائی جج کی جانب مڑا اور گردن کو خفیف سا خم دیتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

وکیل صفائی نے اپنی جرح کے دوران میں دانستہ ایسے سوال کیے تھے جن سے ثابت ہو کہ ملزم انتہائی محبت کرنے والا شوہر اور فرماں بردار ہے۔ وہ ایک صلح جو اور امن پسند انسان ہے گویا اسے معصوم اور بے ضرر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی خاص طور پر غزالہ کے حوالے سے اس کے کردار کو بہت مختلف انداز میں پیش کیا گیا تھا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لیے ملزموں والے کٹہرے کے پاس آیا اور بغور ملزم کا جائزہ لینے لگا۔ عارف محمود کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ اس نے گھنی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں اور وہ ایک صحت مند شخص نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کے خال و خط اور اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے جذباتی اداکاری میں ملکہ حاصل ہوگا۔ اس صلاحیت کا مظاہرہ وہ تھوڑی دیر پہلے وکیل صفائی کے سوالوں کے جواب میں کر چکا تھا۔

میں نے ملزم عارف محمود کو سخت لہجے میں مخاطب کیا تو وہ ذرا چونک گیا۔ تاہم اس نے کسی خاص ردِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا۔

میں نے پوچھا ''ملزم عارف! تم نے پہلے پولس کو اور بعد ازاں معزز عدالت میں جو بیان دیا ہے' کیا تم اس کی حقیقت سے واقف ہو؟''

وہ متحمل لہجے میں بولا۔ ''جی ہاں' میں نے جو کچھ کہا ہے بہت سوچ سمجھ کر کہا ہے اور یہ میرا حلفیہ بیان ہے جو میں نے اپنے ضمیر کی پوری سچائی کے ساتھ دیا ہے۔''

''او کے۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر عارف! تم نے وکیل صفائی کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وہ وقوعہ گزشتہ سال دسمبر کی آٹھ تاریخ کو پیش آیا تھا اور......''

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''آپ کو سننے میں غلطی لگی ہے۔ میں نے یہ کہا کہ وہ اندوہناک واقعہ آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی شب پیش آیا تھا۔''

''اس تصحیح کے لیے تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔

''مسٹر عارف! تم نے اپنے بیان میں بتایا ہے اور وکیل صفائی کی جرح سے بھی یہی تاثر ابھرتا ہے کہ تم اپنی مقتولہ بیوی غزالہ سے بہت محبت کرتے تھے؟''

''کیا ایک میاں بیوی کو آپس میں محبت نہیں کرنا چاہیے؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ''آپ کو اگر اس پر اعتراض ہے تو براہِ کرم یہ بھی بتا دیں کہ اس ''جرم'' کے لیے قانون میں کس دفعہ کا استعمال کیا جاتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مسٹر عارف محمود! پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے میاں بیوی کے آپس میں محبت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ قانون میں صرف جرائم کے ذیل میں دفعات کا اطلاق ہوتا ہے۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں بلکہ ایک عبادت ہے اس لیے محبت کرنے پر کسی دفعہ کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ آخری بات یہ کہ میرے سوال کا مقصد صرف یہ جاننا تھا کہ کیا واقعی تم میاں بیوی میں محبت نام کی کوئی چیز موجود تھی؟''

''آپ کو شک ہے کیا؟'' عارف نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''شک نہیں، مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں کے درمیان اکثر جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔''

''چھوٹی موٹی تو تکرار کہاں نہیں ہوتی۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''بلکہ یہی نوک جھوک دراصل محبت کا ثبوت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چھوٹی موٹی نوک جھوک کی بات اور ہے مگر تم دونوں کے درمیان تو باقاعدہ تلخ کلامی بھی ہوتی رہی ہے جو تمہاری ازدواجی زندگی کی تلخی کو ظاہر کرتی ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں تھا ہم دونوں کے بیچ۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

میں نے لفظی وار جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''نہ صرف تم دونوں کی ازدواجی زندگی تلخ ہو چکی تھی بلکہ تم نے کئی مرتبہ غزالہ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ محبت کرنے والا شوہر اپنی بیوی کو زدوکوب نہیں کرتا۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''کیا آپ ہمارے بیڈروم میں جھانکتے رہے ہیں؟''

''میں اس قسم کی جسارت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میرے پاس ایسی شہادت موجود ہے جو معزز عدالت کے روبرو بتا سکتی ہے کہ غزالہ کے ساتھ تمہارا رویہ غیر انسانی تھا۔ تم اکثر و بیشتر اسے زدوکوب کرتے تھے۔ وہ محض اپنے بیمار باپ کی وجہ سے تمہاری ہر زیادتی برداشت کرتی تھی۔ وہ انوار علی کو کسی صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی ورنہ تم نے ازدواجی زندگی کے ڈیڑھ سال میں اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس کے بعد وہ تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔''

''یہ جھوٹ ہے، صریحاً جھوٹ ہے۔'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔

میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''پھر سچ کیا ہے؟''

''سچ یہی ہے کہ ہم میاں بیوی میں بے انتہا محبت اور اتفاق پایا جاتا تھا۔''

اس موقع پر وکیل صفائی نے مداخلت کو اپنا حق جانا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ وکیل استغاثہ خوامخواہ میرے موکل کی ازدواجی زندگی کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ میرا موکل جب بتا رہا ہے کہ دونوں میاں بیوی میں بے انتہا محبت تھی تو پھر انہیں کیا اعتراض ہے؟''

''مجھے اسی بات پر اعتراض ہے کہ ان دونوں میں محبت موجود تھی!''

''بیگ صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' جج نے براہِ راست مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! حقیقت یہ ہے کہ ملزم نے مقتولہ کے ساتھ دولت و جائیداد کے لالچ میں شادی کی تھی اور شادی کے بعد سے مقتولہ کی موت تک وہ مختلف طریقوں سے مقتولہ سے رقمیں وصول کرتا رہا ہے بلکہ اس کے انکار پر بعض اوقات اس پر تشدد بھی کرتا رہا ہے۔ اس نوعیت کی ازدواجی زندگی میں محبت کا دخل کہاں ہو سکتا ہے۔''

جج نے مجھ سے کہا۔ ''یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ کے پاس کوئی ایسا گواہ موجود ہے جو میاں بیوی کی تلخ ازدواجی زندگی کی شہادت دے سکتا ہے۔ وہ بھری عدالت میں ثابت کر سکتا ہے کہ ملزم اپنی بیوی کے ساتھ غیر انسانی سلوک کر مظاہرہ کرتا تھا۔ کیا آپ اس گواہ کو عدالت میں لا سکتے ہیں؟''

''بالکل لا سکتا ہوں جناب۔'' میں نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔

''کیا وہ اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے؟''

''نہیں جناب عالی!'' میں نے نفی میں سر ہلایا اور بتایا۔ ''میں جس گواہ کی بات کر رہا ہوں اس کا نام استغاثہ کے گواہ کے طور پر کیس فائل میں موجود ہے۔ میری مراد مقتولہ غزالہ کے باپ اور ملزم کے سسر سے ہے۔ معزز عدالت کے علم میں ہے کہ مرد مذکور دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ اسے کسی خاص موقع پر ہی عدالت میں لایا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، آپ آئندہ تاریخ پر انوار علی کو ضرور عدالت میں پیش کریں۔'' جج نے کہا۔ ''اس کے بیان سے استغاثہ کو جانچنے میں کافی آسانی رہے گی۔''

میں دوبارہ کٹہرے میں کھڑے ملزم عارف محمود کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''مسٹر عارف!'' میں نے اسے کڑے لہجے میں مخاطب کیا۔ ''تم کون سے اخبار میں کام کرتے ہو؟''

اس نے ایک معروف اخبار کا نام بتایا، میں نے پوچھا۔ ''تم کتنے عرصے سے مذکورہ اخبار میں کام کر رہے ہو؟''

''تقریباً پانچ سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم کس عہدے پر فائز تھے؟''

''میں سب ایڈیٹر تھا۔''

''کیا تم شروع ہی سے اس عہدے پر کام کر رہے ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''یا ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچے ہو؟''

''میرا اپوائنٹ منٹ سب ایڈیٹر کے طور پر ہوا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اور گزشتہ پانچ سال سے اسی عہدہ پر ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ’’اس اخبار میں نوکری کرنے سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟‘‘
اس نے جواب دیا۔ ’’اس سے پہلے میں ایک ڈائجسٹ میں کام کرتا تھا۔‘‘
’’تم اس ڈائجسٹ میں بھی سب ایڈیٹر ہی تھے یا......؟‘‘
میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے بتایا۔ ’’میں مذکورہ ڈائجسٹ میں پروف ریڈنگ کرتا تھا۔ جب اخبار میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا تو میں نے ڈائجسٹ کی نوکری ترک کر دی۔‘‘
میں نے پوچھا۔ ’’مسٹر عارف! کیا یہ سچ ہے کہ غزالہ کا ’ضرورت رشتہ‘ والا اشتہار تمہارے ہی اخبار میں شائع ہوا تھا؟‘‘
’’جی ہاں، یہ سچ ہے۔‘‘ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ’’بلکہ شائع ہونے سے پہلے ہی وہ اشتہار میری نظر میں آ چکا تھا۔ اتفاق سے اس اشتہار کی پروف ریڈنگ میں نے ہی کی تھی۔‘‘
’’اور اس اشتہار کے توسط سے تم انوار علی سے ملنے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے؟‘‘
’’جی ہاں، میں نے یہی کیا تھا۔‘‘ اس نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ’’کیا یہ قدم اٹھا کر میں نے کوئی جرم کیا تھا؟‘‘
میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’مسٹر عارف! کیا اس روز تم پہلی مرتبہ انوار علی سے ملے تھے یا پہلے سے انہیں جانتے تھے؟‘‘
’’وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔‘‘
’’جو خاصی سودمند ثابت ہوئی تھی۔‘‘ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
وہ کچھ نہیں بولا اور وکیل صفائی کو دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ’’شادی سے پہلے تمہاری رہائش کہاں تھی؟‘‘
’’میں محمود آباد میں رہتا تھا۔‘‘ اس نے بتایا۔
’’کیا محمود آباد میں تمہارا ذاتی گھر تھا؟‘‘
’’جی نہیں۔‘‘ وہ قطعیت سے بولا۔ ’’میں ایک گھر کے پورشن میں کرایے دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔‘‘
’’اور اس سے پہلے تم اختر کالونی میں رہتے تھے۔‘‘ میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔
’’یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟‘‘ وہ چونک اٹھا۔
’’یہ بات کیا، مجھے اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہیں۔‘‘ میں نے ذومعنی لہجے میں کہا۔
وکیل صفائی اس کی مدد کو لپکا۔ ’’مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! یہاں پر غزالہ مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور وکیل استغاثہ میرے موکل کا ماضی کھنگالنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے۔ میں لرنڈ کورٹ سے استدعا کروں گا کہ وہ میرے فاضل دوست کو اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرے۔‘‘

جج کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ’’جناب عالی! میں وکیل صفائی کی اس بات سے صدفی صد اتفاق کرتا ہوں کہ اس وقت معزز عدالت میں غزالہ مرڈر کیس کی سماعت جاری ہے۔ اسی تناظر میں میں اپنے فاضل دوست کی سمجھ شریف یعنی عقل سلیم کو باور کروانا چاہوں گا کہ استغاثہ کے دعوے کے مطابق ملزم عارف محمود اپنی بیوی کا مبینہ قاتل ہے چنانچہ اس کے ماضی کو کھنگالنا میرا عین فرض بنتا ہے۔ اس سے قطعاً عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں ہوتا البتہ اگر وکیل موصوف اسی طرح بار بار میری جرح میں مداخلت کرتے رہے تو وقت ضرور ضائع ہوگا۔‘‘
میری وضاحت پر جج خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے وکیل صفائی کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ’’بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔‘‘
میں نے ملزم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ’’مسٹر عارف! کیا یہ سچ ہے کہ محمود آباد میں رہائش اختیار کرنے سے قبل تم اختر کالونی میں رہتے تھے۔‘‘
اس نے سراسیمہ نظر سے اپنے وکیل کو دیکھا اور سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ’’جی ہاں، میں پہلے اختر کالونی میں رہتا تھا۔‘‘
میں نے اپنی معلومات کی روشنی میں کہا۔ ’’اختر کالونی میں تم ایک مکان کی چھت پر رہتے تھے۔ چھت پر ایک کمرا بنا ہوا تھا جو تم نے کرایے پر لے رکھا تھا۔ مالک مکان خود اپنی فیملی کے ساتھ گراؤنڈ فلور یعنی مکان کی اکلوتی منزل پر رہتا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘
میں نے محسوس کیا، میری باتوں نے اس کے چہرے پر خوف کی چادر تان دی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں نے اس کے نازک پہلو میں سوئی چبھو دی تھی۔
میرے سوال کے جواب میں وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا ’’آ۔ آ...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’تم نے اختر کالونی والا مکان کیوں چھوڑا تھا؟‘‘
’’بس یونہی۔‘‘
’’بس یونہی نہیں۔‘‘ میں نے اسے گھورا۔ ’’بلکہ وہ مکان چھوڑنے کی ایک خاص وجہ تھی۔‘‘
’’اور وہ وجہ کیا تھی یہ بھی آپ ہی بتا دیں!‘‘ وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
وکیل صفائی کی اس ایفیشنسی پر عارف محمود بوکھلا گیا۔ وہ ہراساں نظر سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس موقع پر وکیل صفائی کو رگیدنا ضروری سمجھا اور کاٹ دار لہجے میں کہا۔
’’میرے فاضل دوست! آپ نے مجھ سے ایک فرمائش کی ہے اور میں آپ کی یہ فرمائش ضرور پوری کروں گا حالانکہ آپ کا موکل ہرگز ہرگز اس کے حق میں نہیں ہے۔‘‘
وکیل صفائی نے سوالیہ نظر سے اپنے موکل عارف محمود کو دیکھا مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے تیز آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ ’’میرے فاضل دوست! آپ کے موکل عارف محمود نے اختر

کالونی والا مکان ایک خاص مجبوری کے تحت چھوڑا تھا۔ موصوف کو مالک مکان کی نوجوان بیٹی کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ چھاپے والوں نے محض ''جوتا کاری'' پر ہی اکتفا کیا اور پہلی فرصت میں اسے مکان سے دفع دور ہونے کو کہا گیا۔ اگر وہ معاملہ پولیس میں چلا جاتا تو ملزم کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ مالک مکان شریف آدمی تھا۔ وہ اپنی عزت سے مجبور تھا۔ شہرت اور بدنامی سے بچنے کے لیے اس نے معاملے کو دبانا ہی بہتر سمجھا تھا۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر ملزم عارف محمود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں مسٹر عارف! تم فرزانہ کو تو نہیں بھولے ہو گے۔ ارے بھائی میں اسی اختر کالونی والی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں!''

عارف کی حالت خاصی غیر ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا' ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ میرے انکشاف سے خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس واقعے کا براہِ راست زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ میں نے یہ سارا کھٹ راگ ملزم کو ہراساں کرنے کے لیے پھیلایا تھا۔ دراصل' یہ میرا ایک نفسیاتی حربہ تھا جو میں نے ملزم کو اعصابی طور پر کمزور کرنے اور اسے اپنے دباؤ میں لینے کے لیے استعمال کیا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ مجھے اس مقصد میں اچھی خاصی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ نہ صرف ملزم بلکہ وکیل صفائی بھی الجھ کر رہ گیا تھا۔

اس موقع پر وکیل صفائی نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی گڑے مردے اکھاڑ کر آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ماضی کے اس واقعہ کا زیر سماعت مقدمے سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ میں واقعی گڑے مردے اکھاڑ رہا ہوں۔ بھئی جب مردوں کو یونہی چپ چاپ گاڑ دیا جائے گا تو انہیں اکھاڑنا تو پڑے گا تاکہ ان کی دادفریاد بھی سنی جا سکے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! ماضی کے اس واقعے کا موجودہ کیس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے مگر اس سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم کس قماش اور طرزِ عمل کا حامل ہے۔''

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح کو زیر سماعت مقدمے تک محدود رکھیں۔''

جج کی اس ہدایت پر وکیل صفائی نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

پھر میں دوبارہ ملزم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''مسٹر عارف! تم نے اپنے وکیل کے سوالوں کے جواب میں کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ تمہاری ڈیوٹی روزانہ شام سات بجے سے صبح دو بجے تک ہوتی ہے۔ وقوعہ کے روز بھی تم نے اپنی پوری ڈیوٹی کی تھی؟''

''جی ہاں' میں نے یہی کہا تھا۔''

''اس روز تم حسب معمول دفتر پہنچے تھے اور وقت مقررہ پر ہی تم نے چھٹی کی تھی؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔''

''مسٹر عارف! تم آمدورفت کے لیے کون سی سواری استعمال کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں دفتر آنے جانے کے لیے موٹر سائیکل استعمال کرتا ہوں۔''

''کیا وقوعہ کے روز بھی تم اپنی موٹر سائیکل پر ہی دفتر آئے اور گھر گئے تھے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''لیکن میری معلومات کے مطابق تم وقوعہ کے روز رکشا سے گھر گئے تھے یعنی تمہیں رکشا سے اتر کر گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اس بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''

وہ بری طرح بوکھلا گیا' الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقوعہ کے روز آپ مووی کیمرہ لے کر میرا تعاقب کر رہے تھے۔''

اس کی جھلاہٹ اور بات کے انداز نے جج کو ناگواری میں مبتلا کر دیا۔ اس نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ''مسٹر عارف! وکیل صاحب کی بات کا سیدھا جواب دو۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ ملزم وقوعہ کے روز رکشا میں گھر پہنچا تھا یا ٹیکسی میں البتہ میں نے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ وہ اپنی موٹر سائیکل پر گھر نہیں گیا تھا۔ اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے وہ سوال کیا تھا۔

جج کی ڈانٹ سننے کے بعد وہ قدرے سلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہاں' وقوعہ کے روز میں بحالتِ مجبوری رکشا میں گھر گیا تھا۔''

''اس مجبوری کی وضاحت کرو گے؟''

''وہ......وہ......'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ''میری موٹر سائیکل راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ایک دوست کے پاس چھوڑا اور وہاں سے رکشا پکڑ کر گھر چلا گیا تھا۔''

میں نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔ ''تمہارے اس دوست کا نام کیا ہے؟''

''خاور علی۔'' اس نے بتایا۔

''خاور علی کہاں رہتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''تم نے اس کے پاس موٹر سائیکل کہاں چھوڑی تھی؟''

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور جواب دیا۔ ''خاور علی کی رہائش حسن اسکوائر پر ہے۔ وہ ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ رات گئے گھر واپس لوٹتا ہے۔ میں نے جب موٹر سائیکل اس کے حوالے کی تو اسے ڈیوٹی سے آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور کچھ؟''

میں نے اس کے طنز بھرے سوالیہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم لگ بھگ کتنے بجے خاور علی کے گھر پہنچے تھے؟''

''میرا خیال ہے' اس وقت سوا دو یا ڈھائی بجے ہوں گے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے بالکل درست وقت یاد نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقوعہ کے روز تم حسب معمول دو بجے صبح دفتر سے نکلے' حسن اسکوائر پر تمہاری موٹر سائیکل خراب ہوگئی جسے تم نے اپنے دوست خاور علی کے گھر چھوڑا اور وہاں سے رکشا پکڑ کر تم تین بجے کے قریب اپنے بنگلے واقع گلشن اقبال پہنچ گئے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''باقی سب تو ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات غلط ہے۔''

''کون سی بات غلط ہے؟''

وہ بولا۔ ''میری موٹر سائیکل حسن اسکوائر پر نہیں بلکہ سبزی منڈی کے نزدیک خراب ہوئی تھی جسے میں پیدل چلاتے ہوئے یعنی دھکیلتے ہوئے حسن اسکوائر تک لایا تھا۔''

''ٹھیک ہے' میں نے یہ بات نوٹ کرلی ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''مسٹر عارف! تھوڑی دیر پہلے تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ تم وقوعہ کے روز اپنی موٹر سائیکل پر ہی گھر پہنچے تھے۔ تمہارے بیان میں یہ تضاد کیوں ہے؟''

''آپ تو بال کی کھال نکال رہے ہیں۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے یہ کہا تھا کہ میں وقوعہ کے روز اپنی موٹر سائیکل پر ہی گھر سے آیا تھا اور موٹر سائیکل پر ہی واپس گیا تھا۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ موٹر سائیکل راستے میں دغا دے جائے گی اور مجھے رکشا پکڑ کر گھر جانا ہوگا۔''

''چلیں' آپ کی وضاحت کو میں تسلیم کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''مسٹر عارف! آپ نے اپنے وکیل کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز ڈیوٹی کے دوران میں آپ تھوڑی دیر کے لیے دفتر سے باہر بھی گئے تھے؟''

''ہاں' میں نے وکیل صفائی کو یہی بتایا ہے۔''

''آپ دفتر سے باہر کیوں گئے تھے؟''

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیل صفائی نے اعتراض جڑ دیا۔ ''لگتا ہے' وکیل استغاثہ کی یادداشت خاصی کمزور ہے حالانکہ میرا موکل بڑے واضح الفاظ میں بتا چکا ہے کہ وہ چائے پینے دفتر سے باہر گیا تھا۔''

میں نے چہرے پر مصنوعی خجالت سجاتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم ویری تھینک فل ٹو یو فار دس کائنڈ انفارمیشن۔'' پھر میں ملزم کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''مسٹر عارف! آپ چائے پینے کے لیے کتنے بجے دفتر سے نکلے تھے؟''

''لگ بھگ گیارہ بجے۔''

''کیا آپ کے دفتر میں چائے کا بندوبست نہیں ہوتا؟''

''ہوتا ہے مگر میں اس وقت کچھ بھوک محسوس کر رہا تھا۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''اس لیے نیچے ذرا ہوٹل تک چلا گیا تھا۔''

''کیا تم دفتر سے اکیلے ہی نکلے تھے؟''

''نہیں' میرے ساتھ ایک رپورٹر بھی تھا۔''

''مذکورہ رپورٹر کا نام کیا ہے؟''

''کلیم اللہ۔''

''تم دونوں کون سے ہوٹل میں چائے وغیرہ پینے گئے تھے؟''

''ہم برنس روڈ کی طرف نکل گئے تھے۔'' اس نے بتایا پھر ہوٹل کا نام لیتے ہوئے بولا۔ ''وہاں گولا کباب اور پراٹھا بہت اچھا ملتا ہے۔ ہم نے کھانا کھانے کے بعد دودھ پتی پی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری واپسی کب تک ہوئی تھی؟''

''ہم آدھے پونے گھنٹے میں واپس آگئے تھے۔''

''گویا تم رات بارہ بجے سے پہلے اپنے دفتر واپس آچکے تھے۔''

''یقیناً۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق تمہاری بیوی غزالہ کی موت وقوعہ کے روز رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ وہی گھنٹہ ہے جب تم اپنے دوست کے ساتھ برنس روڈ کے ایک ہوٹل میں گولا کباب اور پراٹھے اڑا رہے تھے۔ اس واقعاتی شہادت سے تمہاری پوزیشن خاصی مضبوط ہو جاتی ہے۔ کیا تم اپنے بیان کی تصدیق کے لیے رپورٹر کلیم اللہ کو عدالت میں پیش کر سکتے ہو؟''

''میں کوشش کروں گا۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''کوشش میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم سمجھو یا نہ سمجھو۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''انسان تو اپنی طرف سے کوشش کرسکتا ہے۔''

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا معزز عدالت سے میری ایک چھوٹی سی استدعا ہے۔''

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے کہا۔ ''یور آنر! میں چاہتا ہوں آئندہ پیشی پر ملزم کے دوست کلیم اللہ کو عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ ملزم کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی اگر خاور علی بھی عدالت میں حاضر ہو جائے تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہوگی۔''

جج نے وکیل صفائی کو ہدایت کر دی کہ وہ آئندہ پیشی پر کلیم اللہ اور خاور علی کو عدالت میں پیش کرے۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

''کورٹ از ایڈ جارنڈ۔'' جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

❁❁❁

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے کے نزدیک انوار علی کی وہیل چیئر رکھی نظر آ رہی تھی۔ انوار علی استغاثہ کی جانب سے ملزم کے خلاف گواہی دینے آیا تھا اور اسے عدالت تک پہنچانے کا بندوبست عبدالقادر نے کیا تھا۔ انوار علی کا یہ پڑوسی حد سے بڑھ کر اس کے کام آ رہا تھا۔

انوار علی نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا طویل بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس کے بیان میں زیادہ تر باتیں وہی تھیں جو وہ پولیس کو بتا چکا تھا۔ انوار علی کا بیان ختم ہوا تو میں نے مختصر سی جرح کے بعد وکیل صفائی کو باری دی۔

وکیل صفائی کافی دیر تک انوار علی کو گھستا رہا۔ تاہم وہ اس سے ایسی کوئی بھی بات اگلوانے میں کامیاب نہ ہو سکا جو استغاثہ کے خلاف استعمال کی جا سکتی۔ ناکام و نامراد ہونے کے بعد وکیل صفائی نے جرح موقوف کر دی۔ انوار علی نے استغاثہ کی حمایت میں بڑے مضبوط دلائل دیے تھے اور بعض مقامات پر وکیل صفائی کو دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔

انوار علی کے بعد جج کی اجازت سے ملزم کا دوست اخباری رپورٹر کلیم اللہ گواہی دینے کٹہرے میں آیا۔ اس دوران میں انوار علی کو عدالت کے کمرے سے باہر لے جایا جا چکا تھا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کی شہادت لی جاتی ہے تاکہ اس کے بیان سے دوسرے گواہوں کی شہادت متاثر نہ ہو۔

کلیم اللہ اپنے بشرے سے ایک کائیاں شخص دکھائی دیتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ خاصا ہوشیار رپورٹر ہو گا۔ وکیل صفائی نے رسمی سی جرح کے بعد مجھے طبع آزمائی کا موقع دیا۔ میں تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔

میں نے گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک آ کر کلیم اللہ سے سوال کیا۔ ''کلیم اللہ صاحب! آپ تھوڑی دیر پہلے حلفیہ طور پر یہ اقرار کر چکے ہیں کہ ہر صورت میں سچ بولیں گے۔ کیا میں آپ کے حلف کا یقین کر لوں؟''

''یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ملزم آپ کا دوست اور کولیگ ہے۔ اگر آپ نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اسے بچانے کی کوشش کی تو ایک طرف تو آپ اپنے حلف سے روگردانی کریں گے اور دوسری جانب میں آپ کو غلط بیانی کے نتیجے میں کسی مصیبت میں بھی پھنسا سکتا ہوں۔''

وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ''جب میں کسی بھی معاملے میں جھوٹ بولنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو پھر مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

''کلیم صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''آپ ملزم عارف محمود کو کب سے جانتے ہیں؟''

''میں اس اخبار میں ایک سال سے ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہماری شناسائی کو بھی اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔''

''شناسائی کو یا دوستی کو؟''

''آپ کچھ بھی سمجھیں۔''

''دونوں باتوں میں بہت فرق ہے کلیم صاحب!'' میں نے کہا۔ ''اس لیے آپ کو وضاحت کرنا ہوگی۔''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''آپ ہمارے تعلقات کو شناسائی کا نام دیں تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ دوستی بہت وسیع المعنی اور خاصا گہرا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے، دوستیاں پالنا ایک مشکل اور کٹھن کام ہے۔ کم از کم میرے جیسا مصروف اور متلون مزاج شخص تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

''حالانکہ ملزم تو آپ کو اپنا دوست گردانتا ہے۔'' میں نے عارف محمود کی جانب تیکھی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کلیم اللہ نے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو عارف محمود کی بڑائی ہے کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے۔''

''کلیم اللہ صاحب!'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں کہ آج آپ کو یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟''

''شاید عارف کے کسی بیان کی تصدیق کے لیے۔''

''ہاں، ملزم کا کہنا ہے کہ وہ وقوعہ کی رات گیارہ سے بارہ بجے تک آپ کے ساتھ تھا۔'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''اس رات میں نے عارف کے ساتھ کچھ وقت تو گزارا تھا۔ ہم کھانا کھانے برنس روڈ گئے تھے۔''

''کلیم اللہ صاحب!'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بات کچھ وقت گزارنے کی نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح سوچ کر بتائیں کہ کیا وقوعہ کی رات گیارہ سے بارہ بجے تک آپ ملزم کے ساتھ تھے یا نہیں تھے۔ اس ایک گھنٹے کی بڑی اہمیت ہے اور اس سے زیادہ اہمیت آپ کے جواب کی ہے؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر متذبذب لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے آپ کے بتائے ہوئے وقت سے کچھ زیادہ ٹائم تھا۔''

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے' وقوعہ کی رات میں ذرا تاخیر سے دفتر پہنچا تھا۔ مجھے ایک مقامی تقریب کی کوریج کرنا تھی جہاں ایک معروف سیاست دان بھی مدعو تھے۔ میں اس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد دفتر پہنچا تھا۔"

"آپ کتنے بجے دفتر پہنچے تھے؟"

"لگ بھگ بارہ بجے۔" وہ تیقن سے بولا۔ "یا کم از کم پونے بارہ بجے ہوں گے اس وقت۔"

"اور اس کے بعد ہی آپ ملزم کے ساتھ کھانا کھانے برنس روڈ گئے تھے؟"

"ظاہر ہے' اس سے پہلے میں کس طرح جا سکتا تھا۔"

"آپ دفتر پہنچنے کے کتنی دیر بعد ملزم کے ساتھ باہر نکلے تھے؟"

"کم از کم ایک گھنٹے بعد۔"

"یعنی پونے ایک یا ایک بجے تک؟"

"جی ہاں' کم و بیش یہی وقت تھا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کی واپسی کب تک ہوئی تھی یعنی آپ نے برنس روڈ کے ہوٹل میں کتنا وقت گزارا تھا؟"

"ہم لگ بھگ ڈیڑھ بجے واپس آئے تھے۔" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ نے برنس روڈ کے مذکورہ ہوٹل میں کیا کھایا تھا؟"

"گولا کباب اور پراٹھے۔"

"اور اس کے بعد دودھ پتی پی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں' دودھ پتی پی تھی۔"

"کلیم اللہ صاحب!" میں نے ذرا مختلف انداز میں سوال کیا۔ "تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز دفتر آنے سے قبل آپ کسی سیاسی تقریب میں موجود تھے۔ کیا اس تقریب میں کھانے کا انتظام بھی تھا؟"

"باقاعدہ کھانا تو نہیں تھا البتہ لائٹ ریفریشمنٹ کا بندوبست ضرور تھا۔" اس نے بتایا۔ "اسی لیے میں عارف کے ساتھ کھانا کھانے برنس روڈ چلا بھی گیا تھا ورنہ کھانے پہ کھانا کھانے کی کوئی تک نہیں بنتی۔"

"ان معلومات کی فراہمی کا شکریہ کلیم صاحب۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "میں ایک مرتبہ پھر چند سوالات دہراتا ہوں۔ آپ "ہاں" یا "نہ" میں جواب دے دیں۔ اس کے بعد آپ کو فارغ کر دیا جائے گا۔"

"جی پوچھیں' آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں!" وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ "وقوعہ کی رات یعنی گزشتہ دسمبر کی آٹھ اور نو تاریخ کی درمیانی شب آپ لگ بھگ بارہ بجے دفتر پہنچے تھے؟"

اس نے "ہاں" میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ "آپ اپنے کولیگ اور اس مقدمے کے ملزم عارف محمود کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے کم و بیش پونے ایک بجے برنس روڈ کے ایک ہوٹل میں گئے تھے جہاں آپ نے گولا کباب کے ساتھ گرما گرم پراٹھے اڑائے تھے اور ازاں بعد دودھ پتی سے اپنے حلق اور زبان کی تواضع کی تھی؟"

اس مرتبہ بھی اس کا جواب اثبات میں تھا۔

میں نے آخری اہم سوال کیا۔ "کلیم صاحب! اپنے بیان کے مطابق آپ وقوعہ کی رات ڈیڑھ بجے برنس روڈ سے واپس آئے تھے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ ہم اس روز جب واپس دفتر آئے تھے تو دیوار گیر کلاک پر ایک چالیس کا وقت نظر آ رہا تھا۔ برنس روڈ سے ہم سات آٹھ منٹ میں دفتر آ سکتے ہیں۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! یہاں بہت سی اہم باتیں نوٹ کرنے کی متقاضی ہیں۔"

جج پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہنا شروع کیا۔

"جناب عالی! ملزم کے بیان کے مطابق وقوعہ کی رات وہ اور اس کا دوست رپورٹر کلیم اللہ گیارہ بجے رات کھانا کھانے برنس روڈ گئے تھے جب کہ گواہ کلیم کا دعویٰ ہے کہ وہ پونے بارہ یا بارہ بجے تو دفتر پہنچا تھا اور لگ بھگ پونے ایک بجے وہ کھانا کھانے دفتر سے نکلے تھے۔ یعنی دونوں کے بیان میں ایک گھنٹے کا فرق موجود ہے۔ یہ فرق بعد کے اوقات میں بھی نظر آتا ہے۔ ملزم نے بتایا ہے کہ ان کی واپسی ساڑھے گیارہ یا پونے بارہ بجے تک ہوئی تھی۔ ملزم کے مطابق انہوں نے آدھا یا پونا گھنٹہ ہوٹل میں گزارا تھا۔ گواہ اور ملزم کے بیان کا یہ تضاد خالی از علت نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں جبکہ گواہ کے پاس اپنے بیان کی تصدیق کا جواز بھی موجود ہے...... یعنی سیاسی تقریب میں شرکت۔ اس سیاق و سباق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ملزم کا بیان مبنی بر دروغ ہے۔"

جج میرے انکشاف پر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کے بعد اس نے براہِ راست ملزم عارف محمود سے سوال کیا۔

"مسٹر عارف! تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

ملزم نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے کلیم اللہ کو دیکھا اور بولا۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! میں نے جو وقت بتایا تھا' میرے خیال میں وہی درست تھا۔ ممکن ہے' میری گھڑی غلط ہو۔"

''تمہاری گھڑی غلط ہو سکتی ہے مگر دنیا بھر کی گھڑیاں غلط نہیں ہو سکتیں۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ مقتولہ غزالہ کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ اس عرصے کے دوران میں تم کہاں تھے یعنی وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان؟'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یا پھر تمہاری غلط گھڑی کے مطابق رات دس بجے سے گیارہ بجے کے درمیان یا پانچ دس منٹ کے فرق سے؟''

میرے جارحانہ رویے سے وہ بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ بے ترتیب لہجے میں بولا۔ ''میں بھلا اس وقت کہاں جاؤں گا۔ میں تو اس روز دفتر ہی میں رہا تھا۔ سوائے برنس روڈ کھانا کھانے جانے کے میں ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہیں گیا تھا۔''

میں نے اپنے لہجے میں مزید سختی بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ایک ایسی مصیبت میں ڈال دوں گا جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ لہٰذا تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ سچ سچ بتا دو۔''

''میں نے اب تک جو کچھ بھی بتایا ہے' بالکل سچ اور درست بتایا ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''تم اس طرح نہیں مانو گے۔'' میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے میں نے اضافہ کیا۔

''یور آنر! یہ کتنی عجیب اور حیرت انگیز بلکہ میرے خیال میں مضحکہ خیز بات ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم اپنی گھڑی کے مطابق ٹھیک وقت پر دفتر پہنچتا ہے' ٹھیک وقت پر چھٹی کر کے گھر کی جانب روانہ ہوتا ہے اور ٹھیک وقت پر وہ گھر پہنچ جاتا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے کہا۔ ''ٹھیک وقت سے میری مراد یہ ہے کہ اس کی گھڑی دوسری تمام گھڑیوں کے مطابق وقت بتاتی ہے لیکن......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈرامائی انداز اختیار کیا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یور آنر! جس دوران میں ملزم رپورٹر کلیم اللہ کے ساتھ کھانا کھانے برنس روڈ جاتا ہے اس وقفے میں اس کی گھڑی غلط ہو جاتی ہے۔ کیسی تعجب کی بات ہے یہ؟''

جج نے غضب ناک نظر سے ملزم کو گھورا اور سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ کیا معما ہے مسٹر عارف!''

''سر! میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔'' وہ نحیف سی آواز میں منمنایا۔

میں نے کہا۔ ''تمہاری سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا۔ مسٹر عارف!''

وہ میرے اس ذومعنی جملے کو معنی پہنانے سے قاصر رہا۔

اس دوران میں گواہ کلیم اللہ کو عدالت کے کمرے سے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں نے وکیل صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! کیا آپ مسٹر خاور علی کو بھی

عدالت میں لانے میں سرخ رو ہو چکے ہیں یا نہیں؟''

میں نے لفظ 'سرخ رو' پر زور دیا تھا کیونکہ میں بہ خوبی جانتا تھا کہ وہ خاور کو نہ لایا تھا اور نہ ہی لانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا پھر جج کی جانب تکتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! خاور علی فی الحال دست یاب نہیں ہے۔ وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی واپس آئیگا' اسے عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ خاور علی کراچی ہی میں موجود تھا۔ وہ خاور کو عدالت میں پیش کر کے اپنے جھوٹ کا پول نہیں کھلوانا چاہتا تھا۔ کیونکہ موٹر سائیکل کی خرابی کے سلسلے میں اس نے متعدد غلط بیانیاں کی تھیں۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کر لیا تھا بلکہ عبدالقادر کے توسط سے میری خاور سے ایک ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ وہ پوری طرح میری مٹھی میں تھا۔

میں ملزم عارف محمود کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''مسٹر عارف! ذرا سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دینا۔ تمہارے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔''

وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو' خدا جانے اب کون سی مصیبت آنے والی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''مسٹر عارف! وقوعہ کی رات تم گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کہاں تھے؟''

''ظاہر ہے' میں اپنے دفتر میں تھا اور کام میں مصروف تھا!'' اس نے ہراساں لہجے میں جواب دیا۔

''میں نے وقت درست گھڑیوں کے مطابق بیان کیا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری غلط گھڑی کے مطابق تو اس وقت کو دس اور گیارہ کہا جا سکتا ہے۔''

وہ کھسیانا ہو گیا پھر ڈھٹائی سے بولا۔ ''وقت غلط گھڑی کا ہو یا درست گھڑی کا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ہر صورت میں اپنے دفتر میں موجود تھا۔''

''تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو!'' میں نے سختی سے کہا۔ ''تم رات گیارہ اور بارہ کے درمیان اپنے دفتر میں نہیں تھے۔''

''اگر میں دفتر میں نہیں تھا تو پھر کہاں تھا؟'' وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

اس موقع پر وکیل صفائی نے اپنی فیس حلال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فوراً مداخلت کی۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! وکیل استغاثہ خواہ مخواہ میرے موکل کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب عارف محمود نے کہہ دیا کہ وہ دفتر ہی میں تھا تو پھر اس کی بات پر یقین نہ کرنے کا کیا جواز ہے۔ اس معاملے کو تو بہت آسانی سے چیک کیا جا سکتا ہے۔''

شکار خود بہ خود جال میں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی توجہ وکیل صفائی کی جانب مبذول کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ نے بات تو بڑی پتے کی' کی ہے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ اس

معاملے کو آسانی سے کیسے چیک کیا جاسکتا ہے؟''

وہ کھٹاک سے بولا۔ ''میرے موکل کے دفتر کے کسی دوسرے ورکر سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وقوعہ کی رات عارف محمود گیارہ اور بارہ بجے کے دوران میں دفتر میں موجود تھا یا نہیں؟''

''ہیئر از پوائنٹ۔'' میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ کی تجویز بہت معقول ہے۔ ایسا کیا جاسکتا ہے۔''

جج نے وکیل صفائی سے کہا۔ ''وکیل صاحب! ایسے کسی شخص کا بندوبست آپ کریں گے یا میں یہ ذمے داری استغاثہ کو سونپ دوں؟''

وکیل صفائی نے مشورہ طلب نظر سے ملزم کو دیکھا' میں نے جلدی سے کہا۔ ''یور آنر! اس سلسلے میں ''وکیل صفائی اینڈ کو'' کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ایسے شخص کا بندوبست کر چکا ہوں جو ملزم کے دفتر کا باقاعدہ ملازم ہے اور وہاں کام کرنے والے ہر شخص پر اس کی گہری نظر رہتی ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' ملزم عارف نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

''جب وہ سامنے آئے گا تو تمہیں خود ہی معلوم ہوجائے گا۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وکیل صفائی نے پوچھا۔ ''اور وہ شاہ کار کب منظرِ عام پر آئے گا؟''

اس کے لہجے میں طنز کی واضح کاٹ موجود تھی۔ میں نے بھی جواباً اتنے ہی زہریلے لیکن دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ جب حکم کریں' میں مذکورہ شخص کو عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔ آپ کوئی فرمائش کر کے تو دیکھیں۔''

وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''سوچ لیں وکیل صاحب! آپ بہت بڑی پیش کش کر رہے ہیں؟''

''آزمائش شرط ہے۔'' میں نے بھی تفریح کے انداز میں کہا۔

وہ اپنی اوقات سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ''میں تو یہ چاہوں گا کہ آپ ابھی اور اسی وقت مذکورہ بندے کو عدالت میں پیش کردیں۔''

''آپ بھی کیا یاد کریں گے میرے فاضل دوست!'' میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کی فرمائش ابھی پوری کی جاتی ہے۔''

پھر میں جج کی جانب مڑ گیا۔ ''جنابِ عالی! اس وقت عدالت کے برآمدے میں غلام باری نامی ایک شخص موجود ہے۔ مذکورہ شخص اس دفتر میں چپراسی کے طور پر کام کرتا ہے جہاں ملزم سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم ہے۔ میرا خیال ہے' اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو غلام باری کو اندر بلایا جاسکتا ہے۔''

میری بات ختم ہوئی تو جج نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے مخالفین کا جائزہ لیا۔ وکیل صفائی کے چہرے پر حیرت تھی جبکہ ملزم عارف محمود کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے موت کا فرشتہ اس کے سرہانے کھڑا ہو۔

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کے توسط سے غلام باری چپراسی کو اندر بلالیا۔ غلام باری تک رسائی حاصل کرنے اور اسے گواہی کے لیے عدالت تک لانے میں عبدالقادر نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ علاوہ ازیں خاور علی کے پیچھے بھی ساری محنت عبدالقادر ہی کی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس موقع پر انوار علی کا کوئی سگا بھائی بھی ہوتا تو شاید اتنی شدومد سے اس کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرسکتا۔

غلام باری گواہوں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہوگیا۔ سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے مختصر سا بیان ریکارڈ کروایا پھر میں سوالات کے لیے اس کے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔

''غلام باری! میں سب سے پہلے تو تمہارے حوصلے کی داد دوں گا کہ تم نے سچ کی سربلندی کے لیے یہاں تک آنے کی زحمت گوارا کی اور وہ بھی کسی مطلب' لالچ اور فائدے کے بغیر۔''

وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''ہم سب کو سچ کا ساتھ دینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں وہ دن تو اچھی طرح یاد ہے جب مبینہ طور پر ملزم عارف محمود کے گھر ڈاکا پڑا تھا اور ڈاکو جاتے جاتے اس کی بیوی غزالہ کو موت کے گھاٹ اتار گئے تھے۔''

''جی ہاں' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''وہ آٹھ اور نو دسمبر کی درمیانی رات تھی' اس رات اچھی خاصی ٹھنڈ بھی تھی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔ اب ذرا میرے ایک اور سوال کا جواب بھی دو۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا' میں نے کہا۔ ''ملزم عارف محمود کا دعویٰ ہے کہ وہ مذکورہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان دفتر ہی میں موجود تھا۔ تم تو زیادہ تر وقت دفتر ہی میں گزارتے ہو کیونکہ بیرون خانہ کام کے لیے ایک دوسرا چپراسی موجود ہے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ کہ ملزم کا دعویٰ کس حد تک درست ہے؟''

اس نے استعجابیہ نظر سے کٹہرے میں کھڑے ملزم عارف محمود کی طرف دیکھا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا عارف صاحب نے ایسا دعویٰ کیا ہے؟''

''ہاں' اس کا موقف یہی ہے۔''

غلام باری نے کہا۔ ''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ عارف صاحب کی بات درست نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس روز چیف ایڈیٹر صاحب نہیں آئے تھے اور عارف صاحب نے ایڈیٹر صاحب سے دو گھنٹے کی چھٹی لی تھی۔ پھر وہ دفتر سے کہیں چلے گئے تھے۔''

''دو گھنٹے کی چھٹی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''وہ دفتر سے ساڑھے دس بجے نکلے تھے۔'' غلام باری نے بتایا۔ ''اور ساڑھے بارہ تک واپس آنے کا کہا تھا مگر وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی یعنی لگ بھگ بارہ بجے واپس آگئے تھے۔''

میں نے تصدیقی لہجے میں استفسار کیا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ ساڑھے دس سے رات بارہ بجے تک دفتر میں موجود نہیں تھا؟''

"جی ہاں، میں بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔"
"وہ اس عرصے کے دوران میں کہاں گئے تھے؟"
"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"
"خیر اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا پھر جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔
"جناب عالی! موکل کے جھوٹ کی قلعی کھل چکی ہے۔ وہ اس خطرناک گھنٹے یعنی گیارہ سے بارہ بجے تک دفتر میں موجود نہیں تھا حالانکہ اس کا دعویٰ یہی ہے۔ مزید تصدیق کے لیے ایڈیٹر صاحب کو عدالت کے کمرے تک لایا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملزم وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے دوران میں دفتر میں نہیں تھا تو پھر کہاں تھا؟"
جج نے براہِ راست ملزم کو مخاطب کیا۔ "مسٹر عارف! تمہاری بیوی کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ اس کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ تم اس ایک گھنٹے کے وقفے میں کہاں تھے؟"
"جج...... جی...... میں کہیں نہیں تھا۔" وہ لرزیدہ لہجے میں منمنایا۔ "پتہ نہیں، میں کہاں تھا؟"
اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔
میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! آئندہ پیشی پر ملزم کی خبر تو لی ہی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ خاور علی کو پیش کرنے کا بندوبست کیا جائے تاکہ اس کیس کی جو کڑیاں غیر موجود ہیں ان کی موجودگی سے یہ زنجیر مکمل ہو جائے۔"
جج نے وکیل صفائی سے پوچھا۔ "کیا آپ آئندہ پیشی پر خاور علی کو عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟"
"جناب عالی! میں عرض کر چکا ہوں کہ خاور علی اس وقت شہر میں نہیں ہے اور......"
میں نے وکیل صفائی کی بات کاٹتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔ "جناب عالی! میرے فاضل دوست ایک سو ایک فیصد جھوٹ کا سہارا لے رہے ہیں۔"
"بیگ صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" جج نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
"میں یہ کہنا چاہتا ہوں جناب عالی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کہ خاور علی نامی شخص اس وقت شہر میں موجود ہے۔"
"پھر وکیل صفائی گریز سے کیوں کام لے رہے ہیں؟"
"یہ تو میرے فاضل دوست ہی بتائیں گے۔"
جج نے سوالیہ نظر سے وکیل صفائی کو دیکھا۔ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "جناب عالی! وکیل استغاثہ خواہ مخواہ میری نیت پر شک کر رہے ہیں۔ اگر ان کا دعویٰ ہے کہ خاور علی کراچی میں موجود ہے تو وہ اسے خود عدالت میں پیش کیوں نہیں کر دیتے۔"
اس مرتبہ جج نے استفساریہ نگاہ سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "یور آنر! اگر آپ کی اجازت ہو تو

میں اس سلسلے میں کوشش کر سکتا ہوں۔"
"نن...... نہیں......" ملزم عارف محمود احتجاجی لہجے میں چیخا۔ "خاور علی کو یہاں لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اس معاملے میں نہیں پڑے گا۔"
"کیوں نہیں پڑے گا وہ اس معاملے میں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
ملزم تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔"
"واہ بھئی واہ!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "پہلے تم نے بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات سبزی منڈی کے قریب تمہاری موٹر سائیکل خراب ہو گئی تھی اور تم اسے دھکیلتے ہوئے لگ بھگ ڈھائی بجے رات خاور کے گھر لے گئے تھے۔ جہاں سے تم رکشا پکڑ کر اپنے گھر پہنچے تھے اور اب کہہ رہے ہو کہ خاور علی اس معاملے سے ناواقف ہے۔ یہ کون سا پینترا بدلا ہے تم نے مسٹر عارف محمود!"
جج نے نفرت آمیز نظر سے ملزم کو گھورا اور پوچھا۔ "تم نے پہلے جھوٹ بولا تھا یا اب غلط بیانی سے کام لے رہے ہو؟"
"پپ...... پانی......" ملزم کٹہرے کی ریلنگ تھامتے ہوئے نزار سی آواز میں کراہا۔ "میری جان نکل رہی ہے...... مم...... مجھے پانی پلائیں۔"
عارف محمود کی تیزی سے بدلتی ہوئی اس کیفیت سے جج بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ خاور علی کو کب عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟"
"جب آپ کا حکم ہو جناب عالی!" میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔
جج نے ٹیبل کیلنڈر پر ایک نگاہ ڈالی اور چار روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❁ ❁ ❁

آئندہ پیشی پر کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔
میں نے حسبِ وعدہ خاور علی کو عدالت میں پیش کر دیا تھا مگر وکیل صفائی بیماری کا سرٹیفکیٹ داخل کر کے غائب ہو گیا تھا۔ میری طرح جج بھی بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وکیل صفائی کو اچانک کون سی بیماری نے آن گھیرا تھا۔ اس روز جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر سب کو رخصت کر دیا۔
اگلی پیشی پر خاور علی کا تفصیلی بیان ہوا جس میں اس نے بتایا کہ وقوعہ کی رات ملزم عارف محمود لگ بھگ گیارہ بجے اس کے ہوٹل پر پہنچا تھا۔ ملزم نے اسے بتایا کہ اس کی موٹر سائیکل میں کوئی نقص واقع ہو گیا ہے جسے وہ صبح تک اس کے ہوٹل پر کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ خاور علی نے اسے بخوشی اجازت دے دی۔ اس سے زیادہ خاور علی کچھ نہیں جانتا تھا۔
ملزم عارف محمود نے بتایا تھا کہ وقوعہ کی رات لگ بھگ ڈھائی بجے وہ خاور علی کے پاس پہنچا تھا جب کہ خاور علی کا بیان تھا کہ وہ گیارہ بجے کے قریب اس کے ہوٹل پر پہنچا تھا۔ یہ اتنا بڑا تضاد تھا کہ جسے عدالت نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔

صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھیں۔ پھر پچھلی پیشی پر ملزم نے جس رویے کا مظاہرہ کیا تھا، وہ بھی جج کو بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر قہر آلود نظر سے ملزم کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم نے متعدد مقامات پر اس قدر جھوٹ بولے ہیں کہ کسی رو رعایت کے قابل نہیں ہو۔ اب بتاؤ، میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟''

وہ نظر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی پر اسرار خاموشی اس کے جرم کا اقرار تھی۔ جج نے وکیل صفائی سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

''جناب عالی! کیس نے اچانک ایسی صورتِ حال اختیار کر لی ہے کہ میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

جج نے تفتیشی افسر کو ایک لمبا لیکچر پلایا اور اس مقدمے کا نیا چالان تیار کرنے کی تاکید کرتے ہوئے عدالت برخاست کر دی۔

پولیس والے اب بہ خوبی سمجھ گئے تھے کہ انہیں کس قسم کا چالان پیش کرنا ہے۔ انہوں نے جب ملزم پر سختی کی تو اس نے اقبال جرم کر لیا۔ ویسے بھی عارف محمود عدالتی کارروائی کے دوران میں اس بری طرح گھر چکا تھا کہ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنے جرم کا اقرار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا...... پھر اس مرتبہ اس کے انکار پر پولیس والے اس کے ساتھ جو سلوک کرتے وہ اس اذیت ناک مرحلے سے بھی آگاہ تھا لہٰذا اس نے شرافت سے اقبالِ جرم کر لیا۔

آئندہ پیشی پر جج نے ملازم عارف محمود کو قتلِ عمد کے جرم میں سزائے عمر قید سنا دی۔

عارف محمود نے اپنے اقراری بیان میں غزالہ کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں اس واقعے کو ڈکیتی کا رنگ دینے کے لیے اس نے جو کوشش کی تھی اس کی تفصیل بھی بتا دی تھی۔ نقدی، پرائز بانڈ اور زیورات بھی اس نے غائب کیے تھے تاکہ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔

عارف محمود نے دولت کے لالچ میں ایک ایسا گھناؤنا الاؤ روشن کیا تھا جس کی آگ نے خود اسے بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے، زر زن اور زمین کے فساد بڑے عبرت ناک ہوتے ہیں۔ خاص طور پر آتشِ زر جب بھڑکتی ہے تو گیلی خشک، ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ عارف محمود نے بھی اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ وہ زمین جائیداد، مال و دولت سے بھی گیا اور رشتوں ناتوں کو بھی اس نے کھو دیا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے وہ یقیناً پچھتا رہا ہو گا مگر وقت گزر جانے کے بعد پچھتاوا کسی کام نہیں آتا۔

جو لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے، وقت انہیں ٹھوکروں میں اڑا دیتا ہے۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنا ہی دانش مندی ہے اور یہ دانش بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

✿ ✿ ✿

پسِ نقاب

ایک روز میں عدالت سے فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچا تو میری سیکریٹری نے ایک عجیب و غریب اطلاع دی۔ میں اپنا بریف کیس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ انٹر کام کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور دھیمے لہجے میں کہا۔

''یس!''

میری سیکریٹری شائستہ نے نہایت شائستگی سے پوچھا۔ ''سر! آپ کے انکل کو بھیج دوں؟''

''کہاں؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''اندر سر۔'' شائستہ نے بتایا۔

''میں سمجھا نہیں، آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو!'' میں نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم میرے کون سے انکل کو اندر بھیجنا چاہتی ہو؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''سر! ویٹنگ روم میں ایک صاحب کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں...... ایک نہیں بلکہ وہ دو افراد ہیں۔ ان میں سے ایک خود کو آپ کا انکل بتاتے ہیں۔ میں انہی کے بارے میں آپ سے پوچھ رہی تھی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے چیمبر میں داخل ہونے سے پیش تر میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ انتظار گاہ پر بھی ڈالی تھی۔ وہاں مجھے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہاں پر موجود چار پانچ افراد میرے لیے قطعی اجنبی تھے اور اب شائستہ بتا رہی تھی کہ میرے کوئی انکل مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔

میں نے اپنی سیکریٹری سے استفسار کیا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ ان صاحب نے خود کو میرا انکل بتایا تھا؟''

''آف کورس سر!'' شائستہ نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سرگودھا سے آئے ہیں۔''

سرگودھا کے ذکر پر مجھے اپنے ایک انکل یاد آ گئے۔ مرزا امیر بیگ نام تھا ان کا مگر وہ تو عرصہ ہوا،

ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ میرے مذکورہ انکل پاکستان ایئر فورس میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ ''سیکنڈ انڈو پاک وار'' میں انہوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ انکل امیر بیگ ایک طویل عرصہ سرگودھا میں رہے تھے۔ میری سیکریٹری نے جب مجھے یہ بتایا کہ مجھ سے ملاقات کے خواہاں اس شخص کا تعلق سرگودھا سے ہے تو میں چونک اٹھا۔ میں نے شائستہ سے پوچھا۔

''انہوں نے اپنا نام کیا بتایا ہے؟''

''سردار احمد۔'' شائستہ نے جواب دیا۔

''میری حیرت دوچند ہوگئی۔ سرگودھا کے حوالے سے یہ نام میں زندگی میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔ سردار احمد نامی وہ شخص میرا چچا ہونے کا دعوے دار تھا جب کہ میرا کوئی چچا یا ماموں اس نام کا نہیں تھا۔ اس بات نے میرے اندر تجسس کو ابھارا۔ میں نے سیکریٹری سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم انہیں ان کی باری پر اندر بھیج دینا۔''

''سر! پہلا نمبر آج انہی کا ہے۔'' سیکریٹری نے کہا۔ ''وہ تقریباً ایک گھنٹے سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔''

''بھئی، پھر بھیجو انہیں اندر۔'' میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں بھی تو دیکھوں یہ سردار احمد صاحب میرے کون سے انکل ہیں!''

''او کے سر۔'' سیکریٹری نے مختصراً کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد دو افراد میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کی عمر کا تخمینہ میں نے پینسٹھ اور ستر کے درمیان لگایا۔ دوسرا الگ بھگ چالیس کا رہا ہوگا۔ ضعیف آدمی کی صحت تسلی بخش تھی جب کہ ادھیڑ عمر شخص قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ دونوں میرے لیے ناشناسا تھے۔ دونوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے تو میں نے سوالیہ نظر سے ان کا جائزہ لیا۔ ستر سالہ تجربہ کار شخص میری نگاہ کا مفہوم سمجھ گیا، اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''جناب وکیل صاحب! میرا نام سردار احمد ہے...... اور یہ میرا بیٹا سرفراز احمد ہے۔''

''اور آپ سرگودھا سے آئے ہیں؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کبھی آئے تھے۔'' زیادہ عمر والے شخص نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونک گیا۔

وہ بولا۔ ''مطلب یہ کہ ہم کبھی سرگودھا سے آئے تھے۔ اب تو کافی عرصے سے یہیں کراچی میں رہتے ہیں۔ پاپوش نگر...... ناظم آباد میں۔''

اس کی الجھی ہوئی باتوں نے مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ میں نے قدرے بیزاری سے کہا

''معاف کیجئے گا، میں آپ کو پہچانا نہیں۔ غالباً آپ نے میری سیکریٹری کو یہ بتایا تھا کہ آپ میرے

کوئی چچا وغیرہ ہیں۔ آپ نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا حالانکہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کیا آپ اپنے اس عمل کی کچھ وضاحت کریں گے؟''

''ضرور کروں گا بیٹا...... بہ شرط یہ کہ تم مجھے اس کا موقع دو۔'' میرا چچا ہونے کا دعوے دار سنجیدگی سے بولا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ابھی تک وہی شخص مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس کا ادھیڑ عمر بیٹا سرفراز احمد بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ سردار احمد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تمہارے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ آج ہم پہلی بار مل رہے ہیں اس لیے جان پہچان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ میں نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ میں واقعی تمہارا انکل ہوں۔ ہمارے درمیان چچا بھتیجے کا رشتہ ہے۔''

میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''میں کچھ نہیں سمجھ سکا، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

اس نے کچھ کہنے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔ ''آپ کا نام مرزا امجد بیگ ہے نا؟''

''جی ہاں، یہی میرا نام ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور آپ مسلمان ہیں؟'' اس کے لہجے میں سوال تھا۔

''الحمدللہ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے مسلمان ہونے پر فخر ہے۔''

''تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''برخوردار! یہ درست ہے کہ آج ہماری پہلی ملاقات ہو رہی ہے لیکن میں آپ کو بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں آپ کے مرحوم چچا کا دوست ہوں...... بلکہ ہمارے درمیان بھائیوں ایسا تعلق رہا ہے۔ اس رشتے سے کیا میں آپ کا انکل نہیں ہو سکتا؟''

اس نے ایک ایسا سوال کیا تھا جس سے انکار کرنا سردست مناسب نہیں تھا۔ اس سے طویل بحث کا ایک در وا ہو جاتا۔ میں نے ہمیشہ وقت کی قدر کی ہے۔ میں اپنے قیمتی وقت کو اس قسم کی بحث و تمحیص میں ضائع کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مصلحت اور وقت کا تقاضا یہی تھا کہ میں سردار احمد کی بات سے فوراً اتفاق کر لوں۔ سو میں نے یہی کیا۔

''آپ بالکل بجا فرماتے ہیں سردار صاحب۔'' میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''کہیے، کیسے آنا ہوا؟''

''ہم ایک کیس کے سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔'' سرفراز احمد نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ''ابا جی کو پوری امید ہے کہ آپ ضرور ہماری مدد کریں گے۔''

''کیس کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیس بہت پیچیدہ ہے۔'' سردار احمد نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''برزگوار! کیس پیچیدہ ہو یا سادہ، جب تک آپ مجھے اس کی نوعیت اور تفصیلات

نہیں بتائیں گے اس وقت تک میں آپ کو کوئی یقین دہانی نہیں کروا سکتا۔ بہتر بات یہ ہوگی کہ آپ اپنے کیس کے بارے میں مجھے بالتفصیل بتائیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر سوالیہ نظر سے ان دونوں کو باری باری تکنے لگا۔

سردار احمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''بیگ صاحب! یہ ایک قتل کے کیس کا قصہ ہے۔'' پھر اس نے اپنے بیٹے کی جانب اشارہ کیا اور بتایا۔ ''سرفراز کا سالا قتل ہو گیا تھا۔ ہم اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو ہماری مدد کرنا ہوگی۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''بیگ صاحب! یہ مت سمجھیں کہ ہم رشتے داری نکال کر آپ سے فیس کے سلسلے میں کوئی رعایت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ ہم شیخ احمد کے قاتل کو تختۂ دار تک پہنچانے کے لیے بڑی سے بڑی رقم خرچ کر سکتے ہیں۔''

''شیخ احمد غالباً آپ کے بیٹے کے سالے کا نام ہے!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر اپنے خیال کا اظہار کیا۔

سردار احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے سیکریٹری کو انٹر کام پر ہدایت کی کہ وہ دو سافٹ ڈرنک اندر بھجوا دے۔ ریسور کریڈل کرنے کے بعد میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سرفراز احمد اور سردار احمد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''سردار صاحب! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ آپ کے صاحبزادے کا سالا شیخ احمد قتل ہو گیا تھا۔ اس ''ہو گیا تھا'' سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کیا اس واقعے کو کچھ عرصہ گزر چکا ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں' کافی عرصہ گزر چکا ہے۔''

''آپ نے اس سلسلے میں پولیس کی مدد کیوں نہیں لی؟'' میں نے پوچھا۔

''سب کچھ کیا تھا'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''پولیس کی مدد لی تھی' باقاعدہ عدالت میں کیس چلا لیکن شیخ احمد کا قاتل صاف بچ گیا بلکہ بچ گئی۔''

''کیا شیخ احمد کو کسی عورت نے قتل کیا تھا؟''

''جی ہاں' وہ خبیث روح ایک عورت ہی ہے۔'' سرفراز نے بتایا۔ ''شیخ احمد کو اس کی بیوی نورین نے قتل کیا تھا جناب...... جو عدالت سے باعزت بری ہو کر شیخ احمد کی دولت و جائیداد کی وارث بن بیٹھی ہے۔ وہ اپنی کامیابی پر اس طرح نازاں ہے جیسے وہ بیوہ نہ ہوئی ہو بلکہ اس کی کوئی بڑی لاٹری نکل آئی ہو۔''

سردار احمد نے اپنے بیٹے کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی تو واقعی لاٹری نکل آئی ہے بیگ صاحب! شیخ احمد ایک صاحب حیثیت شخص تھا۔ صدر کی صرافہ مارکیٹ میں ''شیخ جیولرز'' کے نام سے اس کی بہت بڑی دکان ہے۔ بنگلا' گاڑی اور دیگر اثاثے الگ ہیں۔''

مجھے اس کیس میں دلچسپی کا خاصا مواد نظر آ رہا تھا۔ میں خاص خاص پوائنٹ پیڈ پر نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ آفس بوائے کولڈ ڈرنکس رکھ کر چلا گیا تو میں نے سردار احمد سے پوچھا۔

''سردار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ عدالت نے شیخ احمد کی قاتل نورین کو باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔ کیا نورین پر قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا؟''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں تو وکیل استغاثہ نے مروا دیا تھا جناب! مجھے شک...... بلکہ یقین ہے کہ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی نے در پردہ آپس میں کوئی گٹھ جوڑ کر لیا تھا کیونکہ جیسے جیسے کیس آگے بڑھ رہا تھا' ہمارا وکیل' وکیل صفائی کے سامنے بے بس اور لاچار دکھائی دینے لگا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ہو رہا ہے۔ وکیل استغاثہ کی کمزوری بہ الفاظ دیگر ''تعاون'' سے فائدہ اٹھا کر وکیل صفائی نے ایسا موقف اختیار کیا کہ اپنی موکلہ کو صاف بچا لے گیا۔ اگر وکیل سرکار ابتدا ہی سے ہوشیاری اور چابک دستی سے کام لیتا تو وہ منحوس عورت قانون کی گرفت سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔''

''آپ نے ابھی وکیل صفائی کے کسی موقف کا تذکرہ کیا ہے۔'' میں نے رف پیڈ پر قلم گھسیٹتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اس کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

سرفراز احمد نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ''جناب! ڈیفنس کونسلر نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ نورین نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے مقتول پر گولی چلائی تھی۔ وہ اسے قتل کرنے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتی تھی...... جب اس نے مقتول پر پے در پے دو فائر کیے تو اس وقت مقتول کا چہرہ نقاب کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنے شوہر پر فائرنگ کر رہی ہے۔ وہ تو اس نقاب پوش کو ایک چور سمجھتی تھی جو پکڑے جانے کے خوف سے ملزمہ پر پستول تان کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جواباً ملزمہ نے اپنی حفاظت کی خاطر اس پر فائرنگ کر دی۔''

''ویری انٹرسٹنگ۔'' سرفراز کی بات ختم ہوئی تو میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ نورین نے دیدہ دانستہ اپنے شوہر کو قتل کر کے اس واقعے کو حادثے کا رنگ دیا ہے' ایک ایسا حادثہ جس میں ملزمہ بے قصور نظر آتی ہے!''

''ہمیں اس کے مجرم ہونے کا یقین نہ ہوتا تو دوبارہ اس کیس کو اٹھانے کی کوشش نہ کرتے۔'' سردار احمد نے متحمل لہجے میں کہا۔ ''ہمارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے بیگ صاحب اور اس میں سب سے اہم کردار وکیل سرکار نے ادا کیا ہے۔ وہ ایک تگڑی رقم لے کر مخالف پارٹی سے مل گیا تھا۔ اب آپ ہی ہمیں انصاف دلائیں گے۔''

''اگر واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو میں آپ کو عدالت سے انصاف دلوانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کے بارے میں جس رشوت خوری کا ذکر کیا ہے اس ذیل میں آپ کے پاس کوئی ثبوت وغیرہ بھی ہے؟''

”اگر ایسا کوئی ثبوت ہمارے پاس ہوتا تو وکیل صفائی اتنی آسانی سے اپنی موکلہ کو بری نہ کروا پاتا۔“ سرفراز نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس نے ہماری بے بسی کا فائدہ اٹھایا ہے۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”عدالت نے اگر ملزمہ کو ”حق حفاظت خود اختیاری“ کی بنا پر بے گناہ ٹھہراتے ہوئے باعزت بری کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمیں بالائی عدالت میں پٹیشن داخل کرنا ہوگی۔“

”بیگ صاحب! کیا یہ سراسر زیادتی نہیں ہے کہ اس حق (حق حفاظت خود اختیاری) کی آڑ میں ایک قاتل کو بے گناہ قرار دے کر باعزت بری کر دیا جائے؟“ سرفراز احمد نے کہا۔ ”اس قانون کو میں سمجھ نہیں سکا!“

میں نے کہا۔ ”جناب! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ عدالت میں ہر بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ عدالت کسی بھی امر کی تصدیق یا تردید کے لیے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔ آپ کا وکیل نورین کو مجرم ثابت نہیں کر سکا جب کہ وکیل مخالف نے اپنی موکلہ کو بے گناہ ثابت کر دیا۔ عدالت کا دستور یہی ہے۔“

سردار احمد نے کہا۔ ”وکیل صفائی نے اپنی موکلہ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ایک آڑ استعمال کی ہے۔ افسوس کہ وکیل استغاثہ اس آڑ کو گرا نہ سکا۔ اب اس آڑ کو آپ ہی مسمار کریں گے بیگ صاحب!“

”میں تو اس قانونی آڑ کو بالکل فضول سمجھتا ہوں۔“ سرفراز نے بیزاری سے کہا۔ ”قانون کو اتنا لچک دار نہیں ہونا چاہیے کہ مجرموں کو بچ نکلنے کے مواقع میسر آتے رہیں۔“

میں نے سرفراز کی تشفی کے لیے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ”سرفراز صاحب! پاکستان پینل کورٹ (پی پی سی) کی دفعہ چھیانوے کے تحت...... ”کوئی امر جرم نہیں ہے جو ”حق حفاظت خود اختیاری“ کو استعمال کرتے ہوئے کسی ایسے فعل کے خلاف کیا جائے جس سے ہلاکت یا ضرر شدید پہنچنے کا معقول اندیشہ موجود ہو۔“ اسی طرح دفع ستانوے کے مطابق...... ”انسانی جسم پر اثر انداز ہونے والے کسی جرم کے خلاف ہر شخص کو اپنے یا کسی دوسرے شخص کے جسم کی حفاظت کا حق حاصل ہے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سرفراز! وکیل صفائی نے عدالت کے روبہ رو یہ ثابت کر دیا کہ نورین نے ”حق حفاظتِ خود اختیاری“ میں اپنے شوہر پر گولی چلائی تھی لہٰذا وہ قصور وار نہیں۔ اس کے برخلاف وکیل استغاثہ وکیل صفائی کے موقف کو غلط ثابت نہیں کر سکا چنانچہ عدالت نے ملزمہ نورین کو باعزت بری کر دیا۔“

وہ افسوسناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ عدالت میں وکیل حضرات جو چاہیں‘ ثابت کر سکتے ہیں۔ بس عدالت کے سامنے انہیں اپنے موقف کے لیے ٹھوس دلائل دینا ہوتے ہیں!“

”بالکل اس کا مطلب یہی ہے سرفراز صاحب!“ میں نے قطعیت سے کہا۔

”تو پھر جج کا کردار کیا رہ جاتا ہے؟“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جج کی مثال ایک ترازو کی سی ہے۔ آپ اسے انصاف کا ترازو کہہ لیں۔ اس ترازو کے دونوں پلڑے دونوں وکیلوں (وکیل استغاثہ + وکیل صفائی) کے زیر استعمال رہتے ہیں۔ وہ اپنے لیے مخصوص پلڑے میں دلائل کی صورت میں اپنی لیاقت‘ ہوشیاری‘ عقل مندی‘ معاملہ فہمی اور ”ہنر مندی۔“ کے باٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر جو پلڑا جھک جائے‘ جج اسی کے حق میں فیصلہ سنا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے‘ اب آپ میری بات کو پوری طرح سمجھ گئے ہوں گے؟“

”جی سمجھ گیا۔“ وہ طنز آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”عدالت کے کمرے میں سب سے زیادہ اہمیت وکیل کی ہوتی ہے۔“

سردار احمد نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کب تک اعلیٰ عدالت میں پٹیشن داخل کر دیں گے بیگ صاحب؟“

میں نے کہا۔ ”کیا آپ مقدمے کی فائل اپنے ساتھ لائے ہیں؟“

”بالکل لائے ہیں۔“ سردار احمد نے جواب دیا پھر اپنے بیگ میں سے مذکورہ فائل نکال کر میری جانب بڑھا دی اور کہا۔ ”بیگ صاحب! یہ مکمل فائل ہے جس میں جج کا فیصلہ بھی موجود ہے۔ اس سے آپ کو کیس کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ علاوہ ازیں میں آپ سے چند ضروری باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں جو نورین کے مجرم ہونے کی نشاندہی کرتی ہیں۔

میں نے سرسری انداز میں فائل کی ورق گردانی کرنے کے بعد اسے اپنی میز پر رکھ دیا اور کہا۔ ”میں فرصت میں نہایت باریک بینی سے اس فائل کا مطالعہ کروں گا۔ فی الحال آپ مجھے ملزمہ نورین‘ مقتول شیخ احمد اور اس کیس کے دیگر اہم کرداروں اور مفید نکات کے بارے میں بتائیں تاکہ میں اپنے ذہن میں ایک واضح نقشہ بنا سکوں۔“

”کہانی بہت لمبی ہے جناب!“ سرفراز نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”کہانی طویل ہو یا مختصر‘ سننا ہی پڑے گی۔ آپ شروع ہو جائیں۔“

سرفراز نے اپنے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابا جی! بیگ صاحب کو آپ ہی تفصیلات بتائیں۔“

سردار احمد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کھنکار کر گلا صاف کیا اور ذہن میں مجتمع خیالات کو میرے گوش گزار کرنے لگا۔

اس روز سردار احمد نے اس مقدمے کے بارے میں مجھے جو معلومات فراہم کیں ان کی روشنی میں اور ازاں بعد کیس فائل کے بہ غور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سیشن کورٹ کا ملزمہ نورین کی بریت کا فیصلہ درست نہیں تھا۔ چنانچہ ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف پٹیشن داخل کی جا

سکتی تھی۔

دوسری ملاقات پر میں نے سردار احمد کو یہ نوید سنا دی کہ ہم ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ میری فیس وہ گزشتہ ملاقات میں ادا کر چکا تھا۔ میری رضامندی کو پا کر پُرجوش لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ اخراجات کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں یہ مقدمہ جیتنے اور مقتول کی بیوہ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کے لیے بے دریغ رقم خرچ کر سکتا ہوں۔''

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے سردار صاحب! میں اپیل تیار کرتا ہوں۔ اتفاق یا خوش قسمتی سے مجھے کچھ ایسے زاویے مل گئے ہیں کہ سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہماری اپیل میں جان سی آ جائے گی۔''

''ان زاویوں کے بارے میں آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟''

''یہ قبل از وقت ہوگا'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''وقت آنے پر آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں اصرار نہیں کروں گا۔'' سردار نے معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ہمارے وکیل ہیں۔ میں آپ کو فالو کروں گا۔''

''آپ خاصے سمجھدار ہیں۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! اب آپ سے کب ملاقات ہوگی؟''

میں نے کہا۔ ''آپ دو روز بعد میرے پاس آ جائیں۔ میں تمام ضروری کاغذات تیار کر لوں گا۔ آپ کے دستخط کے بعد اپیل مکمل ہو جائے گی۔''

وہ حسب پروگرام دو روز بعد آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔

غیر دلچسپ قانونی معاملات کا ذکر حذف کرتے ہوئے میں آپ کو ہائی کورٹ کی سماعت کے بارے میں بتاتا چلوں۔ ہائی کورٹ میں میری مدخولہ پٹیشن پر سرسری سی کارروائی ہوئی تھی۔ میں نے سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف جو نکات اٹھائے تھے، اعلیٰ عدالت نے ان پر توجہ دی تھی اور انہی کی روشنی میں ہائی کورٹ نے یہ مقدمہ ٹرائل کورٹ کو ریمانڈ کر دیا تھا۔

ہائی کورٹ کی کارکردگی پر سردار احمد بہت خوش تھا۔ اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! ہمیں پہلے قدم پر ہی کامیابی ملی ہے۔ دعا کریں آئندہ بھی سارے معاملات سیدھے سیدھے چلتے رہیں۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی کہیں۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''آپ وکیل ہیں، مجھ سے زیادہ قانون کو جانتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ اب ہمارے مقدمے کی سماعت کسی دوسری عدالت میں ہو۔''

''بھئی ہائی کورٹ نے اس کیس کو واپس سیشن میں بھیجا ہے تو ظاہر ہے، سیشن کورٹ میں ہی اس کی سماعت ہوگی۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

وہ میری الجھن کو سمجھ گیا، جلدی سے بولا۔ ''شاید میں آپ کو اپنی بات ٹھیک طور پر سمجھا نہیں پایا۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ پہلے یہ کیس ایک اے ڈی جے (ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج) کی عدالت میں تھا۔ میری خواہش ہے کہ اب یہ مقدمہ کسی دوسرے جج کی عدالت میں جائے۔''

''آپ کی خواہش بہ آسانی پوری ہو سکتی ہے سردار صاحب۔'' میں نے اطمینان بخش لہجے میں اسے تسلی دی۔ ''اس سلسلے میں مجھے ایک درخواست ڈی جے (ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج) کو دینا ہوگی۔''

میری یقین دہانی کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔

میں سردار احمد کی اس خواہش کے پیچھے کارفرما اس کے احساسات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر سابق ''اے ڈی جے'' سے مطمئن نہیں تھا۔ شاید وہ اس سے انصاف کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا یہ خدشہ یا اندیشہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔

ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اسے مجسٹریٹ یا جج سے انصاف کی توقع نہ ہو یا جج غیر جانبداری سے کام نہ لے رہا ہو یا جج کی مخالف پارٹی سے کسی بھی نوعیت کی وابستگی مثلاً رشتے داری، دوستی وغیرہ ہو تو وہ شخص اپنے مقدمے کو کسی دوسری عدالت میں منتقل کروا سکتا ہے۔ اس قسم کی درخواست پر ''ڈی جے'' اس مقدمے کو یا تو اپنی عدالت میں لے لیتا ہے یا پھر کسی دوسرے ''اے ڈی جے'' کی عدالت میں بھیج دیتا ہے۔

میری درخواست پر ''ڈی جے'' نے فوری کارروائی کی اور یہ مقدمہ اپنی عدالت میں منتقل کر لیا۔ میرے نزدیک یہ ایک معمولی سی بات تھی جس کے ہونے یا نہ ہونے سے مذکورہ مقدمے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا مگر سردار احمد کی نظر میں یہ دوسری بڑی کامیابی تھی۔

انسان کی خوشی اور غم میں اس کی نفسیات کو بہت زیادہ، اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سچی خوشی نفسیات کے مطمئن ہونے کا نام ہے۔

آگے بڑھنے سے پیش تر میں آپ کے سامنے اس کیس کا مختصر پس منظر بیان کر دوں تاکہ پیش منظر کو سمجھنے کے لیے آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ مجھے یہ تمام معلومات سردار احمد، سرفراز احمد، سرفراز احمد کی بیوی یعنی مقتول کی بہن سلیقہ بانو کی زبانی پتہ چلی تھیں۔ ازیں علاوہ بعض مراحل میں میری ذاتی کوششیں بھی شامل تھیں۔

❁❁❁

مقتول شیخ احمد نے نورین کو شادی کی ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اس کے

دل میں گھر کر گئی۔ مقتول ایک صاحب ثروت شخص تھا۔ والدین کا چھوڑا ہوا سب کچھ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ اس سے دو سال چھوٹی صرف ایک بہن سلیقہ بانو تھی جس کی وہ ایک اچھے گھرانے میں شادی کر کے اپنے فرض سے فارغ ہو چکا تھا۔ سلیقہ بانو سرفراز کی بیوی اور سردار احمد کی بہو تھی۔ شیخ احمد نے سلیقہ بانو کی شادی لگ بھگ دس سال پہلے کی تھی اور اب تو ماشاء اللہ اس کی تین بچے تھے۔ آٹھ سالہ نواز، چھ سالہ فراز اور تین سالہ شاہدہ۔ شیخ احمد اور سلیقہ بانو میں خاصی بے تکلفی تھی لہٰذا سب سے پہلے اس نے اپنے دل کا احوال چھوٹی بہن کے سامنے ہی بیان کیا۔

"بانو!" اس نے سلیقہ بانو کو مخاطب کیا۔ "کیا تم اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟" وہ اپنی بہن کو پیار میں صرف بانو ہی کہتا تھا۔

"کون سی لڑکی احمد بھائی؟" سلیقہ بانو نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔

شیخ احمد نے ایک کونے میں کھڑی نورین کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ "میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔"

سلیقہ بانو نے بہ غور نورین کو دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں آج پہلی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھ رہی ہوں۔" ایک لمحے کے وقفے سے اس نے پوچھا۔ "کیوں بھائی، کوئی خاص بات ہے؟" اس کے لہجے میں میٹھے شک کی آمیزش تھی۔

"اوں...... بات تو خاص ہی ہے۔ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

"پھر تو میں ضرور بہ ضرور اس حسینہ کا سراغ لگاؤں گی۔" یہ کہتے ہوئے سلیقہ وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کا رخ نورین کے بجائے عورتوں کی اس ٹولی کی طرف تھا جو نورین سے تھوڑے فاصلے پر خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

سلیقہ نے نورین کو "حسینہ" کہا تھا اور اس کا یہ تبصرہ صدفی صد مبنی بر سچ تھا۔ نورین کا حسن شادی کی اس تقریب کو رونق بخشنے کا سب سے بڑا منبع ثابت ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں، حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر شیخ احمد خاصا حسین نظر تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد سلیقہ واپس شیخ احمد کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش دکھائی دیتا تھا۔ شیخ احمد نے بے تابی سے پوچھا۔ "کچھ معلوم ہوا بانو؟"

"سب کچھ معلوم کر کے آئی ہوں۔"

"مثلاً کیا کیا؟"

"آپ کی بے کلی سے مجھے از حد مسرت محسوس ہو رہی ہے احمد بھائی۔" سلیقہ نے شوخ لہجے میں کہا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ نورین کے تیر نظر سے گھائل ہو چکے ہیں؟"

"کون نورین؟" شیخ احمد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"وہی لڑکی...... جس کی خیر خبر معلوم کرنے آپ نے مجھے بھیجا تھا!"

"اوہ" شیخ احمد نے ایک فرحت بخش سانس خارج کیا۔ "تو اس کا نام نورین ہے۔"

"بالکل اس کا نام نورین ہی ہے۔" سلیقہ نے بھائی کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور پوچھا۔ "تھوڑی دیر پہلے میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا اس میں کتنی درستی ہے؟"

شیخ احمد نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ واقعی مجھے اچھی لگی ہے۔"

"آپ کی آنکھیں چغلی کھا رہی ہیں احمد بھائی۔" سلیقہ نے کھوج جاری رکھا۔ "کیا وہ آپ کو صرف اچھی لگی ہے یا اس سے آگے بھی کچھ......؟"

سلیقہ نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شیخ احمد نے جھینپ آمیز لہجے میں کہا۔ "بانو! شرارت سے باز آ جاؤ اور مجھے صرف وہ بتاؤ جو تم اس لڑکی...... میرا مطلب ہے، نورین کے بارے میں معلوم کر کے آئی ہو؟"

"آپ کہتے ہیں تو شرارت سے باز آ جاتی ہوں۔" سلیقہ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ "ورنہ میرا جی تو چاہ رہا ہے۔"

"بانو کی بچی!" شیخ احمد قطع کلامی کرتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں پکارا۔ "تم باز نہیں آؤ گی؟ ہوں!"

سلیقہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیں، باز آ گئی...... اور اس لیے باز آ گئی کہ آپ کے ردِعمل نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ......"

شیخ احمد نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا، جلدی سے بولا۔ "اگر سمجھ ہی گئی ہو تو پھر حرفِ مطلب کی طرف آؤ۔"

"حرفِ مطلب یا کتابِ مطلب؟" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"اب بول بھی چکو۔" شیخ احمد نے اسے میٹھے انداز میں آنکھیں دکھائیں۔

سلیقہ بانو کسی ریکارڈ کی طرح بولنے لگی۔ "جیسا کہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں، اس کا نام نورین ہے۔ وہ پی آئی بی (پیر الٰہی بخش) کالونی میں رہتی ہے۔ ایک بہن اس سے تین سال بڑی ہے۔ ثمرین اس کا نام ہے۔ دونوں بہنیں تا حال غیر شادی شدہ اور غیر منگنی شدہ ہیں۔ دونوں میں ایک اور قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ ماں ایسی ٹھنڈی چھاؤں سے محروم ہیں۔ ان کا والد مطلوب حسین تین ہٹی پر پھولوں کی ایک دکان چلاتا ہے جسے انگریزی میں فلاور شاپ کہتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکی پھر استفساریہ انداز میں بولی۔ "اس سے گزارہ چل جائے گا یا ایک چکر اور لگا کر آؤں؟"

"بس بس۔" شیخ احمد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "تم تو شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی ہو۔ پہلے تو ایسی نہیں ہوا کرتی تھیں۔"

"پھر کیا ارادہ ہے احمد بھائی؟" وہ شیخ احمد کے اپنے بارے میں تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"کس بارے میں بانو؟"

"میرا مطلب ہے، دل یہیں ٹھک گیا ہے یا دوسری کو بھی دیکھیں گے؟" وہ شرارت آمیز نظر سے بھائی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "ثمرین بھی شادی کی اس تقریب میں موجود ہے!"

"تم اس طرح نہیں مانو گی۔" وہ سرزنش آمیز لہجے میں بولا۔ "دلہا بھائی سے تمہاری شکایت کرنا پڑے گی۔"

"نہ نہ...... یہ غضب نہ کیجئے گا احمد بھائی۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "اب میں اس سلسلے میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔ ویسے وہ اس طرف دیکھیں...... ادھر انٹرنس کی جانب۔ وہ جو پرپل سوٹ میں ہے نا! وہی ثمرین ہے...... نورین کی بڑی بہن۔"

بات ختم کرتے ہی سلیقہ بانو وہاں سے کھسک لی مبادا بھائی کی ڈانٹ سننا پڑے۔

شیخ احمد نے نظر بھر کر ثمرین کو بھی دیکھا مگر وہ دل میں نہ بھر سکی۔ اس کا دل تو کسی اور ہی کے تصور کی مہک سے بھر چکا تھا۔

چند روز بعد سلیقہ بانو اپنے شوہر سرفراز احمد کے ہمراہ شیخ احمد کا رشتہ لے کر نورین کے گھر واقع پیر کالونی پہنچ گئی۔ نورین کے والد مطلوب حسین نے نہ انکار کیا اور نہ اقرار کیا۔ بس گول مول سا جواب دیا۔

"ہم پہلے بڑی کی شادی کریں گے۔ اس کے بعد نورین کے بارے میں سوچیں گے۔" مطلوب حسین نے ڈپلومیٹک انداز میں کہا۔

سلیقہ بانو نے کہا۔ "ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔ ہم پھر آئیں گے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ "ایک بات کو ضرور ذہن میں بٹھا لیں۔ اچھے رشتے بار بار نہیں آیا کرتے۔ میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے۔ شہر کے پوش علاقے میں اس کا ذاتی بنگلا ہے، اپنی گاڑی ہے۔ صدر میں زیورات کی چلتی ہوئی دکان ہے۔ یہ تو آپ کی خوش قسمتی ہے جو اتنا قیمتی رشتہ خود چل کر آپ کی دہلیز تک پہنچا ہے۔"

"آپ ہمیں سوچنے کا موقع دیں۔" نورین کے والد نے کہا۔ "آخر ہم لڑکی والے ہیں۔"

مطلوب حسین کو نرم پڑتا دیکھ کر سلیقہ نے کہا۔ "آپ بے شک سوچیں مگر سوچنے میں زیادہ وقت نہ لگائیں۔ ہم ایک ماہ کے بعد پھر آئیں گے۔"

ایک ماہ بعد جب سلیقہ بانو دوبارہ نورین کے گھر پہنچی تو مطلوب حسین نے ایک انوکھی تجویز اس کے سامنے رکھی۔ "کیوں نہ ایسا کریں کہ آپ اپنے بھائی کے لیے میری بڑی بیٹی ثمرین کا رشتہ طے کر لیں!"

"دیکھیں انکل! آپ میری بات کا برا نہ مانیے گا۔" سلیقہ بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "سچی بات تو یہ کہ احمد بھائی نے آپ کی چھوٹی بیٹی کو ہی پسند کیا ہے۔ یہ پسند اور محبت کا معاملہ ہے اس لیے

اس سلسلے میں سمجھوتا ممکن نہیں۔"

مطلوب حسین ناراضی سے بولا۔ "اگر آپ کا بھائی نورین کو پسند کرتا ہے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ نورین بھی اسے پسند کرلے گی۔ وہ انکار بھی تو کر سکتی ہے۔"

"بے شک وہ انکار کا حق رکھتی ہے۔" سلیقہ نے کہا۔ "میں تو آپ ہی کے بھلے کی بات کر رہی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر اپنی بات کو دہراؤں گی کہ آپ میری راست گوئی کا برا نہ مانیے گا۔ میں حقیقت پسند انسان ہوں۔ آپ بھی اگر حقیقت پسندی سے سوچیں تو مجھے درست پائیں گے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "دیکھیں اگر آپ کی بیٹی نورین ایک بڑے گھر میں جائے گی تو ثمرین کے لیے بھی اچھے رشتوں کے مواقع پیدا ہوں گے۔ نورین اس وقت چھبیسویں سال میں ہے اور ثمرین کا اٹھائیسواں چل رہا ہے۔ ان کا کوئی بھائی بھی نہیں۔ ماں کی مامتا سے وہ پہلے ہی محروم ہیں۔ آپ کب تک اچھے رشتے کے انتظار میں انہیں گھر بٹھائے رکھیں گے اور پھر یہ کوئی فارمولا تو نہیں کہ پہلے بڑی ہی کی شادی ہو۔ جس کا اچھا اور مناسب رشتہ آ جائے اس کو بخوشی رخصت کر دینا چاہیے۔ آپ ٹھنڈے دل اور مثبت انداز میں میری باتوں پر غور کیجئے گا۔ میں آپ سے پیشگی وعدہ کرتی ہوں کہ ثمرین کے اچھے رشتے کے سلسلے میں ہم اپنی سی پوری کوشش اور بھرپور 'تعاون' کریں گے۔"

سلیقہ بانو نے لفظ 'تعاون' اس انداز میں ادا کیا تھا کہ بوڑھے مطلوب حسین کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ سلیقہ کی بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، سلیقہ بانو نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایک اور زوردار ضرب لگائی۔

"انکل! میں ایک بات آپ پر ابھی واضح کر دینا چاہتی ہوں، اور وہ یہ کہ ہمیں کسی قسم کے جہیز کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ کسی اچھے گھرانے میں ثمرین کے رشتے کے لیے ان لوگوں نے کسی جہیز کا مطالبہ کیا تو ہم ان کا ہر مطالبہ پورا کریں گے۔"

مطلوب حسین کوئی لالچی شخص نہیں تھا تاہم اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دو جوان بیٹیوں کا بیمار باپ تھا۔ دکانداری اب اس کی ہمت سے باہر تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو روزگار میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ ان حالات میں اگر چھوٹی بیٹی کا بہت اچھا رشتہ خود چل کر دروازے پر آ گیا تھا اور بڑی بیٹی کے لیے بھی اک قوی امید پیدا ہوگئی تھی تو یہ مطلوب حسین کی خوش نصیبی ہی تھی۔ اس کے پاس سلیقہ کی تجویز کو رد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگر وہ اپنی ضد پر قائم رہتا تو یہ بیٹیوں کے ساتھ دشمنی والی بات ہوتی۔ وہ تو اپنی بیٹیوں کے آرام کی خاطر جان قربان کر سکتا تھا۔

جو لوگ خوش قسمتی کی دستک پر کان نہیں دھرتے، وہ زندگی بھر پچھتاتے رہتے ہیں۔ مطلوب

حسین ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ پشیمانی کو اس کا دامن پکڑنے کا موقع ملتا۔ بالآخر اس نے اپنی بیٹیوں کے حق میں سلیقہ بانو کی "درخواست" ماننے کا اٹل ارادہ کرلیا۔ یہ ایک مجبور اور غریب باپ کا سمجھوتا نہیں بلکہ ایک دور بین شخص کا اپنی اولاد کے لیے محبت کا اظہار تھا۔

تیسری ملاقات پر کامیابی نے سلیقہ کے قدم چومے۔ مطلوب حسین اس رشتے کے لیے راضی ہوگیا تھا پھر کس بات کی دیر تھی۔ آئندہ دو ماہ کے اندر نورین، شیخ احمد کے بنگلے واقع بہادر آباد میں منتقل ہوچکی تھی...... مسز شیخ بن کر۔

شیخ احمد کا بنگلا چار سو گز پر مشتمل تھا اور وہ بہادر آباد کا پوش علاقہ تھا۔ اس دو منزلہ بنگلے کی تعمیر بڑی دلکش تھی۔ نورین کا پیر کالونی والا مکان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خاصی خوش قسمت ثابت ہورہی تھی۔

شیخ احمد کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ دو ماہ کیف و سرور کی ساعتوں میں گزر گئے۔ تیسرے ماہ کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں جو شیخ احمد کے لیے تشویش کا باعث تھیں۔

جہاں انسان کے چار دوست ہوتے ہیں وہیں ایک آدھ دشمن بھی ضرور ہوتا ہے چاہے وہ دشمن پوشیدہ ہو یا کھلم کھلا اور دشمنوں کا تو کام ہی دشمنی ہوتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کوئی موقع نہیں گنواتے۔ شیخ احمد اس بات کی تصدیق نہیں کرسکا تھا کہ اس تک جس قسم کی خبریں پہنچ رہی تھیں ان میں کوئی حقیقت بھی تھی یا یہ صرف نورین کے کسی بدخواہ کی اڑائی ہوئی تھیں۔

پہلی ناگوار بات جو شیخ احمد تک پہنچی وہ یہ تھی کہ نورین اس شادی کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔ مطلوب حسین نے جانے کون سی قسم دے کر اسے اس شادی کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی باپ کی بات ماننے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ شیخ احمد نے جب اس سلسلے میں نورین سے استفسار کیا تو وہ صاف مکر گئی۔

"آپ کو کسی نے بالکل غلط اطلاع دی ہے۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔"

شیخ احمد نے معتدل لہجے میں کہا۔ "دیکھو نورین! یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو بھی مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ایسا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ مضبوط و توانا رہے۔ اگر اس بات میں کوئی حقیقت ہے تو تم مجھے صاف صاف بتادو۔ مجھے بہت خوشی ہوگی کہ تم نے مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔"

"میں بتاچکی ہوں نا، سرے سے ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔" نورین نے محتاط لہجے میں کہا۔ "ورنہ میں آپ سے کیوں چھپاتی۔ آپ کو مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

"میں تم پر مکمل بھروسہ کرتا ہوں نورین!"

"مجھے یقین ہے۔" نورین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "آج سے میں اپنے ذہن میں یہ بات فیڈ کر لیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ سنا وہ فضولیات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سچ وہی ہے جو تم نے بتایا، باقی سب جھوٹ۔ او کے!"

"آپ کتنے اچھے ہیں احمد۔" نورین نے لگاوٹ کے انداز میں کہا۔ "مجھے اس بات پر فخر ہے کہ آپ مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں۔"

شیخ احمد، نورین کی محبت سے مستفید ہوتے ہوئے بولا۔ "میری نظر میں ایک رشتہ ہے۔ میرے خیال میں ثمرین کے لیے نہایت ہی مناسب اور موزوں رہے گا۔"

"کون سا رشتہ ہے؟" نورین ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"میرے ایک جاننے والے کا چھوٹا بھائی ہے۔" شیخ احمد نے بتایا۔ "اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ لیاقت آباد میں مناسب رہائش بھی ہے۔ تم او کے کرو تو میں بات آگے بڑھاؤں؟"

نورین نے پوچھا۔ "موصوف کا نام کیا ہے، کاروبار کس نوعیت کا ہے اور عمر وغیرہ کتنی ہے؟"

"تم نے تو ایک ہی سانس میں تین سوال کر ڈالے۔"

"شاید یہ میری خوشی کا کرشمہ ہے!" وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

"اچھا!" شیخ احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ لڑکے کا نام افضل خان ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک گارمنٹ فیکٹری کا مالک ہے اور آخری سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ وہ ثمرین سے صرف دو سال بڑا ہے۔"

نورین مطمئن ہوگئی، پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ "دیکھنے میں کیسا لگتا ہے؟"

"ہینڈسم اسمارٹ۔" شیخ احمد نے جواب دیا۔ "ثمرین کے ساتھ اس کی بہت اچھی جوڑی بنے گی۔ افضل کی ہائیٹ "فائیو ایٹ" ہے اور میرا خیال ہے ثمرین "فائیو ٹو" کی ہے۔ کیوں، ہے نا مثالی جوڑی؟"

نورین، شیخ احمد کا اشارہ سمجھ گئی، پٹ سے بولی۔ "آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا ہماری جوڑی مثالی نہیں ہے؟"

"بالکل ہے...... بھئی بالکل ہے۔" شیخ احمد راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "آخر قد کی کمی زیادتی سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ اگر تم میری بغل میں آتی ہو تو اس سے تمہارے حسن کا کیا بگڑتا ہے۔ تم چاند ہو، چاند ہی رہوگی۔ میری بغل تک پہنچو یا سر پر آن بیٹھو۔"

"آپ نے تو مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے۔" نورین نے شوخ لہجے میں کہا۔ "سچ کہہ رہی ہوں احمد! آپ کے قریب آکر میں یوں محسوس کرتی ہوں جیسے خود بہ خود میرے قد میں اضافہ ہوگیا ہو۔"

نورین پستہ قامت تھی جب کہ شیخ احمد دراز قد کا مالک تھا۔ دو انتہاؤں کی قربت میں، دیکھنے والوں کو یہ فرق کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا تھا۔

نورین نے افضل خان کا رشتہ اوکے کر دیا۔ مطلوب حسین کو بھلا اس سلسلے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ شیخ احمد کے بھرپور "تعاون" سے چھ ماہ کے اندر اندر شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں اور اس طرح ثمرین، افضل خان کی دلہن بن کر لیاقت آباد المعروف بہ لالو کھیت جا بسی۔ شیخ احمد نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔

مطلوب حسین کی دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ ذمے داری کا بوجھ کندھوں سے اترا تو بیماریوں نے اس پر یلغار کر دی۔ دکان پر جانا چھوٹ گیا۔ بیماریوں نے اس قدر گھیراؤ کیا کہ جان لے کر ہی بس کی۔ مطلوب حسین کی جب میت اٹھی تو آنسو بہانے والوں میں اس کی بیٹیوں کے علاوہ اس کے داماد بھی شامل تھے۔

آئندہ ایک سال نہایت امن وامان سے گزر گیا پھر ایک "قیامت" نے سر اٹھایا۔ شیخ احمد کو معلوم ہوا کہ نورین نے اس سے بہت کچھ چھپایا تھا۔ اعتماد کی دیوار میں پڑنے والی اس دراڑ نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ شیخ احمد کو رپورٹ ملی تھی کہ شادی سے انکار والی بات نورین کے حوالے سے بالکل سچی تھی اور اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے محلے کے ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ شیخ احمد کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ نورین شادی سے قبل کسی کو پسند کرتی تھی۔ دکھ کی بات یہ تھی کہ نورین نے اس پر بھروسا نہ کرتے ہوئے اس راز کی پردہ پوشی کی تھی۔ ایک رات اس نے نورین سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"نورین! ایک بات پوچھوں؟"

"ایک چھوڑ دس باتیں پوچھیں۔" نورین نے خوش دلی سے کہا۔

"جواب میں سچ بولو گی نا؟"

"پہلے کبھی آپ سے جھوٹ بولا ہے!"

"میں پہلے کی نہیں، ابھی کی بات کر رہا ہوں۔"

"آج آپ کا لہجہ خاصا بدلا ہوا ہے احمد۔" نورین نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خیریت تو ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

احمد نے کہا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... اور اگر تم نے میری بات کا سیدھا اور سچا جواب نہ دیا تو طبیعت مزید بھی بگڑ سکتی ہے۔"

"پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟" نورین فکرمند ہو گئی۔

شیخ احمد نے پوچھا۔ "کیا تم کسی جمشید نامی شخص سے واقف ہو؟"

نورین سناٹے میں رہ گئی۔

جمشید علی اس شخص کا نام تھا، شادی سے قبل نورین جسے پسند کرتی تھی۔ جمشید انہی کے محلے میں رہتا تھا۔ وہ ایک لاابالی، کھلنڈرا اور آوارہ سا نوجوان تھا۔ محلے میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ لوگ

اس کی عزت کرنے کے بجائے اس سے ڈرتے تھے۔ کوئی اس کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنی آوارگی اور بدمعاشی سے لوگوں کے دلوں پر دھاک بٹھا رکھی تھی۔ محلے کے اکثر لڑکے نورین پر مرتے تھے لیکن قابل غور اور اہم بات یہ تھی کہ نورین، جمشید علی کو پسند کرتی تھی۔ یہ ایک خلافِ معمول اور غیر منطقی بات تھی۔ لڑکیاں عموماً مثبت کردار کے لڑکوں کو پسند کرتی ہیں مگر نورین کو جمشید میں ایک انفرادیت نظر آتی تھی۔ دوسرے لڑکے اسے متاثر کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزماتے تھے۔ وہ اس کی توجہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برخلاف جمشید نے کبھی کوئی اوچھی حرکت نہیں کی تھی۔ نورین کو وہ غنڈا صفت شخص محلے کے دیگر "شریف" لڑکوں سے زیادہ شریف اور باوقار لگتا تھا۔ نورین یہ بات واضح طور پر محسوس کر لی تھی کہ جمشید علی بھی اسے بے حد پسند کرتا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ نورین نے شیخ احمد کے رشتے کے حوالے سے یقیناً انکار کیا ہوگا!

"تمہاری یہ طویل خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ تم جمشید علی کو بہت اچھی طرح جانتی ہو!" شیخ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

نورین گڑبڑا گئی، بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "نن...... نہیں...... ہاں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے!

"ایک جواب دو۔" شیخ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہاں یا نہ۔"

"ہاں۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ "میں جمشید علی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔"

شیخ احمد نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور تم اس غنڈے کو پسند کرتی تھی۔ اسی وجہ سے تم نے مجھ سے شادی سے انکار بھی کیا تھا؟"

نورین خاموش رہی تاہم اس کے بدن کے مختلف اعضا اضطراری کیفیت میں مبتلا تھے۔

شیخ احمد نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھو نورین! اگر شادی سے پہلے تم کسی جمشید ومشید کو پسند کرتی تھیں تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ ہر لڑکی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی کو بھی چاہ سکتی ہے مگر شادی کے بعد اسے صرف اور صرف اپنے شوہر کی وفادار بن کر رہنا چاہیے۔"

"میں نے آپ سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔" وہ منمنائی۔

"میں جانتا ہوں نورین۔" شیخ احمد نے کہا۔ "میں تمہارے کردار کی مضبوطی سے واقف ہوں مگر اس بات نے میرا دل پارہ پارہ کر دیا ہے کہ تم نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔ حقیقتِ حال کو چھپا کر تم نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہاری نظر میں میری کوئی وقعت نہ ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے احمد۔" نورین نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "میں آپ پر مکمل بھروسا کرتی ہوں مگر میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ آپ کو اپنے ماضی کے اس گوشے سے روشناس کراؤں۔"

"کیوں، کیوں ضروری نہیں سمجھا؟" شیخ احمد نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "کیا میں نے اپنے

ماضی کا کوئی گوشہ تم سے پوشیدہ رکھا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولی۔ ''میں اس واقعے کو بھول جانا چاہتی تھی۔ میرا خیال تھا' جو بات ختم ہوگئی اس کا تذکرہ کرنے کا کیا فائدہ۔''

''کیا بات ختم ہوگئی تھی؟'' شیخ احمد نے متعجب انداز میں پوچھا۔

نورین نے بتایا۔''ہماری شادی کے کچھ عرصے بعد جمشید علی کسی جرم کی سزا پا کر جیل چلا گیا تھا پھر مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی اور میں نے خود بھی اس تلخ موضوع پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''تلخ موضوع!'' شیخ احمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔''نورین! تم تو جمشید کو پسند کرتی تھیں پھر یہ موضوع تمہارے لیے تلخ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہ بدمعاش بھی تمہیں چاہتا تھا!''

نورین زچ ہوتے ہوئے بولی۔''مجھے تو محلے کے ایک درجن لڑکے پسند کرتے تھے۔ وہ میرا دم بھرتے تھے' مجھے دیکھ کر ان کے سینے سے ٹھنڈی آہیں خارج ہوتی تھیں۔ میں ہر ایک سے تو شادی نہیں کرسکتی تھی۔ میری قسمت میں آپ لکھے ہوئے تھے' آپ سے میری شادی ہوگئی۔''

''کیا تم اسے اپنی بدقسمتی سمجھتی ہو؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

شیخ احمد نے کہا۔''کیا تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ میرے بجائے اگر تمہاری شادی جمشید علی سے ہوجاتی تو تم زیادہ اچھی زندگی گزار رہی ہوتیں؟''

''پلیز......احمد!'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''خدارا' مجھے میری نظر میں ہلکا نہ کریں۔ جمشید کا بار بار ذکر کرکے آپ مجھے بہت اذیت پہنچا رہے ہیں۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا نورین!''

''کیوں' میں نے کوئی پیچیدہ بات تو نہیں کی۔''

''جمشید کے ذکر سے تمہیں اذیت کیوں پہنچ رہی ہے؟''

''میں آپ کے سوا اب کسی کا نام بھی نہیں سننا چاہتی۔'' نورین نے حتمی لہجے میں کہا۔''آپ آئندہ اس موضوع پر مجھ سے بات نہیں کریں گے۔ جس طرح میں نے اس واقع کو اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دیا ہے' آپ بھی ویسے ہی اس تلخ تذکرے کو بھول جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مفاہمت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں خود بھی چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان تلخیوں کا گزر نہ ہو۔ میں ناگوار باتوں کو بھلا دینے کا قائل ہوں۔ مجھے تو بس اس خیال سے تکلیف پہنچی تھی کہ تم کچھ باتیں مجھ سے چھپا کر رکھتی ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔''نورین! میاں بیوی کا رشتہ دنیا کا سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ کمزور تعلق ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی اپنے دل اور ذہن کو ایک دوسرے کے سامنے کھلا رکھیں تو اس رشتے کی پائیداری بے مثال ہوجاتی ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس تعلق میں دراڑ پیدا نہیں کرسکتی۔ بہ صورت

دیگر' اگر میاں بیوی ایک دوسرے پر اعتماد نہ کریں۔ ایک دوسرے سے اپنی باتیں چھپائیں تو رفتہ رفتہ ان کے درمیان فاصلے بڑھنے لگتے ہیں پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ تعلق آندھیوں کی زد پر رکھے ہوئے چراغ کے مانند ہوجاتا ہے۔ میرا خیال ہے' تم میری بات سمجھ رہی ہو!''

نورین خاموش رہی۔ اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ شیخ احمد مطمئن ہوگیا۔ وہ اپنی دانست میں اپنا فرض بہ طریق احسن ادا کرچکا تھا۔

آئندہ سال ملا جلا رہا۔ میاں بیوی کے درمیان کوئی بدمزگی نہ ہوئی تاہم ایک حوالے سے ان کی محرومی برقرار رہی۔ ابھی تک ان کے آنگن میں کوئی پھول نہیں کھلا تھا جب کہ اس دوران میں نورین کی بڑی بہن ثمرین دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ قدرت کی مصلحتوں کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا مگر اس خلا نے ان کے مابین تعلقات پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ شیخ احمد کے انداز سے بیزاری جھلکنے لگی تھی۔

سلیقہ بانو کے مطابق شادی کے چوتھے سال سے ان کے درمیان باقاعدہ نوک جھوک کا سلسلہ بھی نکلا تھا۔ نورین چڑچڑی ہوگئی تھی اور اکثر اوقات وہ اپنے شوہر کو سخت جواب دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی جارہی تھی۔ نورین نے جب اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کیا تو شیخ احمد کو اس پر سخت اعتراض ہوا۔ نتیجے میں ان کے درمیان باقاعدہ لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔ سلیقہ نے مجھے بتایا کہ نورین اب خاصی بدزبانی سے کام لینے لگی تھی۔ اس نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا کہ نورین ان دنوں اپنے شوہر سے بے وفائی کی مرتکب بھی ہورہی تھی۔

میں نے استفسار کیا۔''کس قسم کی بے وفائی؟''

''عورت کی بے وفائی ایک ہی قسم کی ہوتی ہے وکیل صاحب!'' سلیقہ نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟''

''میں اس سلسلے میں کوئی نشاندہی نہیں کرسکتی۔''

''کہیں جمشید علی......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے بتایا۔''اس کے بارے میں مجھے کوئی خبر نہیں۔ پتہ نہیں' جیل ہی میں ہے یا کہیں بدمعاشی کررہا ہے۔''

''کیا آپ جمشید کو پہچانتی ہیں؟''

''میں نے اسے ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا۔'' وہ بولی۔ ''صرف اس کا تذکرہ ہی سنا ہے۔ وہ بھی بھائی احمد کی شادی کے بعد یہ موضوع چھڑا تھا۔''

سلیقہ بانو' مقتول شیخ احمد کی بہن تھی اس لیے ظاہر ہے' اس کی ساری ہمدردیاں بھائی کے ساتھ تھیں۔ ایک رائے یہ بھی پائی جاتی تھی کہ نورین کو اپنے شوہر کی حرکتوں پر شک تھا۔ اس کے خیال میں

اس کا شوہر غیر عورتوں سے ملتا تھا۔ گویا ایک طرح سے وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں شبہات کا شکار تھے جو کہ ایک خطرناک علامت تھی...... اور اس...... ریڈ سگنل کا نتیجہ خاصا خطرناک برآمد ہوا تھا۔

واقعات کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول اپنے گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس نے دوپہر ہی میں ملزمہ کو بتایا تھا کہ ایک روز کے لیے اسے ضروری کام سے لاہور جانا تھا لہٰذا وہ یا تو اپنی بہن کے گھر چلی جائے یا پھر اسے اپنے پاس بلالے۔ نورین نے ثمرین کو اپنے گھر بلانے کا فیصلہ کیا تھا۔

نورین کے مطابق اس رات ثمرین اس کے پاس نہیں آسکی تھی۔ عین وقت پر ثمرین نے اسے فون کر کے بتایا تھا کہ اس کی نند فریدہ کے یہاں زچگی ہونے والی ہے لہٰذا وہ اپنے شوہر کے ساتھ میٹرنٹی ہوم جانے کے لیے مجبور ہے۔ فریدہ کا شوہر چند روز کے لیے حیدرآباد گیا ہوا تھا۔ افضل خان اور ثمرین کا فریدہ کے ساتھ جانا از حد ضروری ہوگیا تھا۔

وقوعہ کی رات نورین نے اپنے ہی بنگلے پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ اس نے سوچا' کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کر کے وہ اطمینان سے سو جائے گی۔ یہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ تھا' ایسے موقع پر کسی عورت سے جس کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔

نورین نے وہ رات اپنی خواب گاہ میں گزارنے کے بجائے بالائی منزل کے ایک کمرے کا انتخاب کیا تھا۔ کبھی کبھار وہ دونوں رات بالائی منزل پر بھی گزار لیتے تھے تاہم ان کی مستقل خواب گاہ زیریں منزل پر ہی تھی۔

نورین کے بیان کے مطابق وہ لگ بھگ بارہ بجے ٹی وی آف کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی اور خلافِ معمول اسے جلد ہی نیند آگئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہونے پر اسے اندازہ ہوا کہ اس کی آنکھ زیریں منزل سے آنے والی آوازوں کے سبب کھلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نیچے والی منزل کے کسی کمرے میں کوئی موجود ہو۔ یہ احساس ہوتے ہی اس کی نیند کافور ہوگئی۔

اس نے فوری طور پر بستر چھوڑ دیا اور بیڈ سائیڈ کی دراز کھول کر ایک ریوالور برآمد کرلیا۔ یہ شیخ احمد کا ذاتی لائسنس یافتہ ریوالور تھا۔ بالائی منزل پر آتے ہوئے نورین حفاظت کے خیال سے وہ ریوالور اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

نورین نے زیریں منزل پر ہونے والی گڑبڑ کی خبر گیری کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک اور جرأت مندانہ اقدام تھا۔ وہ ریوالور بہ دست نیچے پہنچی۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ کھٹ پٹ کی وہ آوازیں ان کی خواب گاہ کے اندر سے برآمد ہو رہی تھیں۔ نورین کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اوپر جاتے وقت اس کمرے...... بلکہ زیریں منزل کے تمام کمروں کو لاک کر گئی تھی مگر اس وقت اسے خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا نظر آرہا تھا۔ طرہ یہ کہ اندر لائٹ بھی آن تھی۔

نورین بے دھڑک خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ وہاں کا منظر اس کو تشویش میں مبتلا کردینے کے لیے کافی تھا۔ ایک لمبا تڑنگا نقاب پوش دیوار گیر الماری سے نبرد آزما تھا۔ اس چوبی الماری کے اندر وہ لاکر بھی موجود تھا۔ جس میں نورین کے زیورات اور نقدی رکھی رہتی تھی۔ نورین نے دیکھا' مذکورہ نقاب پوش نقب زن بڑی تیزی سے زیورات کے ڈبے اور نقدی' اپنے ہاتھ میں موجود ایک بیگ میں منتقل کر رہا تھا۔ شاید وہ نورین کی آمد سے واقف نہیں تھا اسی لیے بلا تکلف اپنی کارروائی جاری رکھے ہوئے تھا۔

نورین کے مطابق' وہ اس موقع پر خاموش تماشائی بنی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے رعب دار لہجے میں کہا۔ ''کون ہو تم؟''

نقاب پوش کے ہاتھوں کی مشینی حرکات کو بریک لگ گئے اور اس نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ اس وقت نورین کو نقاب پوش کے ہاتھ میں ایک پستول دکھائی دیا۔ یہی نہیں' بلکہ نقاب پوش نے پستول والے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی تھی جیسے وہ نورین پر فائر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ نورین موت کا شکار ہونے والی تھی مگر ان لمحات میں نورین کے دماغ نے ایک برقی فیصلہ کیا پھر اس سے قبل کہ نقاب پوش کی انگلی پستول کے ٹریگر کو دبا پاتی' نورین نے یکے بعد دیگرے اپنے ریوالور سے دو فائر کردیے۔ ایک گولی نقاب پوش کی کھوپڑی میں لگی' دوسری اس کے حلقوم میں پیوست ہوگئی۔

نورین چند لمحات تک سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ نقاب پوش ایک لاش کی صورت میں خواب گاہ کے فرش پر الٹا پڑا تھا۔ جب نورین کے حواس بجا ہوئے تو اس نے فوراً پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ پولیس کی آمد پر ہی یہ معلوم ہوسکا تھا کہ وہ نقاب پوش درحقیقت نورین کا شوہر شیخ احمد تھا۔ نقاب کے پیچھے اس نے اپنے شوہر کو گولیوں کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

وکیل صفائی کے مطابق' نورین نے وہ قتل ''حق حفاظتِ خود اختیاری'' کے تحت کیا تھا۔ لہٰذا وہ کسی بھی قسم کی سزا کی مستحق نہیں تھی۔ علاوہ ازیں جب وہ نقاب پوش پر گولی چلا رہی تھی اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نقاب کے پیچھے اس کا اپنا شوہر موجود تھا۔ یہ بات وکیل صفائی نے فاضل عدالت میں ثابت بھی کی تھی اس لیے نورین کو باعزت بری کردیا گیا تھا۔

میری تحقیق' تجزیے اور تجربے کے مطابق یہ حق حفاظت خود اختیاری کا معاملہ نہیں تھا اور اب یہی بات مجھے وکیلِ استغاثہ کے طور پر ثابت بھی کرنا تھا۔

اوپر میں نے اس کیس کے بارے میں جو تفصیل بیان کی ہے اس کے علاوہ بھی مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں جن کا اظہار سردست مناسب نہیں۔ عدالتی کارروائی کے دوران موزوں موقع پر میں ضرور ان کا ذکر کروں گا۔

❁ ❁ ❁

منظر عدالت کا تھا!

اکیوزڈ باکس (ملزموں کے کٹہرے) میں ملزمہ نورین بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ اس کا قد خاصا کم تھا مگر حسن و جمال میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ بلاشبہ اسے ماہ پارہ کہا جاسکتا تھا۔

نورین اس روز ایک خوب رو شخص کے ساتھ عدالت میں پہنچی تھی۔ مذکورہ شخص کے صحت مند چہرے پر گھنی مونچھیں خوشگوار تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ میں اس شخص کے بارے میں کوئی حتمی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ وہ جس انداز میں نورین کے ساتھ ساتھ لگا ہوا تھا اس سے یہی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ نورین کے بہت قریب تھا۔

وکیل صفائی کا نام آفتاب لودھی تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی شہرت قابل ذکر نہیں تھی لیکن چوں کہ وہ ملزمہ کو پہلے بھی باعزت بری کروا چکا تھا اس لیے وہ خاصی مطمئن دکھائی دیتی تھی حالانکہ نورین کی بریت میں وکیل صفائی کی لیاقت سے زیادہ وکیل استغاثہ کی حماقت شامل تھی۔

استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے مقتول کی بہن سلیقہ بانو گواہی دینے کے لیے وٹنس باکس (گواہوں کا کٹہرا) میں آئی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد میں اپنی مخصوص سیٹ سے اٹھا اور کراس ان چیف کے لیے گواہ کے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے گواہ سے پوچھا۔ ''محترمہ سلیقہ بانو! ایک ہی مقدمے میں دوسری مرتبہ گواہی کے لیے حاضر ہونا کیسا لگ رہا ہے؟''

''میں اپنے بھائی کی قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے ہزار بار گواہی دینے آ سکتی ہوں۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل صفائی نے اعتراض جڑ دیا۔ ''جناب عالی! میری موکلہ پر قتل ثابت نہیں ہوا اس لیے استغاثہ کے گواہ کا اسے قاتل کہنا قانون کے خلاف ہے۔ وکیل استغاثہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ گواہ کو ملزم اور مجرم کا فرق سمجھائیں۔''

میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! گواہ کا سگا بھائی جان سے گیا ہے۔ اس کا جذباتی ہونا ایک فطری امر ہے پھر اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ گواہ قانون کا طالب علم نہیں بلکہ ایک مقتول کی بہن ہے۔'' پھر میں نے سلیقہ بانو کو مخاطب کرتے ہوئے تاکید کی کہ وہ اس سلسلے میں احتیاط کا دامن نہ چھوڑے۔

''میں آئندہ خیال رکھوں گی۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''سلیقہ صاحبہ! آپ کے انداز اور ردِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی؟''

''ہر بہن کو اپنے بھائی سے محبت ہوتی ہے جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''احمد بھائی تو میرے لیے سب کچھ تھے۔ والدین کی وفات کے بعد میرے لیے ماں بھی وہی تھے اور باپ بھی وہی۔ انہوں نے کبھی مجھے والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ حتیٰ کہ شادی کے بعد بھی ہمارے تعلقات میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح مجھ سے ملتے تھے جیسا کہ شادی سے پہلے ہمارے درمیان میل تال تھا۔''

میں نے سوال کیا۔ ''شادی سے آپ کی مراد کس کی شادی ہے؟''

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اس کی مشکل بھانپ لی اور وضاحت آمیز لہجے میں کہا ''میرا مطلب ہے' آپ کی شادی یا مقتول کی شادی؟''

وہ اطمینان بھرا سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''میری شادی۔''

''کیا مقتول کی شادی کے بعد بھی یہ صورتِ حال برقرار رہی تھی۔'' میں نے استفسار کیا۔ ''مقتول کی شادی آپ کی شادی کی بعد ہی ہوئی تھی نا؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''جی ہاں! احمد بھائی کی شادی مجھ سے پانچ سال بعد ہوئی تھی اور وہ شادی میری ہی کوششوں کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ کاش! میں نے یہ کوشش نہ کی ہوتی۔'' وہ اداس ہو گئی۔ ''مگر انسان کو آنے والے وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ تو جو بھی کرتا ہے' اپنے تئیں درست ہی کرتا ہے۔''

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بانو صاحب!'' میں نے اس کی توجہ اپنے سوال کی جانب مبذول کروائی۔ ''میں نے آپ سے پوچھا تھا......''

''آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ صورتِ حال برقرار نہیں رہی تھی۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''اور اس کی وجہ بھی یہی تھی۔'' اس نے کٹہرے میں کھڑی نورین کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے زاویہ سوال تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بانو صاحبہ! جیسا کہ آپ نے بتایا ہے' آپ اپنے مقتول بھائی کے بہت قریب تھیں۔ آپ دونوں کو ایک دوسرے سے جذباتی لگاؤ تھا۔ آپ ایک دوسرے سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ آپ کو بہت اچھے دوست بھی کہا جا سکتا ہے۔ میرا اندازہ غلط تو نہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''ہم واقعی بہت اچھے دوست بھی تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''سلیقہ بانو صاحبہ! آپ کے مقتول بھائی کو شادی کے بعد مختلف مراحل پر کئی قسم کے حالات درپیش رہے تھے۔ کیا وہ آپ کو اپنے حالات کے بارے میں کچھ بتاتے رہتے تھے؟''

''جی ہاں' وہ ذرا ذرا سی بات مجھے ضرور بتاتے تھے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ''بھائی صاحب کی تمام پریشانیوں کی جڑ یہی عورت تھی۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر نورین کی جانب اشارہ کیا اور نفرت

سے اسے گھورا۔

''کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گی؟'' میں نے کریدا۔

وہ بولی۔''شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس عورت کے کسی پرانے معاشقے کا ذکر نکل آیا تھا پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' اس عورت کی حرکتوں نے بھائی کی زندگی اجیرن کردی اور بالآخر اس نے بھائی کو......''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر انداز ایسا تھا کہ کچھ نہ کہہ کر بھی وہ سب کچھ کہہ گئی تھی۔

میں نے اگلا سوال کیا۔''بانو صاحبہ! ملزمہ کے بیان کے مطابق وقوعہ کی رات مقتول گھر پر نہیں تھا۔ دوپہر میں اس نے ملزمہ کو بتایا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے ایک دن کے لیے لاہور جارہا ہے۔ کیا مقتول نے آپ کو بھی اپنے اس پروگرام سے آگاہ کیا تھا؟'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔''آپ کا دعویٰ ہے کہ مقتول آپ کو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بتاتا تھا!''

''مجھے اپنے اس دعوے کے لیے اپنے بھائی پر فخر ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔''مگر میں آپ کو بتاؤں کہ بھائی نے وقوعہ کے روز اپنے لاہور جانے کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔''

''ممکن ہے' وہ آپ کو بتانا بھول گیا ہو؟''

''ناممکن!'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔''بھائی کھانا کھانا تو بھول سکتے تھے لیکن کراچی سے باہر جانے کے پروگرام کے بارے میں مجھے آگاہ کرنا نہیں بھول سکتے تھے۔''

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔''گویا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نورین نے اپنے بیان میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ کے مقتول بھائی اس روز کراچی ہی میں تھے؟''

''بالکل' میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔''آپ میری بات کی تصدیق کرسکتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''بھائی کی دکان پر دو ملازم کام کرتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔''ان میں سے ایک خاصا پرانا اور وفادار ملازم ہے۔ وہ بھائی کے ہر پروگرام سے واقف رہتا ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''مذکورہ ملازم کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عبدالشکور۔'' سلیقہ بانو نے جواب دیا۔

''اس کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود ہے۔'' میں نے اپنی فائل میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔''وقت آنے پر اس سے پوچھ لیا جائے گا۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے جرح ختم کردی۔ اپنی باری پر وکیل صفائی' استغاثہ کی گواہ سلیقہ بانو پر جرح کرنے اس کے کٹہرے کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے سوال کیا۔

''محترمہ سلیقہ بانو صاحبہ! وکیل استغاثہ نے آپ کو سلیقہ صاحبہ' بانو صاحبہ اور سلیقہ بانو صاحبہ کے ناموں سے مخاطب کیا ہے۔ کیا میں بھی یہ جسارت کرسکتا ہوں؟''

''آپ مجھے صرف سلیقہ بانو ہی کہیں تو بہتر ہوگا۔'' وہ روکھے لہجے میں بولی۔

''آل رائٹ۔'' آفتاب لودھی نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر سوال کیا۔''سلیقہ بانو صاحبہ! آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔''میرے فاضل دوست ایک غیر متعلق سوال کررہے ہیں۔''

وکیل صفائی آفتاب لودھی کو سنجیدہ حلقوں میں پسند نہیں کیا جاتا۔ اس کا حلقۂ احباب بھی اس ہی جیسے لوگوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت بار روم میں بیٹھ کر ضائع کرتا تھا۔ میرے لیے بھی وہ ایک ناپسندیدہ شخص تھا پھر اس کیس میں تو ہم ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ میرے اعتراض کے جواب میں آفتاب لودھی نے کہا۔

''یور آنر! گواہ کی شادی سے متعلق سوال قابل اعتراض کیسے ہوسکتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وکیلِ استغاثہ سے وہ خود اپنی اور اپنے بھائی کی شادی کے بارے میں خاصی تفصیلی بات چیت کرچکی ہیں۔''

جج نے میرے اعتراض کو رد کرتے ہوئے وکیل صفائی سے کہا۔''ڈیفنس' پلیز پروسیڈ۔''

آفتاب لودھی نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔ وہ ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص تھا۔ بال سولجر کٹ اور چہرے پر ہٹلر مارکہ مونچھیں۔ وہ اپنے حلیے کے مطابق حرکتیں بھی سلگانے والی کرتا تھا۔ میں اس کو نظرانداز کرتے ہوئے سلیقہ بانو کو دیکھنے لگا۔ وہ خاصی پُرسکون تھی۔

وکیل صفائی نے سلیقہ سے پوچھا۔''آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے محترمہ سلیقہ بانو؟''

''تقریباً دس سال۔''

''اور آپ کے بھائی کی شادی کتنا عرصہ رہی۔'' وہ مضحکہ خیز انداز میں مستفسر ہوا۔''میرا مطلب ہے' وفات سے پہلے اس کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

سلیقہ نے جواب دیا۔''لگ بھگ پانچ سال۔''

وکیل صفائی نے پوچھا۔''سلیقہ بانو! آپ نے بیان دیا ہے کہ آپ کو اپنے مقتول بھائی سے بہت محبت تھی یہاں تک کہ وہ آپ کو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بتادیا کرتا تھا؟''

''جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

''اور آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے بھائی کی پریشانیوں کا سبب میری موکلہ تھی جس نے آپ کے بقول' مقتول کی زندگی اجیرن کررکھی تھی؟'' وکیل صفائی نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''بالکل یہی دعویٰ ہے۔'' سلیقہ نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔

وکیل صفائی نے پوچھا۔ ''آخر میری موکلہ ایسی کون سی حرکتیں کرتی تھی جن سے آپ کے بھائی صاحب کی زندگی جہنم کا نمونہ بن گئی تھی؟''

سلیقہ نے نورین کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول شیخ احمد اپنی بیوی کی حرکتوں سے بیزار تھا۔ وکیل صفائی خاموشی سے اس کا بیان سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو اس نے سوال کیا۔

''اور یہ ساری باتیں آپ کو آپ کے بھائی نے بتائی تھیں کیونکہ وہ آپ کے راز دار تھے اور کوئی بات آپ سے چھپاتے نہیں تھے؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' سلیقہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے یہ سب کچھ بھائی صاحب کی زبانی معلوم ہوا تھا۔''

''انہوں نے آپ کو کبھی اپنے بارے میں بھی کچھ بتایا؟''

''میں ان کے بارے میں ہر بات جانتی ہوں۔''

''کیا آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ وہ نامحرم عورتوں سے ملتے رہتے تھے؟'' وکیل صفائی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''میری موکلہ کا بیان ہے کہ کئی عورتوں سے مقتول کے تعلقات تھے۔ آپ تعلقات کا مطلب تو سمجھ رہی ہیں نا؟''

''یہ جھوٹ ہے...... سفید جھوٹ۔'' وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔

''آپ کے پاس میری موکلہ کے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل یا ٹھوس ثبوت موجود ہے؟'' وکیل صفائی نے پوچھا۔

سلیقہ بانو نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اپنے بھائی کے کردار کی مضبوطی ثابت کرنا میں ضروری نہیں سمجھتی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا کردار پاکیزہ تھا۔ ملزمہ نامحرم عورتوں کے حوالے سے ان پر الزام لگائی ہیں۔''

''بالکل اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مقتول بھی اپنی بیوی پر جھوٹے الزام لگاتا تھا۔'' وکیل صفائی نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میری موکلہ بھی کردار کی مضبوط اور اپنے شوہر کی وفاداری رہی ہے۔''

''مجھے ملزمہ کے کردار سے اب کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' سلیقہ نے بیزاری سے کہا۔ ''جب بھائی ہی نہیں رہے تو اس عورت کے کردار کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ اب ہمارا اس سے کوئی رشتہ ناتا نہیں رہا۔''

وکیل صفائی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ بھی کمال کرتی ہیں محترمہ! ایک طرف تو آپ میری موکلہ سے لاتعلقی ظاہر کر رہی ہیں اور دوسری جانب اسے موت کے منہ میں دھکیلنے کی خواہاں ہیں۔ آپ کا دوغلہ رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''اس میں آپ کی سمجھ کا قصور ہے وکیل صاحب!''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' وہ کھسیانے انداز میں بولا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں۔'' سلیقہ بانو نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''کہ بھائی کی موت کے بعد نورین کے کیا کردار داعمال ہیں اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں اسے ہر حال میں پھانسی کے پھندے سے لٹکتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں گی تو آپ کو اعتراض ہوگا کہ وہ میرے بھائی کی موت کی ذمے دار ہے اس لیے میں نہیں کہوں گی کہ آپ کی موکلہ میرے بھائی کی قاتل ہے۔''

سلیقہ بانو نے بڑے طریقے سلیقے سے وکیل صفائی پر چوٹ کی تھی۔ وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سلیقہ بانو! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ کا بھائی لاہور نہیں گیا تھا بلکہ کراچی ہی میں تھا؟''

''جی ہاں' میں نے ایسا کہا ہے۔''

''میری موکلہ کا کہنا ہے کہ مقتول نے ایک روز کے لیے لاہور جانے کی بات کی تھی۔'' وکیل صفائی نے کہا۔ ''آپ اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کیا کہیں گی؟''

سلیقہ بانو نے جواب دیا۔ ''مجھے اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے' پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے۔ وقوعہ کی رات اپنے گھر میں میرے بھائی کا قتل ہوا۔ میرے مقتول بھائی کا بنگلا بہادر آباد میں واقع ہے جو کراچی کا ایک پوش علاقہ ہے۔ اگر احمد بھائی اس رات کراچی میں نہیں تھے تو پھر وہ اپنے بنگلے میں کس طرح قتل ہوئے؟''

سلیقہ بانو بڑے اعتماد اور خوبصورتی سے وکیل صفائی کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ مجھے اس کے انداز نے خاصا متاثر کیا۔ عام طور پر گواہ خاصے نروس اور گھبرائے ہوئے رہتے ہیں۔ سلیقہ بانو بڑی منفرد گواہ ثابت ہو رہی تھی۔

وکیل صفائی نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''پھر آپ کا کیا مطلب تھا وکیل صاحب؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول نے لاہور جانے کے حوالے سے میری موکلہ سے غلط بیانی کیوں کی حالانکہ وہ کراچی ہی میں تھا اور آدھی رات کو نقاب پوش کے بھیس میں خود اپنے ہی گھر میں نقب لگانے آن پہنچا تھا۔'' وکیل صفائی خاصا سٹ پٹا گیا تھا اسی لیے اس کی باتوں میں کوئی ربط نہیں رہا تھا۔ شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

سلیقہ بانو نے کہا۔ ''میرا خیال ہے' بھائی نے آپ کی موکلہ سے لاہور جانے والی بات نہیں کی ہوگی۔ اگر ایسا کوئی پروگرام وہ بناتے تو مجھے ضرور آگاہ کرتے۔''

''آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ میری موکلہ دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے؟'' وکیل صفائی نے تپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اگر آپ کی یادداشت آپ کا ساتھ دے رہی ہے تو میں تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کو اس سوال کا جواب دے چکی ہوں۔'' سلیقہ نے جارحانہ لہجے میں کہا۔'' اور اگر بدقسمتی سے معاملہ اس کے برعکس ہے تو میں یہی کہوں گی کہ آپ کی موکلہ جھوٹی درجہ اول ہے۔''

''مگر اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''پیدائشی جھوٹا ضرورت سے زیادہ عادتاً جھوٹ بولتا ہے۔'' سلیقہ بانو نے زہریلے لہجے میں کہا۔'' جب کہ یہاں تو دونوں ہی صورتیں موجود ہیں۔ آپ کو نظر نہیں آ رہیں تو میں سوائے افسوس کے اور کیا کر سکتی ہوں۔ اب میں آپ سے جگہ بدلنے کی فرمائش کرنے سے تو رہی۔''

''جگہ بدلنے کی فرمائش؟'' آفتاب لودھی ہونقوں کی طرح منہ کھول کر سلیقہ بانو کا منہ تکنے لگا۔ ''یہ کیا بات کی آپ نے!''

وہ بولی۔'' یعنی میں وکیل صفائی بن جاؤں اور آپ کو وٹنس باکس میں کھڑا کر دیا جائے۔ بات آئی سمجھ میں وکیل صاحب!''

''وہاٹ نان سینس ٹاکنگ یو آر؟'' وکیل صفائی پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

عدالت سے باہر نکل کر میں نے سرفراز سے پوچھا۔'' نورین جس شخص کے ساتھ عدالت آئی تھی کیا آپ اسے جانتے ہیں؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور سوالیہ نظر سے سلیقہ بانو کو دیکھنے لگا۔

میں نے سلیقہ کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔'' کہیں وہ ثمرین کا شوہر افضل خان تو نہیں تھا!''

''نہیں بیگ صاحب۔'' سلیقہ نے جلدی سے کہا۔'' افضل خان سے میں کئی مرتبہ مل چکی ہوں۔ اس کو پہچاننے میں کس طرح غلطی کر سکتی ہوں۔ وہ افضل نہیں ہے۔''

''پھر کون ہو سکتا ہے؟'' سرفراز نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔'' وہ جو کوئی بھی ہے، ایک بات تو ظاہر ہے کہ وہ نورین کا کوئی قریبی ہے ورنہ وہ اس کے ساتھ نظر نہ آتا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' سلیقہ نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے سرفراز کو مخاطب کیا۔'' سرفراز صاحب!'' میں آپ کے ذمے ایک کام لگانا چاہتا ہوں۔ آپ کی اہلیہ نے تو بہت اچھی پرفارمنس دی ہے۔ اب آپ کی باری ہے۔ تیار ہو جائیں۔''

''آپ حکم کریں بیگ صاحب!'' وہ ولولہ انگیز لہجے میں بولا۔'' میں بالکل تیار ہوں۔ ایور ریڈی۔''

میں نے کہا۔'' مجھے اس شخص کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں اور آئندہ پیشی سے پہلے پہلے۔ ہم نورین کے حوالے سے کسی بھی بات یا شخص کو نظرانداز نہیں کر سکتے، یہ تو خاصا اہم کردار نظر آ رہا ہے۔''

''ہمیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔'' سرفراز نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' آپ بےفکر ہو جائیں۔ یہ کام بہت جلد ہو جائے گا۔ اگلی پیشی میں تو ابھی پندرہ دن باقی ہیں۔''

اور میں واقعی بےفکر ہو گیا۔

❀ ❀ ❀

دونوں کٹہرے آباد تھے!

ملزموں کے لیے مخصوص کٹہرے میں نورین موجود تھی جب کہ گواہوں والے کٹہرے میں '' شیخ جیولرز'' کا دیرینہ ملازم عبدالشکور کھڑا تھا۔ آخرالذکر شخص کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان تھی۔ وہ ایک شریف صورت اور باریش انسان تھا۔ اپنی وضع قطع اور حرکات وسکنات سے وہ پابندِ صوم وصلوٰۃ دکھائی دیتا تھا۔

عبدالشکور نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے بعد خاموش کھڑا ہو گیا۔

میں نے رسمی سی کارروائی پوری کرنے کے لیے دو چار سوالات کیے پھر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے سوالات سے فاضل عدالت کو یہ باور کروا دیا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول اپنی دکان سے سیدھا گھر آیا تھا اور لاہور جانے کا اس کا ارادہ چند روز بعد کا تھا۔ اسے عبدالشکور کے ساتھ ایک ہفتے بعد لاہور جانا تھا۔

وکیل صفائی نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔'' عبدالشکور صاحب! آپ کو شیخ جیولرز پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

عبدالشکور نے جواب دیا۔'' بارہ سال۔''

''شکور صاحب!'' وکیل صفائی نے پوچھا۔'' آپ نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول دکان سے سیدھا گھر گیا تھا۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ اس روز دکان کتنے بجے بند کی گئی تھی؟''

''ہم روزانہ ساڑھے آٹھ بجے دکان بند کرتے ہیں۔'' عبدالشکور نے کہا۔'' وقوعہ کے روز بھی اسی وقت بند کی تھی۔''

''شکور صاحب! آپ کا دعویٰ ہے کہ مقتول نے آپ سے اپنے لاہور جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا بلکہ آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وہ لاہور گیا ہی نہیں تھا۔''

عبدالشکور نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔'' جناب! میں دعوے کرنے کا عادی نہیں ہوں اور نہ ہی اس فعل کو اچھا سمجھتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ وقوعہ کے روز مقتول نے مجھ سے لاہور جانے کے

بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ ویسے بھی ایک ہفتے بعد ہم دونوں لاہور جانے والے تھے۔ اگر پروگرام میں اچانک کوئی تبدیلی ہوگئی تھی تو وہ مجھے اس بارے میں ضرور بتاتے۔"

وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ "شکور صاحب! "شیخ جیولرز" پر آپ ملازم تھے یا اس دکان کے مالک تھے؟"

شکور نے الجھن زدہ نظر سے وکیل صفائی کو دیکھا اور بولا۔ "میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا جناب۔ ظاہر ہے، میں شیخ احمد صاحب کا ملازم ہی تھا۔"

"آپ تو یوں ظاہر کر رہے ہیں جیسے آپ مالک اور مقتول ملازم ہو۔" وکیل صفائی نے چوٹ کی۔ "وہ آپ کو بتائے بغیر سانس بھی نہیں لیتا تھا۔ اپنے ہر پروگرام سے آپ کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "استغاثہ کی معزز گواہ سلیقہ بانو نے بھی آپ کی بہت تعریف کی ہے!" آخری جملہ اس نے بڑے کٹیلے انداز میں ادا کیا تھا۔

عبدالشکور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جناب! تعریف تو اس خدا کی ہے جس کا میں بندہ ہوں۔ ویسے آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ مقتول واقعی مجھ سے بہت قریب تھا۔ وہ مجھ پر مکمل بھروسا کرتا تھا اور اپنے بہت سے کاروباری راز بھی مجھے بتا دیتا تھا۔ میرا ریکارڈ ہمیشہ شفاف رہا ہے۔ اگر مقتول مجھ پر اعتماد کرتا تھا تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

"بالکل کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وکیل صفائی نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ مقتول کے خانگی حالات کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"میں نے کبھی ان کے نجی معاملات کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔"

"اس نے ازخود تو بتایا ہوگا!"

"کبھی نہیں۔"

"آپ کے بیان میں اتنا تضاد کیوں ہے شکور صاحب؟"

"کیسا تضاد!" عبدالشکور نے سوالیہ نظر سے وکیل صفائی کو دیکھا۔

وہ بولا۔ "ایک جانب تو آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ مقتول آپ پر مکمل بھروسا کرتا تھا اور ہر بات آپ کو بتا دیتا تھا کیونکہ آپ اس کے بہت قریب تھے اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو اس کے خانگی حالات کی کوئی خبر نہیں اور نہ ہی مقتول نے کبھی آپ کو اس بارے میں کچھ بتایا۔ یہ تضاد نہیں تو پھر اور کیا ہے؟"

"یہ تضاد نہیں بلکہ سمجھ کا پھیر ہے وکیل صاحب!" عبدالشکور کے لہجے میں چٹان کی سی سختی تھی۔ "شاید آپ نے میری بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔"

"آپ ہی سمجھانے کی کوشش کریں۔" وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

عبدالشکور نے کہا۔ "وکیل صاحب! میرے اور مقتول کے درمیان قربت اور نزدیکی صرف کاروباری نوعیت کی تھی۔ میں نے ان کے گھریلو معاملات کے بارے میں کبھی کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی وہ خود اس سلسلے میں گفتگو کرتے تھے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے!"

وکیل صفائی نے جھنجلا کر جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد استغاثہ کے مزید دو گواہ بھگتے اور عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ ان گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح سرسری نوعیت کی تھی اس لیے میں اس کارروائی کی روداد سے بچتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

آئندہ پیشی پر استغاثہ کا ایک اہم گواہ غلام حیدر گواہی دینے آیا۔ غلام حیدر کا گھر مقتول کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پینسٹھ سال تھی مگر صحت ابھی اتنی ڈاؤن نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اس عمر میں عام طور پر ہو جاتی ہے۔

غلام حیدر کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو میں کراس ان چیف کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے کٹہرے کے نزدیک پہنچ کر میں نے سوال کیا۔

"غلام حیدر صاحب! آپ نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے مقتول کو حسبِ معمول گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں، میں نے ایسا ہی کہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "حسبِ معمول سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"وہ وقت جب مقتول عموماً رات کو واپس لوٹتا تھا۔"

"مثلاً کتنے بجے؟"

"لگ بھگ نو بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ کی معلومات سے لگتا ہے کہ آپ مقتول کے معمولات سے بخوبی واقف تھے۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ دونوں کے درمیان دوستانہ مراسم تھے؟"

"ہم کبھی ایک دوسرے کے دوست نہیں رہے۔"

"حالاں کہ آپ دونوں کی رہائش آمنے سامنے ہے!"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وکیل صاحب!" غلام حیدر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں کسی اور ٹائپ کا انسان ہوں۔ میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتا۔ مقتول کی مثال ایک آنکھ پھوڑ ٹڈے کی سی تھی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ مراسم بڑھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"آنکھ پھوڑ ٹڈا!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے دہرایا پھر کہا۔ "غلام حیدر صاحب! آپ نے ایک بہت پرانا محاورہ استعمال کیا ہے۔ آج کل کی نسل تو اس سے ناواقف ہی ہوگی۔ غالباً اس کا

مطلب ہے' بے مروت اور خود غرض قسم کا انسان جو مطلب نکل جانے کے بعد آنکھیں پھیر لیتا ہو!''

''کچھ اسی قسم کا مفہوم بنتا ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔''ممکن ہے' مقتول کی لیے دیے رہنے کی عادت سے آپ نے اس بارے میں یہ رائے قائم کی ہو!''

''ہو سکتا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔''مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔''غلام حیدر صاحب! آپ نے بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ نے مقتول کے بنگلے سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی دیکھی تھی جس کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ وہ گاڑی پہلے کبھی وہاں نظر نہیں آئی۔''

''جی ہاں' وہ ایک سفید شیرڈ تھی۔'' اس نے جواب دیا۔''اور بڑے مشکوک انداز میں ایک بند بنگلے کے سامنے کھڑی تھی۔''

''آپ مذکورہ شیرڈ کا نمبر بتا سکتے ہیں؟''

غلام حیدر نے دہرایا۔''زیرو' ون' سیون' نائن۔''

''کیا وہ گاڑی پوری رات وہاں کھڑی رہی تھی؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔''نہیں جناب! سامنے والے بنگلے میں ہونے والی فائرنگ کے بعد جب میں اپنے گھر سے نکلا تو وہ گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔''

''آپ نے پہلی مرتبہ مذکورہ گاڑی کو کب دیکھا تھا؟''

''لگ بھگ آٹھ بجے۔'' غلام حیدر نے جواب دیا۔

''اور رات کو ایک ڈیڑھ بجے وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی!''

''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ پورے وثوق سے بولا۔

میں نے جرح ختم کر دی۔ وکیل صفائی اچھل کر گواہ کے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔ سلسلہ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے اس نے غلام حیدر سے پوچھا۔

''غلام حیدر صاحب! آپ اب تک کہاں تھے؟''

گواہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔''میں گزشتہ ساٹھ پینسٹھ سالوں میں مختلف جگہوں پر رہا ہوں۔ آپ میری زندگی کے کس دور کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وکیل صاحب؟''

گواہ کے جوابی سوال سے وکیل صفائی ہڑبڑا گیا' جلدی سے بولا۔''میرا مطلب تھا' پہلے آپ گواہی دینے کے لیے کیوں نہیں آئے؟''

''پہلے کب؟'' گواہ نے ترش لہجے میں دریافت کیا۔

گواہ ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھا اسی لیے وہ وکیل صفائی کو آڑے ہاتھوں لے رہا تھا۔ وکیل صفائی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کون سی جھاڑی میں سینگ پھنسا لیے تھے۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پہلے جب اس مقدمے کی سماعت ہوئی تھی تو آپ کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود نہیں تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں۔'' گواہ غلام حیدر نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔''پہلے مجھے اپروچ نہیں کیا گیا تھا اس لیے میں نے از خود اپنے آپ کو اس کیس میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دخل در معقولات کو ایک معاشرتی گناہ سمجھتا ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔''اس مرتبہ استغاثہ نے میری شمولیت کو ضروری سمجھا' سو میں آپ کو یہاں نظر آ رہا ہوں۔ دیٹس آل مائی ڈیئر کونسلر!''

''او کے...... او کے۔'' وکیل صفائی نے ہاتھ کا مخصوص اشارہ کرتے ہوئے جان چھڑانے والے انداز میں کہا پھر اگلا سوال کیا۔''غلام حیدر صاحب! آپ نے پہلے اپنے بیان میں اور بعد میں وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ نے وقوعہ کے روز لگ بھگ نو بجے رات مقتول کو واپس گھر آتے ہوئے دیکھا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔''آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ آپ اس وقت کیا کر رہے تھے؟''

غلام حیدر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

''میں اس وقت اپنے گھر کے لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے ٹہلنا میرے معمول میں شامل ہے۔ اس وقت میرے گھر کا بیرونی گیٹ اتفاقاً کھلا ہوا تھا۔ غالباً میرا چھوٹا بیٹا گاڑی باہر نکال رہا تھا۔ میں نے اپنے کھلے ہوئے گیٹ سے مقتول کو اس کے بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''کیا مقتول پیدل ہی اپنے گھر میں داخل ہوا تھا؟'' وکیل صفائی نے سوال کیا۔

گواہ جھٹ سے بولا۔''میں نے ایسا تو کوئی بیان نہیں دیا۔''

''پھر آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

غلام حیدر نے کہا۔''مقتول اس وقت اپنی گاڑی میں سوار تھا...... کریم کلر ٹویوٹا کرولا میں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنی بات مکمل کر دی۔''مقتول کی گاڑی کا نمبر 'ون' تھری' ایٹ' سکس' ہے۔''

''ماشاءاللہ...... سبحان اللہ!'' وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں سراہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''گاڑیوں کے نمبر یاد رکھنے میں آپ کو ملکہ حاصل ہے۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا!'' غلام حیدر نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔''وکیل صاحب! آپ نے یہ دعا مجھے پہلے کیوں نہیں دی؟''

وکیل صفائی گواہ کی بات پر بوکھلا گیا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔''آپ کون سی دعا کی بات کر رہے ہیں غلام حیدر صاحب؟''

غلام حیدر نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔''ڈیئر ڈیفنس کونسلر! جوانی کے زمانے میں

مجھے ایک لڑکی سے شدید محبت ہوگئی تھی۔ میں نے اسے حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر شاید وہ میرے مقدر میں تھی ہی نہیں۔ اس کی شادی کہیں اور ہوگئی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ اب دل مسوسنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں ملکہ کو حاصل نہیں کرسکا۔ جی ہاں' اس لڑکی کا نام ملکہ تھا!''

وکیل صفائی کھسیاہٹ میں مبتلا ہوگیا۔ گواہ نے نہایت ہی خوبصورتی سے اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ صد فیصد کامیاب بھی رہا تھا۔ اپنی جھینپ کو مٹانے کے لیے وکیل صفائی نے فوراً وضاحت کرنا چاہی۔

''غلام حیدر صاحب! میرا اشارہ اس گاڑی کے نمبر کی جانب تھا جسے آپ نے وقوعہ کی رات مقتول کے بنگلے کے نزدیک بڑے مشکوک انداز میں کھڑے دیکھا تھا۔ آپ نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں مذکورہ بالا سفید شیرڈ کا نمبر فرفر بتا دیا تھا اس لیے آپ کی یادداشت کے حوالے سے میں نے ''ملکہ'' والی بات کی تھی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے تصدیق طلب لہجے میں کہا۔ ''آپ نے سفید شیرڈ کا نمبر ''زیرو' ون' سیون' نائن'' ہی بتایا تھا نا؟''

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل صفائی نے سوال کیا۔ ''غلام حیدر صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ نے پہلی مرتبہ سفید شیرڈ کو کم وبیش آٹھ بجے مقتول کے بنگلے کے نزدیک مشکوک انداز میں کھڑے دیکھا تھا......''

''پہلی اور آخری مرتبہ۔'' گواہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ گاڑی مقتول کے بنگلے کے نزدیک نہیں بلکہ تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔''

''ٹھیک ہے' وہ تھوڑے فاصلے پر ہی کھڑی تھی۔'' وکیل صفائی نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ کو گاڑی کے کھڑے ہونے کا انداز مشکوک کیوں لگا؟''

''میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ مذکورہ شیرڈ ایک بند بنگلے کے سامنے کھڑی تھی۔'' غلام حیدر نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''میری معلومات کے مطابق وہ بنگلا گزشتہ ایک ماہ سے بند پڑا تھا۔ ایسی صورت میں کسی اجنبی گاڑی کا وہاں پایا جانا مشکوک ہی کہلائے گا۔ کہلائے گا یا نہیں؟''

وکیل صفائی نے گواہ کے استفسار کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور سوال کیا۔ ''وقوعہ کی رات آٹھ بجے جب آپ نے مذکورہ سفید شیرڈ دیکھی' آپ اس وقت کہاں تھے اور کیا کررہے تھے؟''

''میں اس وقت ایک نزدیکی پارک سے گھر کی جانب آرہا تھا...... اپنے گھر کی جانب۔'' گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''مذکورہ بند بنگلا میرے راستے میں پڑتا ہے اس لیے وہ گاڑی مجھے نظر آگئی۔ میں نے چونک کر پہلے گاڑی کو اور پھر بنگلے کے بیرونی دروازے کو دیکھا تھا' جہاں بدستور ایک کنگ سائز تالا لٹک رہا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس گاڑی میں آنے والا یا آنے والے مذکورہ بنگلے میں داخل نہیں ہوا تھا یا ہوئے تھے بلکہ کہیں اور گیا تھا یا گئے تھے۔''

وکیل صفائی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ نے اپنے بیان میں اور ازاں بعد وکیل

استغاثہ کی جرح کے جواب میں اس سفید شیرڈ کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میں نے تو آپ کی جرح کے جواب میں بھی مذکورہ گاڑی کا ذکر بڑی دلچسپی اور توجہ سے کیا ہے بلکہ آپ نے اس بارے میں اہتماماً سوالات کیے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''آپ سوال نہ کریں' میری بات کا جواب دیں۔'' وکیل صفائی نے چڑ کر کہا۔ گواہ کے مضبوط اعصاب نے وکیل صفائی کو دقت میں ڈال دیا تھا۔

غلام حیدر نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ''دیٹس او کے!'' پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں اس مقدمے میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے شامل ہوں۔ میں نے جو کچھ وقوعہ کی رات مشاہدہ کیا وہ اپنے بیان کی صورت میں ریکارڈ کروا دیا۔ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی کے سوالات کے جوابات دینا بھی مجھ پر لازم ہے۔ اس لیے آپ حضرات نے مجھ سے جو کچھ پوچھا وہ میں نے بتا دیا۔ پتہ نہیں' آپ کس وجہ کو دریافت کرنے کی سعی میں سردھڑ کی بازی لگا رہے ہیں!''

وکیل صفائی گواہ کے اس حملے پر بغلیں جھانکنے لگا۔

جج کئی مرتبہ دیوار گیر کلاک کو دیکھ چکا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ جج نے وکیل صفائی سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ استغاثہ کے گواہ سے اور کوئی سوال کرنا چاہیں گے؟''

''نو سر!'' وہ مشینی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری جرح مکمل ہوچکی ہے۔''

''کورٹ از ایڈجارنڈ۔'' جج نے بھاری بھرکم آواز میں عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

آئندہ پیشی ایک ماہ بعد تھی۔

میں نے استغاثہ کے گواہوں پر اب تک کی جرح کے دوران میں نہایت ہی اہم پوائنٹ معزز عدالت کے ریکارڈ پر لانے کی کوشش کی تھی۔ آفتاب لودھی اس بات سے خاصا نروس ہورہا تھا کہ اس قسم کی باتیں پہلے تو زیر بحث نہیں آئی تھیں۔ اس کی الجھن اپنی جگہ جائز تھی۔ مجھے قوی امید تھی کہ وکیل صفائی اس حقیقت سے قطعی ناواقف تھا کہ آگے چل کر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میرے لیے کتنی مفید اور معاون ثابت ہونے والی تھیں۔

آئندہ تاریخ سے ایک روز قبل رات کے وقت میرے رہائشی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون' اٹینڈ کیا تو دوسری جانب سردار احمد تھا۔

''السلام علیکم بیگ صاحب!'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

میں نے ''وعلیکم السلام۔'' کہنے کے بعد پوچھا۔ ''خیریت سردار صاحب!''

''بالکل خیریت ہے۔ بس آپ سے ایک ضروری بات پوچھنا تھی۔''

''کیسی ضروری بات؟'' میں چونک اٹھا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا' شروع کہاں سے کروں۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''کہیں سے بھی شروع ہو جائیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

سردار احمد نے کہا۔ ''آپ کو شاید میری بات کا یقین نہ آئے مگر میں سچ کہہ رہا ہوں کہ آج ایک شخص نے پیش کار کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے مجھ سے ملاقات کی ہے۔ دوران ملاقات اس نے کچھ خطرناک باتیں کی ہیں۔''

''کیسی خطرناک باتیں؟'' میں نے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! اس شخص کا کہنا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو پیش کار اس مقدمے کو ہماری مرضی کا رخ دے سکتا ہے۔''

''اور اس کے لیے ہمیں پیش کار کی مٹھی گرم کرنا ہوگی!'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ پیش کار کے جج سے خصوصی تعلقات ہیں۔ وہ پیش کار کی بات ٹال نہیں سکتا۔ کیوں' یہی کہانی سنائی ہے نا اس شخص نے؟''

''بالکل ایسی ہی باتیں کی ہیں اس نے۔'' سردار احمد حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''کیا ہماری عدالتوں میں واقعی ایسا ہوتا ہے؟''

''عام طور پر تو ایسا نہیں ہوتا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایسی مثالیں ناپید بھی نہیں ہیں۔ دراصل' یہ منفی سوچ رکھنے والے بعض پیش کاروں کی ایک چال ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کے ہر محکمے میں کالی بھیڑوں کے وجود سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری عدالتی دنیا کی یہ کالی بھیڑیں یعنی چند پیش کار اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں لیکن ایسے معاملات میں جج صاحبان ملوث نہیں ہوتے۔''

''پھر پیش کار ایسے دعوے کیوں کرتے ہیں کہ وہ جج کی رائے کو حسب منشا تبدیل کروا سکتے ہیں؟'' سردار احمد نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''اگر وہ دعوے نہ کریں تو ان کے جھانسے میں کون آئے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل' یہ پیش کار کا ایک اسٹنٹ ہوتا ہے۔ وہ دونوں پارٹیوں سے علیحدہ علیحدہ اسی قسم کی باتیں کرتا ہے اور دونوں کو یقین دلاتا ہے کہ وہ جج کو ان کی مرضی کے مطابق ہموار کر لے گا لیکن درحقیقت ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ پیش کار اپنے نمائندہ خصوصی کے ذریعے دونوں پارٹیوں سے رقم بٹور کر خاموش ہو بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے' کسی ایک پارٹی کے حق میں تو فیصلہ ہونا ہی ہوتا ہے۔ جیتنے والی پارٹی یہی سمجھتی ہے کہ اس میں پیش کار کی کسی ''کرامت'' کو دخل ہے۔ ہارنے والی پارٹی کی رقم واپس کرتے ہوئے وہ کہتا ہے...... 'دیکھیں جناب' میں نے تو بہت کوشش کی مگر خدا کو منظور ہی نہیں تھا۔ یہ لیں' اپنی رقم گن لیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔''

''اوہ میرے خدایا!'' سردار احمد نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کھلی اندھیر نگری ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ سے کتنی رقم کا مطالبہ کیا گیا ہے؟''

''ایک لاکھ روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ اس بات کو ذہن سے نکال دیں سردار صاحب!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیس پر ہماری گرفت خاصی جاندار ہے۔ اس قسم کی کسی فاؤل ڈیلنگ کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

''آپ نے میری پریشانی دور کر دی ہے بیگ صاحب!'' وہ خاصا ممنون تھا۔

میں نے کہا۔ ''کل کی پیشی پر میں ملزمہ نورین کی 'خبر' لوں گا۔ آپ دیکھ لیجئے گا' میں کس طرح مقدمے کا پانسا پلٹتا ہوں۔''

''میں آپ کی کارکردگی سے مطمئن ہوں۔''

''یہ میرے لیے بھی اطمینان کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! میں تو صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔ عملی کوششیں تو آپ ہی کو کرنا ہیں۔''

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''سردار صاحب! بعض اوقات ایک دعا سینکڑوں کوششوں پر بھاری ثابت ہوتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔''

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

❋ ❋ ❋

اس روز عدالت کا کمرہ پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

اکیوزڈ باکس میں ملزمہ نورین اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے بالوں کو ایک خوبصورت بلند جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ پاؤں میں اونچی ایڑی کی سینڈل تھی۔ شاید اس گیٹ اپ سے وہ اپنی قامت میں نمایاں اضافہ کرنا چاہتی تھی حالانکہ وہ حسن کی جس دولت سے مالا مال تھی اس کے سامنے یہ ''تیاری'' کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

جس طرح سکہ رائج الوقت انسان کے کردار کی بہت سی خامیوں کی پردہ پوشی کر دیتا ہے بالکل اسی طرح حسن و رعنائی کی دولت انسانی شخصیت کے عیوب کو ڈھانپ لیتی ہے۔ دولت کوئی بھی ہو' بہر حال یہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

آج نورین اپنی بڑی بہن ثمرین کے ساتھ عدالت پہنچی تھی۔ ابتدائی ایک دو پیشیوں پر جو خوب روصحت مند شخص نورین کے ساتھ نظر آیا تھا آج وہ غیر حاضر تھا۔ میری ''فرمائش'' پر سردار احمد کے فرزند ارجمند سرفراز احمد نے مذکورہ شخص کے بارے میں مجھے مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں جس کے بعد میرے ذہن میں موجود بہت سے سوالوں کا جواب مجھے مل گیا تھا۔

جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا۔ پھر میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد ملزمہ پر جرح کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں سوالات کی ابتدا کی۔

آگے بڑھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت کردوں۔ ملزمہ نے عدالت کو بہت لمبا چوڑا بیان دیا تھا جس میں سے بہت سی اہم باتیں میں ابتدائی صفحات میں تحریر کر چکا ہوں لہٰذا اب دوبارہ ان کا ذکر مناسب نہیں ہوگا تاہم دیگر اہم نکات ملزمہ پر جرح کے دوران میں خود بخود آپ کے سامنے آ جائیں گے۔

''نورین صاحبہ!'' میں نے ایڑی تا چوٹی اور چوٹی تا ایڑی ملزمہ کا جائزہ لینے کے بعد اسے مخاطب کیا۔ ''آپ کے بیان کے مطابق وقوعہ کی رات آپ کا مقتول شوہر گھر پر موجود نہیں تھا کیونکہ وہ آپ کو لاہور جانے کے بارے میں بتا چکا تھا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔ ''مگر استغاثہ کی گواہ سلیقہ بانو کے مطابق مقتول لاہور نہیں گیا تھا بلکہ کراچی ہی میں موجود تھا۔ اس بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟''

''سلیقہ بانو کے خیالات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''البتہ اس بارے میں، میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ چکی...... اور یہی سچ ہے کہ میرا شوہر وقوعہ کی رات گھر پر نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک سلیقہ بانو پر ہی موقوف نہیں، آپ کے شوہر کی دکان کا دیرینہ ملازم عبدالشکور بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے؟''

''آپ کا بندہ جھوٹ بولتا ہے۔''

''نورین صاحبہ! عبدالشکور میرا نہیں بلکہ اللہ کا بندہ ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ مقتول کا ملازم اور اس مقدمے میں استغاثہ کا گواہ ہے۔''

''آپ اسے جو بھی نام دیں، بہرحال اس نے حلف اٹھانے کے بعد دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''حالانکہ بڑا دیندار بنتا ہے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نے داڑھی بھی بڑھا رکھی ہے اور نمازیں بھی پڑھتا رہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''محترمہ! یہ سب گواہ کے ذاتی معاملات ہیں۔''

''مجھے اس کے ذاتی یا غیر ذاتی معاملات سے کوئی مطلب نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔ ''میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے میرے خلاف گواہی دیتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔''

''اور غلام حیدر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کے محلے دار اور استغاثہ کے گواہ غلام حیدر نے تو اپنی آنکھوں سے وقوعہ کی رات تقریباً نو بجے مقتول کو اپنی گاڑی ٹویوٹا کریم کلر میں گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا آپ اس حقیقت کو بھی جھٹلائیں گی؟''

''یہ حقیقت نہیں بلکہ فکشن ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔ ''آپ کا گواہ سٹھیا گیا ہے۔ اس عمر میں خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے بھی بہت سی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں جن کا دراصل کوئی وجود نہیں ہوتا۔ غلام حیدر نے اگر اس روز میرے شوہر کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا تو یہ اس کا فریب نظر ہوگا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے شوہر نے آپ کو کب بتایا کہ وہ اچانک لاہور جانے کا پروگرام بنا بیٹھا ہے؟''

''وقوعہ کے روز دوپہر میں فون پر اس نے بتایا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، مقتول اس روز گھر آیا ہی نہیں تھا؟''

''جی ہاں، اس کا یہی مطلب نکلتا ہے۔''

''لیکن وقوعہ کی رات جب پولیس آپ کے بنگلے پر پہنچی تو ''ون، تھری، ایٹ، سکس'' ٹویوٹا کرولا بنگلے کے اندر موجود تھی۔'' میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''اگر مقتول اس روز گھر نہیں آیا تھا تو اس کی گاڑی بنگلے پر کیسے پہنچ گئی؟''

ایک لمحے کو نورین کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی تاہم جلد ہی اس نے چہرے کے تاثرات پر قابو پالیا۔ سنبھلتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''وہ...... دراصل، اس روز میں اسے دکان پر چھوڑنے گئی تھی اور واپسی میں گاڑی ساتھ لے آئی تھی۔ مجھے ایک دو ایسے ضروری کام تھے جن کے لیے گاڑی اشد ضروری تھی۔ میں نے سوچا، شام کو ...... یعنی رات کو میں خود جا کر اسے لے آؤں گی مگر رات سے پہلے ہی اس نے مجھے فون کرکے بتا دیا کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ گاڑی ہمارے بنگلے پر موجود تھی۔''

اس نے بڑی خوبصورتی سے وضاحت پیش کردی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصی ذہین عورت تھی اور یہ بھی کہ وہ بھرپور تیاری سے عدالت میں آئی تھی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''نورین صاحبہ! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ آپ کے مقتول شوہر نے اپنے لاہور جانے کی اطلاع کے ساتھ آپ کو تاکید کی تھی کہ آپ یا تو وہ رات اپنی بہن ثمرین کے گھر گزارنے چلی جائیں یا اسے اپنے یہاں بلالیں پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

''اگر آپ میرے بیان کا حوالہ دے رہے ہیں تو پھر آپ کو یہ بات بھی یاد ہوگی کہ میں نے اس سلسلے میں وضاحت کردی تھی۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''اگر آپ کی یادداشت گڑبڑ ہو رہی ہے تو میں ایک مرتبہ پھر بتاتی چلوں کہ پہلے میرا پروگرام ثمرین کو اپنے یہاں بلانے کا تھا۔ اس سے اس سلسلے میں بات بھی ہوگئی تھی لیکن عین وقت پر اس نے مجھے فون پر بتایا کہ ایک ایمرجنسی کے سبب وہ میرے پاس نہیں آسکے گی۔ کیا اب مجھے اس ایمرجنسی کی وضاحت بھی کرنا ہوگی وکیل صاحب!''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''عدالت کے ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ وقوعہ کی رات آپ کی بہن ثمرین کی نند فریدہ کے یہاں زچگی کا معاملہ درپیش تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے جرح جاری رکھی۔ ''نورین صاحبہ! جب ثمرین کا آپ کے گھر آنا ممکن نہیں رہا تھا تو آپ کے ذہن میں اس کے پاس جانے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ تن تنہا اکیلے گھر میں

رات گزارنے کے تصور سے آپ کو ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا؟"

وہ جواب دینے سے پہلے چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ کے سوال کے پہلے حصے کا جواب یہ ہے کہ جب ثمرین اپنے شوہر افضل خان کے ساتھ فریدہ کو لے کر میٹرنٹی ہوم چلی گئی تھی تو میرا اس کے گھر جانے کا کیا فائدہ تھا۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب میں یہ دوں گی کہ اپنے گھر میں ڈرنے کا کیا سوال۔ جہاں میں پانچ سال سے رہتی آئی تھی وہاں ایک رات اکیلے گزارنے میں کیا پرابلم ہوسکتی تھی!"

"چلیں آپ کی بات کو درست مان لیتے ہیں کہ آپ وہ رات تنہا اپنے بنگلے میں گزارنے میں کوئی پریشانی، ڈر یا خوف محسوس نہیں کرتی تھیں۔" میں نے متحمل لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "نورین صاحبہ! مذکورہ رات آپ بنگلے کی بالائی منزل پر کیوں سوئی تھیں جب کہ معمول کے مطابق تو آپ زیریں منزل کی خواب گاہ کو استعمال کرتی تھیں؟"

"یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔" وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ "میں اپنے گھر میں کہیں بھی سوؤں۔ آپ اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں؟"

وکیل صفائی اس موقع پر اپنی موکلہ کی مدد کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "یور آنر! وکیل استغاثہ حد سے گزر رہے ہیں۔ یہ تو سراسر میری موکلہ کے نجی معاملات میں مداخلت ہے۔ مجھے اس بات پر سخت اعتراض ہے۔"

جج نے وکیل صفائی کا اعتراض درست خیال کرتے ہوئے مجھے تاکید کی۔ "بیگ صاحب! آپ ٹو دی پوائنٹ جرح کریں۔"

"آل رائٹ یور آنر۔" میں نے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا پھر کٹہرے میں کھڑی ملزمہ نورین کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"نورین صاحبہ!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کی بہن ثمرین نے کتنے بجے فون کر کے آپ کو اپنے نہ آنے کی اطلاع دی تھی؟"

"میرا خیال ہے اس وقت رات کے دس بجے تھے۔"

"آپ اس وقت کیا کر رہی تھیں؟"

"میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔"

"بالائی منزل پر یا زیریں منزل پر!" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "کیوں کہ میری معلومات کے مطابق آپ کے بنگلے کے بالائی اور زیریں دونوں بیڈ رومز میں ٹی وی موجود ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ کی معلومات درست ہیں۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میں اس وقت بنگلے کی بالائی خواب گاہ میں تھی۔"

"ہیراز پوائنٹ یور آنر" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "آپ کون سا پوائنٹ نوٹ کروانا چاہتے ہیں بیگ صاحب؟"

وکیل صفائی بھی میرے درج بالا جملے پر محتاط نظر سے مجھے تک رہا تھا، اس کے چہرے سے گہری الجھن ہویدا تھی۔ میں نے وکیل صفائی آفتاب لودھی کو نظر انداز کرتے ہوئے جج سے کہا۔

"جناب عالی! میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے چند لمحاتی مہلت لوں گا۔" جج کی نظر سے اجازت پا کر میں ملزمہ نورین کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"نورین صاحبہ!" میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اگر میری معلومات غلط نہیں ہیں تو آپ کے بالائی بیڈروم میں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہیں ہے پھر آپ نے وہاں ٹی وی دیکھتے ہوئے اپنی بہن کا فون کس طرح اٹینڈ کیا تھا؟"

وہ گڑبڑا گئی مگر اس کی ڈھٹائی عروج پر ہی رہی۔ "میں ثابت کرسکتی ہوں کہ میرے بنگلے کے بالائی بیڈروم میں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔ آپ ابھی میرے ساتھ چل کر دیکھ لیں۔"

"میں ابھی کی نہیں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب وقوعہ پیش آیا تھا۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں کہ میری معلومات صد فیصد درست ہیں۔"

وکیل صفائی اپنی موکلہ کو سنبھالا دینے کے لیے لپکا "یور آنر! وکیل استغاثہ بہت بڑھ چڑھ کر دعوے کر رہے ہیں۔ کیا یہ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ ان کی معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں اپنی معلومات کے ذرائع ظاہر کرنے کا پابند نہیں ہوں۔ ہاں، البتہ اپنے ہر دعوے کو ثابت کرنے کا پابند ہوں۔ آپ کی موکلہ اگر اس بات پر ثابت قدم ہے کہ وقوعہ کے وقت بالائی منزل کے بیڈروم میں فون کی سہولت موجود تھی تو میں اس مکینک کو عدالت میں گواہی کے لیے پیش کرسکتا ہوں جس نے وقوعہ کے کچھ عرصہ بعد مذکورہ بیڈروم میں فون کی تنصیب کا کام کیا تھا۔"

میں نے محسوس کیا، نورین خاصی نروس ہونے لگی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے کمزور پڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ چند لمحے جب خاموش کھڑی ایک پاؤں کا وزن دوسرے پر منتقل کرتی رہی تو جج نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بی بی! آپ خاموش کیوں ہیں۔ وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیں۔"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔

"بس، مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! میری لرنڈ کورٹ سے یہ درخواست ہے کہ ملزمہ کے اس ردِعمل کو عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ کیا جائے۔"

وکیل صفائی نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! وکیل استغاثہ غیر ضروری باتوں میں معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''آپ کی نظر میں یہ باتیں غیر ضروری ہوں گی مائی ڈیئر ڈیفنس کونسل! مگر میرے لیے نہایت کارآمد اور مفید ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور وقت آنے پر آپ بھی ان باتوں کی افادیت سے آگاہ ہو جائیں گے۔''

اس نے مجھے کینہ توز نظر سے گھورنے پر اکتفا کیا۔

میں نورین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''نورین صاحبہ! وقوعہ کی رات آپ اپنے بنگلے کے بالائی بیڈ روم میں اکیلی تھیں۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ نے بنگلے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کر دیے تھے۔ آپ لگ بھگ نصف اللیل تک ٹی وی دیکھتی رہیں پھر جب ٹی وی کی نشریات اپنے اختتام کو پہنچیں تو آپ سونے کے لیے لیٹ گئیں اور خلافِ معمول آپ کو جلد ہی نیند آ گئی۔''

اس زمانے میں کیبل نیٹ ورک اور ڈش انٹینا کا رواج نہیں تھا چنانچہ لوگ پی ٹی وی کی نشریات تک ہی محدود تھے۔ میں نے جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نورین صاحبہ! آپ کے بیان کے مطابق' تھوڑی دیر بعد زیریں منزل سے آنے والی آوازوں کی وجہ سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔ بجائے خوف زدہ ہونے کے آپ نے بیڈ سائیڈ کی دراز سے ریوالور نکالا اور زیریں منزل پر متوقع گڑ بڑ کی خبر گیری کرنے پہنچ گئیں۔ کیا اس وقت بھی آپ خوف زدہ نہیں ہوئی تھیں؟''

''میں خوف اور ڈر کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں۔'' وہ تکبر آمیز انداز میں بولی۔

''پھر تو آپ ایک غیر معمولی بہادر عورت ہیں۔'' میں نے اس انداز میں کہا کہ نورین کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن نہیں تھا کہ میں نے اس کی تعریف کی تھی یا اس پر طنز کیا تھا۔

وہ بے تاثر نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا ''نورین صاحبہ! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ جب آپ بنگلے کی زیریں خواب گاہ میں پہنچیں تو وہاں ایک لمبا تڑنگا نقاب پوش نقب زن اپنی کارروائی میں مصروف تھا۔ اس صورت حال نے بھی آپ کو خوف زدہ نہیں کیا؟''

''میں بتا چکی ہوں کہ ڈر اور خوف کے معاملے میں' میں عام عورتوں سے بہت مختلف ہوں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''آپ بار بار ایک ہی سوال کیوں کر رہے ہیں؟''

''تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت ضائع کیا جا سکے۔'' وکیل صفائی نے دھیمے لہجے میں طنز کیا۔

میں نے اس کی چوٹ پر برہم ہونے یا کسی قسم کا جوابی حملہ کرنے کے بجائے ایک شارٹ ایکٹ کیا۔ میں نے چونکنے والے انداز میں ملزمہ والے کٹہرے کے فرش کو دیکھا اور اچھل کر پیچھے ہٹتے ہوئے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا ''چوہیا......''

اس کے ساتھ ہی عدالت کے گمبھیر سناٹے میں نورین کی سریلی چیخ گونج اٹھی۔ وہ دونوں پاؤں پٹختے ہوئے کٹہرے کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

عدالت کے کمرے میں لوگوں کی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز نورین ہی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نورین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو عام عورتوں ہی کی طرح ہیں حالانکہ تھوڑی دیر قبل آپ اپنی بہادری' جرأت' بے خوفی اور نڈرپن کے بلند و بانگ دعوے کر چکی ہیں؟''

وہ خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''نورین صاحبہ! جب آپ نے نقاب پوش نقب زن کو الماری کے لاکر میں زیورات کے ڈبے نکال کر اپنے تھیلے میں بھرتے ہوئے دیکھا تو......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ''زیورات کے ڈبے اور نقدی!''

''ٹھیک ہے' میں اپنے بیان میں نقدی کا اضافہ کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا پھر اپنے سوال کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''تو نورین صاحبہ! اس موقع پر آپ نے نقاب پوش کو للکار کر پوچھا تھا......کون ہو تم؟ آپ کے استفسار کے جواب میں نقاب پوش نے کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا؟''

''اس نے مجھ پر پستول تان لیا تھا۔'' وہ بے دھڑک بولی۔

''وہی پستول جو ازاں بعد پولیس کو خواب گاہ کے فرش پر پڑا ملا تھا۔'' میں نے تصدیق طلب نظر سے نورین کو دیکھا۔ ''اور مذکورہ پستول پر آپ کے شوہر یعنی مبینہ نقاب پوش نقب زن کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے تھے؟''

''جی ہاں' آپ درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''جب نقاب پوش نے آپ پر پستول تانا تو آپ نے کیا کیا؟''

''میں نے اپنی حفاظت کا حق استعمال کرتے ہوئے ہاتھ میں موجود ریوالور سے گولی چلا دی تھی۔''

''گولی یا گولیاں؟''

''گولیاں۔'' وہ بولی۔ ''میں نے دو فائر کیے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک گولی نقاب پوش کی کھوپڑی میں لگی تھی جو پیشانی سے داخل ہو کر کھوپڑی کے عقبی حصے سے باہر نکل گئی تھی جب کہ دوسری گولی مقتول کے حلقوم میں پیوست ہوئی تھی۔ ہیں نا؟''

''جی ہاں' بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس کا جواب اثبات میں تھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ پولیس کی آمد سے قبل اس حقیقت سے ناآشنا تھیں کہ نقاب پوش کے بجائے آپ نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں نے کسی کو دانستہ قتل نہیں کیا تھا بلکہ میرا وہ عمل اپنی جان بچانے کی خاطر تھا...... اور یہ حقیقت ہے کہ گولی چلاتے وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ نقاب کے پیچھے سے میرے شوہر کا چہرہ برآمد ہوگا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”وکیل صاحب! کیا آپ کا قانون کسی انسان کو اپنی جان بچانے کا حق نہیں دیتا؟“

”بالکل دیتا ہے۔“ میں نے پُر زور انداز میں کہا۔ ”اور اسی حق کی آڑ میں آپ پہلے باعزت بری کردی گئی تھیں۔“

”پھر آپ نے دوبارہ کیوں یہ کھٹ راگ پھیلایا ہے؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”کیا آپ کو عدالت کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا یا مجھ سے ذاتی طور پر آپ کو کوئی دشمنی ہے حالانکہ اس سے پہلے تو میں آپ کو جانتی تک نہیں تھی۔ گڑے مردے اکھاڑ کر آخر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے' ہاں قانون سے دوستی ضرور ہے۔ میرے خیال میں حقیقت وہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کی ہے۔ شیخ احمد کی موت ایک اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ یہ قتل عمد کا کیس ہے اور میں اس سچ کو ثابت کردوں گا۔“

”آپ وکیل ہیں۔ آپ کی روزی روٹی اسی پیشے سے وابستہ ہے۔“ وہ لاتعلقی کے سے انداز میں بولی۔ ”میں آپ کو ان سرگرمیوں سے ٹوک یا روک تو نہیں سکتی۔ سچ کیا ہے' یہ پہلے بھی ثابت ہو چکا ہے اور اللہ کے فضل سے اب بھی ثابت ہوگا۔“ اپنی بات ختم کرکے اس نے وکیل صفائی کی جانب فخریہ نظر سے دیکھا۔ جیسے وقت کی ڈور آفتاب لودھی کے ہاتھ میں ہو۔

میں نے کہا۔ ”میں آپ کی بات سے آدھا اتفاق کرتا ہوں۔“

”آدھا اتفاق کیوں؟“

”میرے خیال میں پہلے سچ کو دبا دیا گیا تھا۔“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”مگر اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس مرتبہ سچ ضرور سامنے آئے گا۔“

وہ اپنے دانتوں کی حرکت سے گلاب ہونٹ کا کباڑا کرنے لگی تاہم منہ سے کچھ نہ بولی۔ شاید کچھ کہنے کے لیے اسے مناسب الفاظ کی تلاش تھی جو سر دست ناپید ہوگئے تھے۔

میں نے اچانک زاویہ سوال تبدیل کردیا۔ ”نورین صاحبہ!“ میں نے کٹہرے میں کھڑی ملزمہ سے پوچھا۔ ”آپ نصیر شیروانی نامی کسی شخص سے واقف ہیں؟“

”نن...... نہیں......“ وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

نصیر شیروانی اس صحت مند اور خوب رو شخص کا نام تھا جو ابتدائی پیشیوں پر ملزمہ کے ساتھ عدالت میں آتا رہتا تھا۔ سرفراز احمد نے مجھے اس کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی تھیں۔ سفید شیرڈ جس کے بارے میں استغاثہ کے گواہ غلام حیدر نے انکشاف کیا تھا وہ بھی نصیر شیروانی کی ملکیت تھی۔ شاید شیرڈ کے تذکرے کے بعد ہی وہ شخص عدالت سے غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ اس کا یہ غیاب کسی

گڑبڑ کی جانب اشارہ کرتا تھا۔

میں نے نورین سے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ”تو آپ نصیر شیروانی کو نہیں جانتیں؟“

اس نے دوبارہ انکار کیا مگر اس مرتبہ اس کے لہجے میں بوکھلاہٹ کے بجائے اعتماد کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میں نے کرید جاری رکھی۔

”نورین صاحبہ! میں اس نصیر شیروانی کی بات کررہا ہوں' طارق روڈ پر جس کی کاسمیٹکس اینڈ لیڈی انڈر گارمنٹس کی بہت بڑی دکان ہے...... اور جو گلشن اقبال کے ایک لگژری فلیٹ میں رہائش پذیر ہے؟“

”میں نے کہا نا' میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔“

”آبجیکشن یور آنر۔“ وکیل صفائی نے اپنا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی' وکیل استغاثہ غیر متعلق سوالات کی بوچھاڑ کرکے میری موکلہ کو ہراساں کررہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔“

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! نصیر شیروانی کے بارے میں' ملزمہ سے آپ کے استفسارات کا موجودہ مقدمے سے کوئی تعلق ہے؟“

”بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی!“

”آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے نورین سے پوچھا۔ ”کچھ یاد آیا آپ کو؟“

”میں جو جانتی تھی' آپ کو بتا چکی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”چلیں' میں آپ کی کچھ مدد کرتا ہوں۔ آپ میرے اشاروں کی مدد سے اپنی یادداشت کو کھنگالیں۔“

وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”میں نے ابھی ابھی اپنے سوالات میں جس نصیر شیروانی کا ذکر کیا ہے' اس کے پاس ایک سفید شیرڈ ہے جس کا نمبر ”زیرو' ون' سیون' نائن“ ہے۔“

”میرا جواب اب بھی وہی ہے۔“ وہ تیز لہجے میں بولی تاہم اس بلند لہجے میں اعتماد کا فقدان واضح طور پر جھلک رہا تھا۔

میں نے حملہ برقرار رکھا۔ ”نورین صاحبہ! یہ وہی سفید شیرڈ ہے جو وقوعہ کے روز استغاثہ کے گواہ غلام حیدر نے آپ کے بنگلے سے کچھ فاصلے پر ایک تالا بند بنگلے کے سامنے مشکوک انداز میں کھڑی دیکھی تھی اور شیخ احمد کے قتل کے بعد یہ گاڑی وہاں سے رخصت ہوگئی تھی۔“

”آپ خرافات...... آپ کا گواہ خرافات اور آپ لوگوں کی ساری باتیں بکواسیات۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”آخر ان باتوں سے میرا کیا تعلق ہے۔ مجھ سے کیوں آپ ایسے سوالات پوچھ رہے ہیں۔“

میں ایک بار آپ کو بتا چکی ہوں...... میں بتا چکی ہوں...... میں نہیں جانتی کسی نصیر وصیر کو اور نہ ہی مجھے کسی منحوس شیرڈ کے بارے میں کوئی علم ہے۔ آپ میری جان کیوں نہیں چھوڑتے؟"

اس کا پورا وجود زلزلے کی زد پر تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے معنی خیز نظر سے جج کی طرف دیکھا' وہ بڑی دلچسپی اور غور سے ملزمہ کی کیفیات کو نوٹ کر رہا تھا۔ نورین کے ردِعمل نے وکیل صفائی سمیت عدالت کے کمرے میں موجود ہر فرد کو کچھ سوچنے سمجھنے کی کھلی دعوت دے دی تھی۔

وکیل صفائی نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "مجھے سخت اعتراض ہے' جناب عالی! اٹ از ٹو مچ۔ وکیل استغاثہ میری موکلہ کے جذبات کو مجروح کر رہے ہیں۔ اس کے دماغ پر گہرا اثر ہوا ہے۔"

میں نے یہ نیک کام جاری رکھتے ہوئے نورین سے پوچھا "نورین صاحبہ! اب میں آپ سے جو کچھ پوچھنے جا رہا ہوں اس کا جواب سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔" ایک لمحے کو میں نے توقف کیا۔ اس دوران میں ملزمہ فوری جذباتی ہیجان سے کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "ابتدائی ایک دو پیشیوں پر' ایک دراز قامت' ہینڈسم اور صحت مند شخص آپ کے ساتھ عدالت آتا رہا ہے۔ اس سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"وہ میرا ایک عزیز ہے۔"

"عزیز!" میں نے یہ آواز بلند دہرایا۔ "اس نے اچانک آپ کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا...... میرا مطلب ہے' آج کل وہ آپ کے ساتھ نہیں آ رہا؟"

"وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"آپ اس شخص کا نام بتانا پسند کریں گی؟"

"کیا میں آپ کے سوال کا جواب دینے کی پابند ہوں؟"

میں نے کہا۔ "اگر آپ جواب نہ دینا چاہیں یعنی اس شخص کا نام ظاہر نہ کرنا چاہیں تو پھر آپ کو اس سے اپنے رشتے یا تعلق یا ناتے کی نوعیت بتانا ہوگی۔" پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! زیرِ سماعت مقدمے کے منصفانہ حل کے لیے ملزمہ کے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔"

جج نے ملزمہ کو ہدایت کی۔ "بی بی! آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔"

وہ بولی۔ "وہ شخص میرا کزن ہے۔"

"اچھی طرح سوچ لیں۔" میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "کہیں آپ کا جواب آپ کے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔"

"میں نے سوچ سمجھ کر ہی جواب دیا ہے۔" وہ متذبذب انداز میں بولی پھر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو گھورنے لگی۔

میں نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق اس وقت آپ کے رشتے داروں میں صرف آپ کی

ایک بہن ہی دنیا میں موجود ہے یعنی ثمرین...... اور وہ عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔ آپ کا کزن کہاں سے آ گیا؟"

نورین نے بے ساختہ ثمرین کی جانب دیکھا۔ جج نے نورین کی نظر کی تقلید کی پھر ثمرین کو گواہی کے لیے کٹہرے میں بلا لیا۔

ثمرین بے چاری اپنی بہن کے اس نام نہاد کزن سے ناواقف تھی۔ اتفاق سے جن دنوں وہ شخص یعنی نصیر شیروانی نورین کے ساتھ عدالت میں آیا تھا اس موقع پر ثمرین موجود نہیں تھی۔

ثمرین جج کے بلاوے پر بوکھلا گئی۔ عدالت کے کمرے کا اپنا ایک تاثر ہوتا ہے پھر اس پر جج کی رعب دار آواز۔ جج نے جب ثمرین سے نورین کے بیان کی تصدیق کے لیے سوال کیا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے سچ نکل گیا۔

"جناب عالی! ہمارا کوئی کزن نہیں ہے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔ "پتا نہیں' نورین کس شخص کا ذکر کر رہی ہے۔"

جج نے ناگوار نظر سے ملزمہ کی جانب دیکھا۔ اس کی تو بولتی ہی بند ہو چکی تھی۔ میں نے کرارے لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! میں معزز عدالت سے پر زور اپیل کروں گا کہ ملزمہ کا یہ ماسٹر پیس جھوٹ ریکارڈ میں شامل کر لیا جائے۔"

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! یہ کزن والا کیا معاملہ ہے؟"

میں نے بتایا۔ "جناب عالی! جس شخص کو ملزمہ نے اپنا کزن بتایا ہے اس کا نام مجھے نصیر شیروانی معلوم ہوا ہے۔ سفید شیرڈ اسی کی ملکیت ہے بلکہ ہمہ وقت اس کے استعمال میں ہے۔ مذکورہ گاڑی وقوعہ کی رات مقتول کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی پائی گئی تھی...... اور میری تحقیق کے مطابق پچھلے کچھ عرصے سے ملزمہ' نصیر شیروانی نامی اس شخص کے ساتھ کئی مقامات پر دیکھی گئی ہے...... میرا مطلب ہے' مقدمہ جیتنے یعنی باعزت بری ہونے کے بعد۔"

جج نے ناپسندیدہ نظر سے نورین کو دیکھا۔ وہ کٹہرے کی ریلنگ سے پیشانی ٹکائے کھڑی تھی پھر آہستہ آہستہ وہ کٹہرے کے فرش پر بیٹھ گئی۔

وکیل صفائی کی حالت دیدنی تھی۔ بوکھلاہٹ اس کے چہرے پر خیمہ زن تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں اسے کیا کہنا چاہیے۔ پہلے کیس میں آفتاب لودھی کو کسی بھی مرحلے پر ایسی سچویشن کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اس کی موکلہ تو کٹہرے کے فرش پر اس طرح بیٹھ گئی تھی جیسے ہوا کا رخ دیکھ کر الیکشن میں واضح ناکامیابی سے بچنے کے لیے کوئی سیاسی لیڈر "بیٹھ" جاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

دلائل کا آغاز میری جانب سے ہوا۔

میں نے اب تک کی عدالتی کارروائی کو ذہن میں تازہ کیا پھر اس میں سے اہم نکات کو ترتیب وار سیٹ کرنے کے بعد ملزمہ کے خلاف دلائل دینا شروع کیے۔

''جنابِ عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کے گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح۔ ازیں علاوہ ملزمہ کا بیان اور اس پر ہونے والی جرح کا احوال عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس میں بہت سے ایسے پہلو بھی سامنے آئے ہیں کہ ملزمہ کی ذات شکوک وشبہات کی دبیز چادر میں لپٹی دکھائی دیتی ہے۔''

ایک لمحے کو میں سانس لینے کے لیے رکا پھر سلسلۂ دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! مقتول شیخ احمد کی اکلوتی بہن اور استغاثہ کی گواہ محترمہ سلیقہ بانو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزمہ نے قدم قدم پر جھوٹ کا سہارا لیا ہے۔ اس نے مقتول کے لاہور جانے کے حوالے سے جو کہانی سنائی ہے اسے من گھڑت اور بعید از حقیقت ہی کہا جا سکتا ہے۔ گواہ کے مطابق ملزمہ کی بعض حرکتوں کی وجہ سے مقتول بہت پریشان رہتا تھا۔ اس صورتِ حال میں ملزمہ کی پوزیشن کسی بھی طور پر بری الشک نہیں ٹھہرتی۔ مقتول اپنی بہن کے اتنا قریب تھا کہ شہر سے باہر جانے کا اپنا پروگرام اس سے چھپا نہیں سکتا تھا......''

وکیل صفائی نے اپنی موجودگی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ مقتول سے بھی یہ غلطی یا بھول ہو سکتی ہے کہ وہ استغاثہ کی گواہ یعنی اپنی بہن کو اپنے لاہور جانے کے بارے میں نہ بتا سکا ہو۔ اس چھوٹی سی بات کو ایشو بنانا کسی بھی طور مناسب نہیں۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں میرے دوست!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انسان خطا کا پتلا ہے اور اسے مٹی کا پتلا بھی کہا جاتا ہے مگر آپ جس چھوٹی سی بات کو ایشو بنانا نامناسب خیال کر رہے ہیں وہ اس مقدمے میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ناممکنات میں سے نہیں کہ مقتول اپنی بہن سے ذکر کرنا بھول گیا ہو مگر اس کا کیا کیجیے کہ مقتول کے دیرینہ ملازم عبدالشکور کا بیان بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ مقتول وقوعہ کے روز لاہور نہیں گیا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد گواہ عبدالشکور کے ہمراہ لاہور جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وقوعہ کے روز اس نے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ''شیخ جوئیلرز'' کو بند کر دیا اور اپنے گھر واقع بہادر آباد کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے میرے فاضل دوست؟ کیا ایسا ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا؟''

''یہ تو آپ مقتول سے جا کر پوچھیں۔'' وہ سٹ پٹا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے مقتول کو یہاں بلانا ہوگا یا خود اس کے پاس جانا ہوگا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے وکیل صفائی کی آنکھوں میں جھانکا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مقتول کو یہاں...... یا کہیں بھی بلانا کم از کم میرے لیے تو ممکن نہیں کیوں کہ میں روحوں کو بلانے کے فن سے

نا آشنا ہوں۔'' میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ''اور جہاں تک بات ہے خود اس کے پاس جانے کی تو مائی ڈیئر کونسلر! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے لہٰذا آپ کی تجویز پر عمل کرنا کسی بھی صورت ممکن نہیں۔''

پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے دلائل کو آگے بڑھایا۔ ''جنابِ عالی! اب میں استغاثہ کے گواہ غلام حیدر کی طرف آتا ہوں۔ موصوف ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہ چکے ہیں اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی ماشاء اللہ خاصے چاق وچوبند ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا باقاعدہ ایکسر سائز کرنا ہے۔ وہ صبح وشام چہل قدمی کے بھی عادی ہیں جبھی پینسٹھ کراس کرنے کے باوجود ایکٹیو نظر آتے ہیں۔

جنابِ عالی! استغاثہ کے گواہ غلام حیدر کا گھر مقتول کے بنگلے کے عین سامنے واقع ہے اور گواہ کا بیان ہے کہ اس نے لگ بھگ نو بجے رات مقتول کو اپنی کریم کلر ٹویوٹا کرولا میں اپنے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ گواہ کا سابق ریکارڈ بے داغ اور معاشرتی حیثیت شفاف ہے۔ اس لیے اس کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جنابِ عالی! اتنے زیادہ افراد جھوٹ کیسے بول سکتے ہیں۔ مقتول وقوعہ کے روز لاہور نہیں گیا بلکہ حسبِ معمول گھر ہی لوٹا تھا۔ ملزمہ کی کہانی جھوٹ کا پلندا محسوس ہوتی ہے اور کوئی انسان خواہ مخواہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس فعل کے پیچھے چھوٹا یا بڑا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔''

''ایک بات کو آپ نظر انداز کر رہے ہیں میرے فاضل دوست۔'' وکیل صفائی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ استغاثہ کا وکیل ہونے کے ناتے وہ بات آپ کے حافظے میں نقش ہونا چاہیے تھی۔''

میں نے چونک کر وکیل صفائی کو دیکھا اور مصنوعی بے خبری کے تاثرات اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''کون سی بات وکیل صاحب؟''

''دیکھا...... میں نے کہا تھا نا آپ کچھ نظر انداز کر رہے ہیں؟'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

''آپ یاد دلائیں۔'' میں نے کہا۔

''معلوم ہوتا ہے، گواہ غلام حیدر کا ایک نہایت ہی اہم جملہ آپ کے ذہن سے اڑ گیا ہے جیسے انسان کے حواس اڑ جاتے ہیں یا جیسے کچھ لوگ بے پر کی اڑاتے ہیں۔'' وکیل صفائی نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی۔

جج نے اس سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ گواہ غلام حیدر کے کون سے جملے کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ذرا وضاحت کریں؟''

میں نے یہ موقع ضائع کرنے کے بجائے جوابِ آں غزل کے طور پر کہا۔ ''میرے فاضل دوست! اب آپ معزز عدالت سے بھی وہ بات نہ کہیے گا جو مجھ سے کہی تھی...... یعنی وہ حافظے میں نقش ہونے والی بات!''

آفتاب لودھی نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور جج کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ غلام حیدر نے مقتول کے لیے ''آنکھ پھوڑ ٹنڈا'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول گواہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔''

''پھر؟'' میرا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔

''پھر یہ کہ اس صورت میں گواہ کی شہادت معتبر نہیں مانی جا سکتی۔'' وکیل صفائی نے کہا۔ ''ممکن ہے، وہ مقتول سے کسی دشمنی کی بنا پر ایسا بیان دے رہا ہو!''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ گواہ کا مقتول کے بارے میں تبصرہ یا ریمارکس محض مزاج نہ ملنے کا اظہار ہے۔ ان دونوں میں طبعی میلان نہیں تھا۔ مقتول کی سنجیدگی اور لیے دیے رہنے کی عادت سے گواہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک بے مروت اور خشک انسان ہے۔ گواہ کے ''جملے'' سے کہیں یہ ظاہر یا ثابت نہیں ہوتا کہ اسے مقتول سے کسی قسم کی دشمنی ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''اور بہ فرض محال، اگر کوئی دشمنی تھی بھی تو یہ کون سا موقع تھا دشمنی نکالنے کا؟ اس سے گواہ کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے یا مقتول کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے جب کہ مقتول سود و زیاں کی اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہے۔''

جج نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ دلائل کے سلسلے کو جاری رکھیں۔''

''جناب عالی!'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزمہ نورین نے متعدد مقامات پر جھوٹ کا سہارا لیا ہے۔ میں چند اہم مقامات کی دوبارہ نشان دہی کرتا ہوں۔ پہلی بات تو یہی کہ وقوعہ کے روز مقتول لاہور نہیں گیا تھا بلکہ حسب معمول اپنے گھر آیا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقوعہ کے وقت وہ گھر ہی میں موجود تھا۔ ایک عام انسان کی طرح...... اپنے گھر کے سربراہ کے طور پر نہ کہ ایک نقاب پوش نقب زن کے بہروپ میں!

جناب عالی! توجہ طلب بات یہ ہے کہ شیخ احمد جیسے کامیاب جیولر کو زیورات کے چند ڈبے چرانے کی آخر کیا ضرورت پیش آ گئی تھی اور وہ بھی اپنے ہی گھر سے...... اپنی منکوحہ کے زیورات جب کہ اس کی عالی شان دکان میں زیورات کے ایسے سینکڑوں سیٹ بھرے ہوئے تھے۔ مقتول کا نقاب پہن کر اپنے ہی بنگلے کے اندر نقب لگانے کی کوشش کرنا عقل سے باہر اور خالی از منطق ہے جب کہ اس عمل کے پیچھے وکیل صفائی یا ملزمہ نے مقتول کا کوئی ٹھوس مقصد یا کوئی اور سبب بھی بیان نہیں کیا اور نہ ہی اب تک کی کارروائی کے دوران میں ایسی کوئی بات سامنے آئی ہے۔

جناب عالی! ملزمہ کا موقف یہ ہے کہ وقوعہ کی رات وہ اپنے بنگلے کی بالائی منزل پر سوئی تھی اور

وہیں، سونے سے کچھ دیر قبل اس نے اپنی بہن ثمرین کا فون ریسیو کیا تھا جس کے مطابق ثمرین نے اس کے پاس آنے سے معذوری ظاہر کی تھی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وقوعہ کے وقت بنگلے کی بالائی منزل کے کسی بھی کمرے میں فون کرنے یا ریسیو کرنے کی سہولت موجود نہیں تھی۔'' میں نے رک کر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! فاضل عدالت کے ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ جب میں نے اس سلسلے میں ملزمہ کو چیلنج کیا اور اس مکینک کو عدالت میں پیش کرنے کی بات کی جس نے وقوعہ سے کچھ عرصے بعد بالائی منزل پر فون کی تنصیب کا کام کیا تھا تو ملزمہ نے معزز عدالت کے سوال کے باوجود بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ملزمہ کا صرف یہی ایک جملہ اس کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔

پھر ملزمہ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز وہ مقتول کو دکان پر چھوڑ کر گاڑی واپس گھر لے آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ رات کو وہ خود جا کر مقتول کو اپنے ساتھ لے آئے گی مگر واقعاتی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ملزمہ نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ وقوعہ کے روز مقتول لگ بھگ رات نو بجے بہ نفس نفیس اپنی گاڑی میں گھر پہنچا تھا۔

جناب عالی! ملزمہ نے بھی عدالت میں، وقوعہ والی رات کے واقعات کے حوالے سے خود کو ایک نہایت ہی بہادر، نڈر اور شیر دل عورت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی اور ملزمہ بھی اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے میں ناکام رہی ہے۔''

میں نے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! ملزمہ نے ایک ایسے شخص کو اپنا کزن بتایا ہے۔ جس کے وجود سے ملزمہ کی بڑی بہن انکاری ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ملزمہ اور اس کی بہن ثمرین کے سوا ان کا کوئی اور قریبی رشتے دار موجود نہیں۔ یعنی کوئی بہن بھائی یا کزن وغیرہ۔ ملزمہ نے جس شخص کو اپنا کزن بتایا ہے اس کا نام نصیر شیروانی معلوم ہوا ہے اور اس کے نام پر رجسٹرڈ سفید شیرڈ نمبر ''زیرو، ون، سیون، نائن'' کو وقوعہ کی رات مقتول کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر مشکوک انداز میں پارکڈ پایا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصیر شیروانی نامی وہ شخص اس وقت کہیں آس پاس ہی موجود تھا اور وقوعہ کے فوراً بعد وہاں سے رخصت ہو گیا تھا کیوں کہ استغاثہ کے گواہ غلام حیدر کے بیان کے مطابق جب فائرنگ کی آواز سن کر وہ اپنے گھر سے باہر نکلا تو تالا بند بنگلے کے سامنے کھڑی سفید شیرڈ غائب ہو چکی تھی۔

''جناب عالی! مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ملزمہ پچھلے دنوں نصیر شیروانی کے ساتھ متعدد بار دیکھی گئی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مقتول کسی اتفاقی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔ یہ ''حق حفاظت خود اختیاری'' کے بجائے سیدھا سیدھا ''قتلِ عمد'' کا کیس ہے۔''

وکیل صفائی نے سٹ پٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جناب عالی! وکیل استغاثہ خواہ مخواہ معاملے کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری موکلہ نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے ایک نقاب پوش نقب زن پر گولی چلائی تھی جو اس کا حق بنتا ہے کیونکہ اگر میری موکلہ ایک لمحے کو بھی چوک جاتی تو نقاب پوش اپنے پستول سے فائر کر کے اس کی جان لے لیتا۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا کہ سیاہ نقاب کے پیچھے اس کے سیاہ اعمال شوہر کا چہرہ چھپا ہوگا۔“

”بہت خوب!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”میرے فاضل دوست‘ میں معاملے کو الجھانے کے بجائے سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کی موکلہ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید ثابت کرنے کی بھونڈی سعی کر رہی ہیں جب کہ درحقیقت مقتول کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا‘ اس کی ذمے دار آپ کی یہ معصوم وحسین صورت موکلہ ہی ہے۔“

”یہ الزام ہے۔“ وکیل صفائی نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ”آپ میری موکلہ کے ساتھ ناروا رویے کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔“

مین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لودھی صاحب! آپ نے اگر قانون کی چند کتابیں پڑھی ہیں تو بخوبی جانتے ہوں گے کہ استغاثہ کی جانب سے ملزمہ پر الزام ہی لگایا جاتا ہے اسی مناسبت سے وہ ملزمہ کہلاتی ہے۔ وکیل صفائی کا یہ کام ہے کہ وہ اپنی موکلہ یا اپنے موکل کو اس الزام سے پاک ثابت کرتا ہے مگر آپ تو......؟“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”اور آپ اپنا فرض تو بخوبی نبھا رہے ہیں نا؟“ ایک لمحے کو رک کر اس نے انگلش بگھارنے کی کوسش کرتے ہوئے کہا۔ ”مائی ڈیئر پراسیکیوٹر! فار یوئر کائنڈ انفارمیشن۔ وکیل استغاثہ کا پہلا اور آخری فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے الزام کو سچ ثابت کرے۔“

”میں یہی تو کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اب تک آپ نے ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس سے بڑا ٹھوس ثبوت اور کیا ہوگا کہ آپ کی موکلہ پے در پے جھوٹ بول رہی ہے حالانکہ وہ یہ بات جانتی ہے کہ جس وقت مقتول پر گولیاں برسائی گئیں‘ اس وقت اس کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں تھا اور نہ ہی وہ چوری کی نیت سے اپنے گھر میں داخل ہوا تھا۔“

میرے انکشاف نے عدالت کے کمرے میں گہرا سناٹا طاری کر دیا پھر اس خاموشی کو سب سے پہلے وکیل صفائی نے توڑا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں چیخا۔

”یہ کیا مذاق ہے؟“

”یہ مذاق نہیں‘ حقیقت ہے۔“ میں نے تحمل سے کہا۔

”کیا آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں؟“

”میں جو ثابت نہ کر سکوں اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔“

”اپنے دعوے کا کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟“

میں نے مسکرا کر وکیل صفائی کو دیکھا۔ جج نے اضطراری لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”بیگ صاحب! اپنے موقف کی وضاحت کریں۔“

میں نے انکوائری افسر کو اشارہ کیا۔ اس نے جج کی اجازت سے سیلوفین کا وہ بند بیگ اٹھالیا جس کے اندر آلۂ قتل مقتول کا ریوالور‘ خواب گاہ سے ملنے والا پستول‘ مقتول کی گردن میں پیوست اور کھوپڑی کے آر پار ہو جانے والی گولی کے علاوہ وہ سیاہ نقاب بھی موجود تھا جو موقع پر پولیس نے مقتول کے چہرے سے اتارا تھا۔ وہ سیاہ کپڑے کا ایک لمبوترا سا تھیلا تھا۔ میری ہدایت پر انکوائری افسر نے وہ نقاب سیلوفین بیگ سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ مقتول کا خون اس نقاب پر جم کر ہم رنگ نقاب ہو چکا تھا۔

میں نے اس نقاب کو ہاتھوں میں گھمانے پھرانے کے بعد جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! اس موقع پر مجھے وکیل صفائی کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”آپ ان سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟“ جج نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”جناب عالی! میں یہ نقاب چند لمحوں کے لیے ان کو پہنانا چاہتا ہوں۔“

”یہ کیا بدمعاشی ہے؟“ وکیل صفائی چیخ اٹھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے‘ اگر آپ تعاون کے لیے تیار نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں۔“

جج بڑی دلچسپی مگر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف تکتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میں یہ نقاب پہن کر آپ کو دکھاتا ہوں۔“

عدالت میں ایک عجیب سی سنسنی پھیل چکی تھی۔ جج سمیت ہر شخص کی نگاہ مجھ پر لگی ہوئی تھی۔ میرے ڈرامائی انداز نے لوگوں کو پلک جھپکنے کے خیال سے آزاد کر دیا تھا۔

میں نے نقاب پہن کر جج کی سمت دیکھا اور گمبھیر آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”جناب عالی! اس نقاب پر آنکھوں کی جگہ موجود دو سوراخوں کے توسط سے میں آپ کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں۔“ پھر میں نے گردن گھما کر حاضرین عدالت کو دیکھا اور روئے سخن جج کی جانب موڑ دیا اور کہا۔ ”میں باآسانی یہاں ہر شخص کو دیکھ رہا ہوں مگر......“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ایک لمحے کے توقف سے بولنا شروع کیا۔ ”جناب عالی! ذرا تصور کیجئے‘ اگر اس حالت میں مجھ پر دو گولیاں برسائی جائیں جیسا کہ مقتول کے ساتھ واقعہ پیش آیا تھا...... تو پھر نقاب میں مزید دو سوراخوں کا اضافہ ہو جانا چاہیے...... ایک عین پیشانی کے مقام پر...... اور دوسرا گردن پر بہ مقام حلقوم...... اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں صرف دو ہی سوراخ موجود ہیں

یعنی آنکھوں کی جگہ......اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ فائرنگ کے وقت مقتول کا چہرہ نقاب سے عاری تھا......اسے بعد میں یہ نقاب پہنایا گیا تھا!''

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ نورین ہیجانی انداز میں چلا اٹھی۔''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔میں بے قصور ہوں۔وہ......وہ......''اس کی زبان لڑکھڑائی' ٹانگیں کپکپائیں اور وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر ہانپنے لگی۔

میں نے با آواز بلند کہا۔''جناب عالی! میں ملزمہ کی فریاد سے اتفاق کرتا ہوں۔اس نے واقعی کسی کو قتل نہیں کیا۔''

اب جج کے چونکنے کی باری تھی۔وہ حیرت آمیز لہجے میں مستفسر ہوا۔''بیگ صاحب! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

میں نے کچھ کہنے سے پہلے نقاب کو اپنے سر سے الگ کیا اور اسے انکوائری افسر کی طرف بڑھاتے ہوئے جج سے کہا۔

''جناب عالی! یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ شیخ احمد کو ملزمہ نورین نے قتل نہیں کیا۔آپ ملزمہ کے قد پر غور فرمائیں۔میرے اندازے کے مطابق ملزمہ نورین کا قد چار فٹ دس انچ سے زیادہ ہرگز نہیں ہو سکتا جب کہ پولیس ریکارڈ کے مطابق مقتول شیخ احمد کا قد پورا چھ فٹ اور دو انچ تھا۔''

ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے اپنا وضاحتی بیان جاری رکھا۔''جناب عالی! مقتول اور ملزمہ کے قد کے تفاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر وقوعہ کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ایک کمرے میں روبرو کھڑے ہو کر ملزمہ کے ریوالور سے نکلنے والی گولی مقتول کی کھوپڑی کے آر پار ہو جائے یعنی پیشانی سے گھس کر کھوپڑی کے عقبی حصے سے نکلے۔اس صورت میں گولی خط مستقیم یعنی ایک سو اسی درجے کے زاویے پر سفر کرے گی جو کہ زیر بحث پچویشن کے قطعی خلاف ہے۔''

تھوڑی دیر رک کر میں نے سانس لیا پھر کہا۔''ان واقعاتی حقائق کی روشنی میں قاتل کا قد چھ فٹ کے قریب قریب ہونا چاہیے!''

''ایسا شخص کون ہو سکتا ہے؟'' وکیل صفائی نے مریل سی آواز میں کہا۔

''یہ تو آپ اپنی موکلہ ہی سے پوچھیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں چوٹ کی۔

جج نے ملزمہ نورین کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔''بی بی! اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔حقیقتِ حال بیان کرو۔''

ملزمہ کے پاس انکار یا فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔اس نے کئی وقفوں کی مدد سے اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کروا دیا۔یہ بیان اس بیان سے قطعی مختلف اور انکشاف انگیز تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس اور ازاں بعد معزز عدالت کے روبرو دے چکی تھی۔

جج کی ہدایت پر پولیس نے نصیر شیروانی کو حراست میں لے کر اس سے اقرار جرم کروا لیا۔

نورین نے زبان کھول دی تھی لہٰذا نصیر شیروانی کے پاس بچاؤ کی کوئی راہ نہیں بچی تھی۔

عدالت نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ تین سو دو کے تحت نصیر شیروانی کو سزائے موت اور ملزمہ نورین کو اعانت قتل عمد کے جرم میں پچیس سال سزائے قید سنا دی۔

چلتے چلتے نصیر شیروانی کا قصہ بھی سن لیں۔

نصیر شیروانی دراصل جمشید علی ہی کا دوسرا نام تھا۔جیل میں چند ماہ گزارنے کے بعد جب وہ باہر آیا تو اس دوران میں نورین کی شادی ہو چکی تھی۔جمشید دل برداشتہ ہو کر دوسرے شہر چلا گیا پھر تین سال کے عرصے میں اس نے چوری اور فراڈ وغیرہ کے کاموں میں اچھی خاصی دولت جمع کر لی اور واپس کراچی آ کر اپنا کاروبار سیٹ کر لیا۔

اتفاق سے اس کی ملاقات ایک روز نورین سے ہو گئی جس کی رعنائی اور ترو تازگی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔نورین کو دیکھتے ہی جمشید (جو اب ایک نئی شخصیت اور حلیے کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا) کو بھی یہی محسوس ہوا کہ نورین کے لیے اس کی دیوانگی روز اول جیسی ہے۔ان دنوں نورین کی اپنے شوہر سے خاصی ٹسل چل رہی تھی۔جمشید سے اس کی ملاقاتیں بڑھیں تو ان میں ''ری یونین'' ہو گیا۔اس کے بعد ہی انہوں نے شیخ احمد کو راستے سے ہٹانے اور ''ایک ہونے'' کا اٹل فیصلہ کیا تھا۔

وقوعہ کے روز جمشید سر شام ہی نورین کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا۔اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے نقاب پوش چور کا سین تخلیق کیا تھا جو ازاں بعد ان کی توقع کے مطابق خاصا کامیاب بھی رہا تھا۔عدالت نے نورین کو ''حق حفاظت خود اختیاری'' کا فائدہ دیتے ہوئے باعزت بری بھی کر دیا تھا مگر اس کا کیا کیجیے کہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

قدرت کا نظام انصاف جب حرکت میں آتا ہے تو اسی قسم کے واقعے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔جو لوگ اپنی چال بازیوں سے دنیاوی قانون انصاف کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مطمئن ہو بیٹھتے ہیں بالآخر ان کا انجام نورین اور جمشید علی جیسا ہی ہوتا ہے۔چاہے وہ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔

❀❀❀

یوم حساب

دنیاوی عدالتوں کی کامیابی اور ناکامی درحقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حقیقی منصف تو اوپر بیٹ
ہے۔ اس مالک الملک کی لاٹھی بے آواز اور پکڑ بڑی جان دار ہے۔ انسان کو ہر وقت اس منصفِ اعلیٰ
سے ڈرتے ہوئے اپنے احتساب کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یوم حساب اچانک ہی آیا کرتا ہے اور اس
قاضی القضاۃ کے فیصلوں کے خلاف دنیا کی کسی عدالت میں اپیل نہیں کی جا سکتی۔

اس تمہید کے بعد اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں عدالت جانے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بجی
میں نے فون ریسیو کیا۔ دوسری جانب ایک نامانوس آواز سن کر میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"جی فرمائیے!"

"آپ بیگ صاحب ہو؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں واقعی آپ کو پہچان نہیں پایا ہوں۔ آپ اپنا تعارف کروا دیں۔"

"میں سیٹھ رمضان بھائی دبئی والا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "دو سال پہلے پھراڈ
ایک کیس میں آپ میری وکالت کر چکے ہو۔ ادھر صرافہ بازار میں میری دکان ہے۔ ایک پارٹی
میرے کو چونا لگانے کی کوشش کی تھی اور آپ نے وہ کیس جیت لیا تھا۔"

اس وضاحت کے بعد سیٹھ رمضان بھائی دبئی والا میرے ذہن میں تازہ ہو گیا اور اس
ساتھ ہی وہ کیس بھی یاد آ گیا جس کا ذکر ابھی سیٹھ رمضان بھائی نے کیا تھا۔ سیٹھ رمضان کی صرا
بازار مارکیٹ کھارادر میں دکان تھی۔

میں نے پوچھا۔ "رمضان بھائی! اتنی صبح کیسے یاد کیا؟"

"قتل کا ایک کیس آپ کے حوالے کرنا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا قتل آپ نے کیا ہے؟"

"اے بابا! میں نے قتل نہیں کیا۔" رمضان بھائی نے جلدی سے کہا۔ "وہ دراصل ایک بے گناہ شخص قتل کے کیس میں پھنس گیا ہے۔ آپ اسی کی رہائی کا بندوبست کرو۔ بہت ثواب کا کام ہے۔ اس کی بیوی اور بچی دعائیں دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "رمضان بھائی! خالی دعاؤں سے کام نہیں چلتا۔ آپ کو تو معلوم ہے، میں اپنی فیس......"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "فیس کی آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب، وہ میں اپنی جیب سے دوں گا۔"

"فیس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "جب تک میں اس کیس کی پوری تفصیل نہ سن لوں، کیس لینے یا نہ لینے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے بابا!" رمضان بھائی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نزہت بیگم کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ آپ کو اس سے جو پوچھنا ہو، پوچھ لیں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو میں سیدھا عدالت جاؤں گا۔ آپ ایسا کریں، دوپہر دو بجے کے بعد آپ نزہت بیگم کو میرے دفتر میں بھیج دیں۔ آپ نے میرا دفتر تو دیکھا ہوا ہے نا۔"

"ہاں آپ کے دفتر کا ایڈریس میرے کو یاد ہے۔" رمضان بھائی نے جواب دیا۔ "میں نزہت بیگم کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ آپ اس سے کیس کی تفصیل سن لیں۔ ویسے اپن کا آئیڈیا ہے، اس کا گھر والا بے گناہ ہے اور اسے کسی گہری سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "بیگ صاحب! آپ نزہت بیگم سے فیس کی کوئی بات نہ کریں۔ وہ میں آپ کو خود دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "نزہت بیگم آپ کی کیا لگتی ہے؟"

"وہ میری رشتے دار نہیں ہے بیگ صاحب!" رمضان بھائی نے بتایا۔ "دراصل وہ کل دن میں میری دکان پر اپنا زیور بیچنے آئی تھی۔ میں نے زیور لے کر جب رقم اس کی طرف بڑھائی تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کی آٹھ نو سالہ بچی بھی تھی۔ میں نے نزہت سے اس کے رونے کا سبب دریافت کیا تو اس نے مجھے اپنی ساری کہانی سنا دی۔ اس کی دکھ بھری داستان سن کر مجھے بہت دکھ پہنچا اور میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کسی اچھے وکیل سے بات کروں گا......اور میری نظر میں آپ سے زیادہ اچھا وکیل اور کوئی نہیں ہے۔"

"خیر، یہ تو آپ کی محبت ہے۔" میں نے انکسار سے کہا۔

سیٹھ رمضان بھائی دبئی والا بولا۔ "بیگ صاحب! نزہت بیگم کی حالت دیکھ کر میرا دل بھر آیا

تھا۔ میں فی الحال اتنا تعاون کر سکتا ہوں کہ آپ کی فیس اپنی جیب سے ادا کر دوں۔ مجھے امید ہے آپ بھی اس مصیبت زدہ عورت سے بھرپور تعاون کرو گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''رمضان بھائی! آپ نے نزہت سے زیور خرید لیا ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ ''میں نے اسے پوری مارکیٹ سے زیادہ ریٹ دیا ہے۔ خدا جانتا ہے' مجھے اس عورت سے دلی ہمدردی ہے۔ آپ بھی ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا بیگ صاحب۔''

''میں نے کبھی اپنے کسی مؤکل کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں' اگر میں نے نزہت بیگم کے شوہر کا کیس لے لیا تو ممکنہ حد تک رعایت ضرور کروں گا۔ ویسے بھی میری فیس تو آپ ہی ادا کر رہے ہیں۔''

''فیس آپ کو پوری ہی ملے گی۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

❁ ❁ ❁

عدالتی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے ایک وکیل دوست کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کیا اور اپنے دفتر آ گیا۔ انتظار گاہ میں اس وقت چار پانچ افراد موجود تھے جن میں سیٹھ رمضان بھائی دبئی والا کو میں نے فی الفور پہچان لیا۔

میں نے اپنی سیکریٹری کو چائے بھجوانے کے لیے کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے مؤکل اپنی باری کے مطابق یکے بعد دیگرے میرے کمرے میں آنے لگے۔ لگ بھگ ساڑھے تین بجے رمضان بھائی ایک چادر پوش عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

سیٹھ رمضان نے عمدہ تراش کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر حسب معمول نظر کا چشمہ تھا اور ہاتھ میں چھڑی۔ اس کے بے داغ لباس سے اٹھنے والی خوشبو پل بھر میں کمرے میں بس گئی۔ سیٹھ رمضان کے ساتھ جو عورت تھی وہ یقینی طور پر نزہت بیگم ہی ہو سکتی تھی۔ نزہت نے صاف ستھرا پھول دار شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ چہرے ہی سے ایک پریشان حال اور مصیبت زدہ عورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور بتیس سال کے درمیان لگایا۔

میں نے سیٹھ رمضان کے سلام کا جواب دیا اور کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوش خلقی سے کہا۔ ''تشریف رکھیں رمضان بھائی!''

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد رمضان بھائی نے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی چادر پوش عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''بیگ صاحب! یہ نزہت بیگم ہیں۔ میں نے صبح آپ سے ان ہی کا ذکر کیا تھا۔ ان کے شوہر پر قتل کا ایک مقدمہ چل رہا ہے۔''

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سوالیہ نظروں سے نزہت بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بدستور

سر جھکائے بیٹھی رہی۔ رمضان بھائی نے میری نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں اس کیس کے بارے میں جتنا جانتا ہوں' وہ آپ کو بتا دیتا ہوں۔ تفصیلات تو نزہت بیگم ہی آپ کو بتائیں گی۔''

ایک لمحے کے توقف سے سیٹھ رمضان بھائی دبئی والا نے بتایا کہ قریب قریب ایک سال قبل نزہت بیگم کا شوہر صفدر علی قتل کے ایک کیس میں گرفتار ہوا تھا۔ سرسری سماعت کے بعد اس کا مقدمہ سیشن کورٹ کے سپرد کر دیا گیا۔ صفدر علی اپنے مختصر سے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ وہ اپنی بیوی نزہت بیگم اور اکلوتی بچی نوشین کے ساتھ میٹھادر کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ نوشین کی عمر آٹھ نو سال تھی۔ صفدر علی پر اپنی فیکٹری کے مالک انور جیلانی کے قتل کا الزام تھا۔ انور جیلانی کی سائٹ میں ایک صابن ساز فیکٹری تھی جس کا نام ''جیلانی سوپ انڈسٹری'' تھا۔ اس فیکٹری میں بیوٹی (ایک فرضی نام۔ اصل نام بہ وجوہ ظاہر نہیں کیا جا سکتا) ٹوائلٹ سوپ تیار ہوتا تھا۔ یہ اگرچہ ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی مگر انور جیلانی کا بزنس خوب چل رہا تھا۔ مقامی طور پر تیار ہونے والے تمام باتھ سوپ کی بہ نسبت ''بیوٹی ٹوائلٹ سوپ'' کی زیادہ مانگ تھی۔ ملزم صفدر علی اسی فیکٹری میں اکاؤنٹنٹ و کیشئر کی حیثیت سے ملازم تھا۔

صفدر علی کی گرفتاری کے بعد اس کے گھر میں بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نزہت نے گھریلو اخراجات میں سے بچا کر جو جمع جوڑ کیا تھا وہ پولیس کی نذر ہو گیا۔ پھر گھر کا سامان فروخت ہونے لگا تاکہ عدالت کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ غریب کے گھر میں بکنے کے لیے ہوتا ہی کیا ہے' پھر بھی نزہت نے فریج اور ٹی وی وغیرہ اونے پونے داموں فروخت کر دیے اور کچھ عرصے تک عدالتی رگڑ برداشت کرتی رہی لیکن آخر کار اس کی ہمت جواب دے گئی۔

سیشن کورٹ میں صفدر علی نے کوئی وکیل نہیں کیا تھا کیونکہ نزہت کے پاس رقم ختم ہو چکی تھی۔ مکان کرائے کا تھا۔ اب آ جا کر نزہت کے پاس کچھ زیورات باقی بچتے تھے۔ اس نے اپنے شوہر سے مشورہ کیا کہ وہ زیورات کو بیچ کر کوئی اچھا سا وکیل کرنا چاہتی ہے لیکن صفدر علی نے صاف انکار کر دیا اور نزہت کو تاکید کی کہ وہ زیورات کو فروخت کرنے کے بارے میں کبھی سوچے بھی نہیں۔ صفدر علی کا مؤقف تھا کہ اس نے اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے...... اسے قدرت کے انصاف پر بھی پورا بھروسا تھا۔

عدالت کو جب ملزم کے مالی حالات کا علم ہوا تو اس نے سرکار کی طرف سے صفدر علی کے لیے ایک وکیل صفائی کا بندوبست کر دیا۔ اس وکیل کا نام رفیق باجوہ تھا۔ نزہت نے اطمینان کی سانس لی کہ اب اس کا شوہر جلد از جلد رہا ہو کر اس کے پاس آ جائے گا لیکن ہوا اس کے بالعکس۔

ایک تو سرکار کا فراہم کردہ وکیل رفیق باجوہ انتہائی ناتجربے کار تھا۔ اس پر وہ بدنیت بھی ثابت ہوا۔ ملزم صفدر علی کو باعزت بری کروانا تو رہا ایک طرف' وہ تو مخالف پارٹی سے اپنی جیب گرم کر کے

ملزم کو پھانسی پر لٹکانے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔

حالات کی اس تیزی سے بدلتی ہوئی صورت نے نزہت بیگم کو پریشان کر دیا۔ کسی ہمدرد نے اسے پرخلوص مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے شوہر کو بچانا چاہتی ہے تو اس سرکاری وکیل سے جان چھڑا لے ورنہ وہ تو ملزم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر ہی دم لے گا۔ نزہت نے دو چار اچھے وکیلوں سے رابطہ کیا لیکن ان کی فیسیں اور دیگر عدالتی اخراجات کا تخمینہ دیکھ کر نزہت کے ہوش اڑ گئے۔ اب زیورات بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ وہ شوہر کے علم میں لائے بغیر اپنے اچھے وقتوں میں بنائے ہوئے تمام زیورات لے کر سیٹھ رمضان کی دکان پر پہنچ گئی۔ سیٹھ رمضان نے نہ صرف اسے مارکیٹ سے زیادہ ریٹ دیا۔ بلکہ یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے شوہر کے کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملے اور اب وہ دونوں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

اپنے طویل بیان کو ختم کرنے کے بعد سیٹھ رمضان بھائی نے اپنی جیب سے ایک کراس چیک نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور بولا۔

''یہ اتنی ہی رقم کا چیک ہے جو دو سال پہلے آپ نے مجھ سے لی تھی۔ میرے کو معلوم ہے بیگ صاحب' ان دو سال میں آپ نے اپنی فیس میں بھی اضافہ کر دیا ہوگا لیکن میں آپ کو بس یہی رقم دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''فیس لینے یا نہ لینے کا فیصلہ تو ابھی نہیں ہوسکتا۔''

''یہ فیصلہ آپ کیس لینے کے بعد کرو گے۔ ہیں نا!''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سیٹھ رمضان بولا۔ ''بیگ صاحب! کوئی بات نہیں۔ آپ یہ چیک اپنے پاس بطور ایڈوانس فیس رکھ لو۔ اگر آپ نے کیس لینے کے حق میں فیصلہ کیا تو اس چیک کو اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا لینا۔ دوسری صورت میں واپس دے دینا۔ ٹھیک ہے؟''

''آپ کی بات معقول ہے رمضان بھائی۔''

میں نے چیک لے کر اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور ایک رسید بنا کر سیٹھ رمضان کے حوالے کر دی۔

وہ رسید کو جیب میں رکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! اب میرے کو اجازت دو۔ نزہت بی بی کی ضد پر میں ادھر آ گیا تھا۔ ابھی میرے پاس دکان میں ایک بہت اہم پارٹی آنے والی ہے۔ باقی تفصیل آپ نزہت سے پوچھ لیں۔ ویسے میں بھی گاہے بہ گاہے آپ سے رابطہ رکھوں گا۔''

سیٹھ رمضان میرے کمرے سے باہر نکل گیا تو میں نزہت بیگم کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''ہاں خاتون! اب آپ مجھے اس کیس کی تفصیل بتائیں۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال

لیا۔

نزہت بیگم کافی دیر تک خیالوں میں کھوئی رہی پھر شکستہ لہجے میں بولی۔ ''زیادہ تفصیلات تو مجھے بھی معلوم نہیں ہیں لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ صفدر بے گناہ ہے۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔''

''آپ کو جس حد تک معلوم ہے' وہ بیان کریں۔''

''مجھے اپنے خدا پر پورا اعتماد ہے۔'' نزہت نے کہنا شروع کیا۔ ''صفدر ایک نہ ایک دن ضرور باعزت رہا ہو جائے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گئی پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس نے جو ادھوری معلومات مجھے فراہم کیں وہ خاصی نامکمل اور الجھی ہوئی تھیں۔ اپنی گفتگو کے اختتام پر اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! صفدر کے سوا اس دنیا میں' میرا اور نوشین کا اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ صفدر اور بہت کچھ کر سکتا ہے مگر کسی کی جان لینا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کی رہائی کے لیے خلوصِ دل سے کوشش کریں گے۔''

''میں اپنے ہر مؤکل کے لیے خلوص دل ہی سے کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''بشرطیکہ مجھے اپنے مؤکل کی بے گناہی کا یقین ہو جائے۔''

وہ امید افزا نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کی بیٹی نوشین آپ کے ساتھ نہیں آئی؟''

''میں اسے اپنے پڑوس میں چھوڑ کر آئی ہوں۔'' نزہت نے بتایا۔ وہ صفدر کی گرفتاری کے بعد سے بہت ہراساں رہنے لگی ہے۔ میں جب بھی کورٹ جاتی ہوں تو اسے پڑوس والوں کے یہاں چھوڑ جاتی ہوں۔ صفدر تو مجھے بھی کورٹ جانے سے منع کرتا ہے لیکن کیا کروں' مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ ایک سال سے زیادہ ہونے کو آیا ہے اور ابھی تک صفدر کی رہائی کے سلسلے میں کچھ نہیں کر پائی ہوں اب آپ......''

''قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اور اب بھی وضاحت کر دوں کہ جب تک مجھے اس کیس کی اصل صورتِ حال کا اندازہ نہیں ہو جاتا' میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

''سیٹھ صاحب نے تو مجھے بہت یقین دلایا تھا کہ آپ......''

''سیٹھ صاحب کا کہنا بھی درست ہے۔'' میں نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور خود کہا۔ ''آپ سر دست مجھے یہ بتائیں کہ آئندہ تاریخ کب ہے۔ میں ملزم سے ملنے کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کر سکوں گا۔''

نزہت نے بتایا۔ ''اگلی تاریخ منگل کو ہے۔''

میں نے ٹیبل کیلنڈر کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔ منگل میں ابھی چار روز باقی تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے نزہت سے کہا۔ ''آپ ایسا کریں' منگل کے روز عدالت میں آ جائیں۔ میں آپ کی موجودگی میں آپ کے شوہر ملزم صفدر علی سے ملاقات کرلوں گا اور اگر میں نے کیس لینے کا فیصلہ کرلیا تو اسی روز چند ضروری کاغذات پر صفدر علی سے دستخط بھی کروالوں گا۔''

وہ تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر مذکورہ روز عدالت میں آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی۔ میں اپنے دوسرے کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

❀ ❀ ❀

منگل کو میرا صرف ایک کیس زیر سماعت تھا لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر عدالتی کارروائی عمل میں نہ آ سکی اور جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے دی۔ میں عدالت کے کمرے سے نکل کر اس عدالت کی طرف آ گیا جہاں صفدر علی کا کیس لگا ہوا تھا۔ ایک سال گزر جانے کے باوجود بھی ابھی تک کوئی قابل ذکر کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی۔ اس دوران میں صفدر علی جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں تھا۔

لگ بھگ نو بجے صفدر علی جیل کی گاڑی میں' احاطۂ عدالت میں پہنچا۔ نزہت پہلے سے وہاں موجود تھی اور متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس نے سکون کی سانس لی پھر مجھے بتایا۔ ''صفدر علی ابھی ابھی اس گاڑی سے اترا ہے۔'' اس نے جیل کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے صفدر علی کا بغور جائزہ لیا۔ اس کی عمر کم و بیش پینتیس سال تھی مگر وہ اپنی عمر سے دس سال زیادہ کا لگتا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ویرانی خیمہ زن تھی۔ اس کی مجموعی حالت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ میں نزہت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ گیا۔

وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک غیر مرد کو دیکھ کر چونکا پھر اس کی نظر میرے کوٹ پر پڑی تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا تاہم اس نے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے برہمی سے کہا۔

''نزہت! میں تمہیں کتنی بار منع کر چکا ہوں کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔''

''جانتی ہوں' تمہیں میرا عدالت میں آنا اچھا نہیں لگتا۔'' نزہت نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہیں بے یار و مددگار بھی تو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''تم میرے لئے کچھ نہیں کر سکتی ہو نزہت۔'' وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔ ''پھانسی کا پھندا میرا مقدر ٹھہر چکا ہے۔''

''ایسی بدفالیں منہ سے نہ نکالو۔ انشاء اللہ تم باعزت بری ہو جاؤ گے۔''

''تم یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو نزہت۔'' صفدر علی خواب ناک لہجے میں بولا۔ ''یہ دنیا اور اس دنیا

کی عدالتیں پیسے والوں کی ہیں۔ ہمارے پاس تو اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ کوئی ڈھنگ کا وکیل ہی کرسکیں اور تم میری باعزت بریت کی باتیں کر رہی ہو؟''

''میں نے آپ کے لیے ایک چوٹی کے وکیل کا بندوبست کیا ہے۔''

''کوئی چوٹی کا وکیل مفت میں کیس نہیں لڑتا۔'' صفدر علی نے طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں آپ سے اس کیس کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔''

''اور آپ کی فیس؟'' صفدر علی نے پہلے مجھے اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

نزہت نے مصلحت کوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فیس میں نے بیگ صاحب کو دے دی ہے۔''

''تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟''

''میں نے زیور بیچ دیا ہے۔'' نزہت نے سر جھکا دیا۔

صفدر علی کا چہرہ مزید بجھ گیا' ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تو تم نے میری بات نہیں مانی!''

''میں اور کیا کرتی۔'' نزہت روہانسی ہوگئی۔ ''زیور تمہاری زندگی سے زیادہ اہم تو نہیں ہے۔ تم باعزت بری ہو کر گھر آ گئے تو انشاء اللہ زیور دوبارہ بن جائے گا۔ تمہارے بغیر میں زیور کا کیا کروں گی۔ تم تو میرا اور نوشین کا آخری سہارا ہو۔''

''یہی بات تو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' صفدر علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں کا یہ آخری سہارا اب چھننے ہی والا ہے۔ تم نے اپنا زیور بیچ کر سنگین ترین غلطی کی ہے۔ میں تو بچنے والا نہیں ہوں۔''

''مایوسی گناہ ہے صفدر۔'' نزہت اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بیگ صاحب بہت بڑے وکیل ہیں۔ تم اللہ کے گھر سے امید رکھو۔ مجھے یقین ہے کہ بیگ صاحب تمہارا کیس جیت جائیں گے۔ تم بے گناہ ہو۔ عدالت تمہیں باعزت بری کر دے گی۔''

''تم پتا نہیں' کس جہان کی باتیں کر رہی ہو!''

میں نے کہا۔ ''مسٹر صفدر! مجھے آپ کے احساسات کا بخوبی اندازہ ہے۔ اگر آپ واقعی بے گناہ ہیں تو پھر آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اگر آپ مجھے تمام واقعات تفصیل سے سنائیں تو ممکن ہے' میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔ اگر مجھے یقین ہوگیا کہ آپ قاتل نہیں ہیں تو یہ میرا آپ سے وعدہ رہا کہ میں آپ کا مقدمہ جیتنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

''رفیق باجوہ بھی مجھے ایک عرصے سے یہی تسلی دیتا آیا ہے۔''

رفیق باجوہ اس وکیل کا نام تھا جو سرکار کی طرف سے صفدر علی کو فراہم کیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔

’’صفدر علی‘ مجھے پتا چلا ہے کہ رفیق باجوہ نے آپ کی رہائی کے بجائے آپ کو پھنسانے کی زیادہ کوششیں کی ہیں؟‘‘

وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔’’میری سمجھ میں نہیں آتا‘ کس پر اعتبار کروں اور کسے جھوٹا سمجھوں!‘‘

میں نے کہا۔’’میں نے سنا ہے‘ آپ کا وکیل رفیق باجوہ مخالف پارٹی کے ساتھ مل گیا ہے اور اسی کے اشاروں پر ناچ رہا ہے؟‘‘

’’مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سب لوگ مل کر مجھے پھانسی دلوانے کی کوششوں میں مصروف ہوں۔ مجھے تو ایک چہرہ بھی اپنا نظر نہیں آتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب کوئی مجھے بچا نہیں سکے گا۔ وہ وکیلِ صفائی ہو یا وکیلِ استغاثہ۔ مجھے ہر حال میں داعیِ اجل کو لبیک کہنا ہے۔ ایک حسرت ناک موت میرے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔‘‘

نزہت نے تڑپ کر کہا۔’’تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ میرا کلیجا کٹتا ہے۔ اگر تم نے بھی حوصلہ ہار دیا تو ہمارا کیا بنے گا۔‘‘ وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھنے کے بعد بولی۔’’جب تک میں زندہ ہوں‘ تمہیں یوں موت کے منہ میں نہیں جانے دوں گی۔ میں تمہاری رہائی کے لیے اپنی سی پوری کوشش کروں گی۔ تم بیگ صاحب کو تمام حالات بتا دو۔‘‘

صفدر علی نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔’’ٹھیک ہے‘ آپ کو بھی ٹرائی کر لیتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔’’صفدر علی‘ میں آپ کی بیوی سے جو کچھ معلوم کر چکا ہوں وہ معلومات ادھوری اور نامکمل ہیں بلکہ الجھی ہوئی ہیں۔ بعض باریک اور اہم باتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ اب تم مجھے پوری تفصیل سے سارے واقعات سناؤ۔ شروع سے آخر تک۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نظر انداز نہیں کرنا۔‘‘

میرے حوصلہ افزا رویے سے اس کے چہرے پر امید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ اس نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں پھر تشویش ناک لہجے میں بولا۔’’وہ رفیق باجوہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔‘‘

میں نے کہا۔’’فی الحال آپ اسے بھول جائیں۔‘‘

’’مگر میرا کیس تو وہی لڑ رہا ہے!‘‘

نزہت نے کہا۔’’اب تمہارا کیس بیگ صاحب لڑیں گے۔‘‘

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔’’صفدر علی‘ آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ کی کہانی سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ آپ بے گناہ ہیں تو میں پہلی فرصت میں یہ کیس لے لوں گا۔ پھر رفیق باجوہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔‘‘

’’جناب‘ اگر آپ کو میری بے گناہی کا یقین آ بھی گیا تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ عدالت بھی مجھے بے گناہ سمجھ کر رہائی کا حکم جاری کر دے گی؟‘‘

میں نے کہا۔’’عدالت میں ہر بات ثابت کرنا پڑتی ہے صفدر صاحب! اگر مجھے آپ کے بے قصور ہونے کا یقین آ جائے گا تو میں آپ کو عدالت میں بے گناہ ثابت بھی کر کے دکھا دوں گا۔‘‘

وہ خاموش نظروں سے نزہت کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا‘ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

صفدر علی کے ساتھ آنے والا سپاہی بہت بدمزہ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ برداشت کرتا رہا پھر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔’’وکیل صاحب! آپ اپنی بات جلد ختم کریں۔ قانون ملزم سے لمبی چوڑی باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔‘‘

میں نے سپاہی کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔’’میں قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی ملزم سے بات کر رہا ہوں۔‘‘ پھر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں اضافہ کیا۔’’کیا مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ قانون کی کون سی دفعہ اس قسم کی اجازت مرحمت فرماتی ہے۔‘‘

’’جی!‘‘ اس نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔’’کیا قانون میں کوئی ایسی دفعہ بھی موجود ہے؟‘‘

میں نے ایک آنکھ دباتے ہوئے ذو معنی انداز میں کہا۔’’ہاں‘ قانون میں ایسی ایک دفعہ موجود ہے......دفعہ ایک سو۔‘‘

’’کیا مطلب ہے جی آپ کا؟‘‘ اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

میں نے اپنے پرس میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر سپاہی کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔’’دفعہ ایک سو کا پتا چلا۔ کیا اس دفعہ کے تحت میں ملزم صفدر علی سے کچھ کام کی بات چیت کر سکتا ہوں؟‘‘

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔’’حضور‘ ذرا جلدی بات چیت کر لیں۔ کسی وقت بھی ہمارے مقدمے کی آواز پڑ سکتی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔’’ملزم کا وکیل کہیں نظر نہیں آ رہا ہے!‘‘

’’ہاں نظر تو مجھے بھی نہیں آ رہا۔‘‘ سپاہی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں صفدر علی اور سپاہی کو لے کر ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا پھر اپنا بریف کیس کھول کر رف پیڈ نکال لیا۔’’ہاں تو صفدر صاحب! اب شروع ہو جائیں وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔‘‘ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا۔

صفدر علی گھبراہٹ آمیز نظروں سے اپنی بیوی نزہت کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا‘

شاید وہ اپنی بیوی کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے نزہت کو اشارے سے سمجھایا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے دوسری بینچ پر جا کر بیٹھ جائے۔

نزہت کے جانے کے بعد صفدر علی نے اطمینان کی سانس لی اور دو منٹ کے توقف کے بعد اپنی داستان سنانا شروع کر دی۔

اس کی داستان کے اختتام تک میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ بے گناہ تھا۔ وہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت شکار کیا گیا تھا جس میں اس کی اپنی حماقتوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ بہرحال' میں نے اس کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے بریف کیس کھولا اور پہلے سے تیار شدہ کچھ کاغذات نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ ''ان پر دستخط کر دیجیے صفدر صاحب!''

''یہ کیسے کاغذات ہیں؟'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''ایک تو وکالت نامہ ہے اور دوسری ایک درخواست ہے۔''

اس نے درخواست کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے بتایا۔ ''یہ رفیق باجوہ کے وکالت نامے کی منسوخی کی درخواست ہے۔''

اس کے چہرے پر خوشی چمک اٹھی۔ ''گویا' آپ نے میرا مقدمہ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس نے جذبات سے مغلوب آواز میں پوچھا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کو میری بے گناہی کا یقین آ گیا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ صفدر علی نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے قلم تھاما اور ضروری مقامات پر دستخط کر دیے۔ میں نے جلدی جلدی انتہائی ضروری اندراجات کیے اور عدالت کے کمرے میں جا کر دونوں کاغذات جمع کرا دیے۔ اس وقت تک صفدر علی کے کیس کی باری نہیں آئی تھی۔ میں نے پیش کار سے اس کیس کا نمبر معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس سے پہلے آٹھ کیس تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آج مقررہ عدالتی وقت کے دوران میں کسی بھی صورت اس کیس کی باری نہیں آ سکتی تھی۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور عدالت کے کمرے سے باہر آ گیا۔ جب میں صفدر علی کے پاس پہنچا تو وہاں ایک عجیب سا منظر میرا منتظر تھا۔ صفدر علی ایک ناٹے قد کے وکیل کے ساتھ کسی بات پر الجھ رہا تھا۔ وہ وکیل خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی صفدر علی نے کہا۔ ''رفیق صاحب آپ خود بیگ صاحب سے بات کر لیں۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ آپ مجھے اور پریشان نہ کریں۔''

رفیق باجوہ نے کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا پھر غصیلے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تو آپ صفدر علی کے نئے وکیل ہیں؟''

''میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ کا یہ انداز

صدفی صد درست ہے کہ اب میں ہی صفدر علی کی جانب سے وکیل صفائی کا کردار ادا کروں گا۔''

وہ کچھ دیر تک تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا پھر بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''میں قریب ایک سال سے یہ کیس لڑ رہا ہوں۔ آپ کو یہ کیس لینے سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لینا چاہیے تھا۔''

''مشورہ اب بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے ذہن میں یہ بات نقش تھی کہ رفیق باجوہ ایک بھاری رقم وصول کر کے مخالف پارٹی سے جا ملا تھا۔ گزشتہ ایک سال کے دوران میں اس نے مخالف پارٹی کے حسب منشا اپنے مؤکل کو بچانے کے بجائے پھنسانے کی زیادہ کوشش کی تھی۔ ایسے مردہ ایمان اور ضمیر فروش شخص سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ ابھی نیا نیا وکالت کے پیشے میں آیا تھا اور اس نے اپنے پیشے کا آغاز ہی خاصے غیر انسانی انداز میں کیا تھا۔ میں جب عدالت کے کمرے میں تھا تو صفدر علی اور نزہت بیگم کی زبانی رفیق باجوہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ صفدر علی کا مقدمہ اب میں لڑوں گا۔ وہ اپنی برطرفی کی وجہ سے خاصا برہم تھا۔

''ہوں' مشورہ اب بھی ہو سکتا ہے۔'' اس نے پُر خیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے میرے الفاظ دہرائے۔

میں نے کہا۔ ''مسٹر رفیق باجوہ! آج تو اس کیس کی باری آنے کی مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ تصدیقی لہجے میں بولا۔ ''اگر کسی طرح اس کیس کی باری آ بھی گئی تو کارروائی نہیں ہو سکے گی کیونکہ ابھی تک مجھے کوئی گواہ نظر نہیں آ رہا۔ آپ یہ بتائیں' آپ سے مشورہ کس صورت ہو سکے گا؟''

''آپ آج ہی میرے دفتر آ جائیں۔'' میں نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ آپ مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ رفیق باجوہ خاصا نروس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کارڈ لے کر اپنی جیب میں ڈالا اور بولا۔ ''میں دوپہر کے بعد آپ کے دفتر آؤں گا۔ بہت ضروری باتیں کرنا ہیں آپ سے۔''

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ رفیق باجوہ کے جانے کے بعد نزہت نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔ اس کے لہجے میں تشویش کے ساتھ گھبراہٹ بھی تھی۔

''بیگ صاحب! وہ آپ سے کون سی ضروری باتیں کرنا چاہتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو اس سے ملاقات کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔''

''آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے نا کہ وہ مخالف پارٹی سے ملا ہوا ہے۔'' وہ الجھے ہوئے انداز میں

بولی۔ میں اس کی الجھن کا سبب سمجھ رہا تھا۔ شاید اسے یہ خوف لاحق تھا کہ رفیق باجوہ مجھے بھی کوئی الٹی سیدھی پٹی نہ پڑھا دے۔

میں نے کہا۔ ''نزہت بیگم! آپ اپنے دل سے ہر خوف اور اندیشہ نکال دیں۔ میں رفیق باجوہ کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ انشاءاللہ میں اس سے اپنے مطلب کی باتیں ہی معلوم کروں گا۔''

میرے تشفی آمیز انداز نے اسے حوصلہ بخشا اور وہ ممنونیت آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں پیش کار سے مل کر تاریخ لے لیتا ہوں۔ انشاءاللہ آئندہ تاریخ پر اسی جگہ ملاقات ہوگی۔''

نزہت نے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! مجھے یہ بات کس طرح معلوم ہوگی کہ رفیق باجوہ کے ساتھ آپ کی ملاقات کا نتیجہ کیا رہا؟''

''اس کے لیے آپ کل دوپہر کے بعد میرے دفتر آجائیں۔''

''ہاں' یہی ٹھیک رہے گا۔'' وہ مطمئن انداز میں بولی۔

میں جب اپنے دفتر پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ میری سیکریٹری نے لنچ کا پوچھا تو میں نے انکار کردیا۔ دو بجے کے قریب رفیق باجوہ مجھ سے ملنے آگیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! مجھے حیرت ہے کہ آپ نے یہ کیس کیوں لے لیا؟''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے مسٹر باجوہ؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کے پاس سے رخصت ہونے کے بعد اب تک سارا وقت آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں گزارا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا معلومات حاصل ہوئیں؟''

''آپ تو ماشاءاللہ بہت اونچے درجے کے وکیل ہیں۔'' رفیق باجوہ نے مرعوب لہجے میں کہا۔ ''یہ خستہ حال پھٹیچر شخص تو آپ کی فیس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جو شخص ایک سال سے سرکار کے فراہم کردہ وکیل پر قناعت کیے بیٹھا ہو وہ آپ کی ہوش ربا فیس کہاں سے ادا کرے گا...... اور مجھے آپ کے بارے میں یہ بات بھی پتا چلی ہے کہ آپ فیس کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں ہیں۔''

اپنی بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا' میں نے کہا۔ ''آپ نے میرے بارے میں سب کچھ ٹھیک سنا ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے اپنی فیس وصول کرنے کے بعد ہی کام کا آغاز کیا ہے...... اور اسے انجام تک پہنچانے کے بعد ہی دم لوں گا۔''

''بات صرف فیس تک ہی محدود نہیں ہے بیگ صاحب!'' رفیق باجوہ نے کہا۔ ''اس کیس کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں۔''

''مثال کے طور پر؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کیس میں کوئی جان نہیں ہے۔''

''یعنی آپ ایک سال کی ''محنت'' سے اس کیس کو بے جان بنا چکے ہیں؟'' میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ ''مسٹر باجوہ! میں نے آپ کی شہرت کے بارے میں کچھ باتیں سنی ہیں۔''

''لوگوں کا منہ بند نہیں کیا جاسکتا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''لوگ تو باتیں بناتے ہی رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''رائی ہو تو پربت بنتا ہے۔ میں نے سنا ہے' آپ ایک تگڑی رقم لے کر مخالف پارٹی سے مل گئے ہیں؟''

''یہ جھوٹ ہے۔'' اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''پھر سچ کیا ہے؟''

''سچ یہ ہے کہ یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہے۔ ملزم کے بچنے کے امکانات معدوم ہیں۔ واقعات اور شہادتیں سراسر اس کی مخالفت میں جاتی ہیں۔ اگر ان حالات میں' میں ملزم کو بچانے کے لیے کوئی قابل ذکر کارکردگی نہیں دکھا پا رہا ہوں تو میرے بارے میں یہ مشہور کردیا گیا ہے کہ میں رشوت لے کر مخالف پارٹی سے مل گیا ہوں اور ملزم کو پھانسی کے تختے تک پہنچانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔''

میں نے اس کی جذباتی تقریر سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''کیا آپ کو یقین ہے کہ ملزم قاتل ہے اور وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا؟''

''جی ہاں' میرا خیال تو یہی ہے۔''

میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر باجوہ! جب آپ کو اپنے مؤکل کی بے گناہی کا یقین ہی نہیں ہے تو اس کا کیس آپ خاک لڑیں گے۔ آپ کو تو بہت پہلے اس کیس سے دستبردار ہوجانا چاہیے تھا۔''

وہ چہرے پر ندامت کے تاثرات سجاتے ہوئے بولا ''دراصل ضروریات انسان کو مجبور کردیتی ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ آج کل ہاتھ بہت تنگ جا رہا ہے۔''

''اوہ۔ آئی سی۔'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''اسی لیے آپ نے اپنے تنگ ہاتھ کو دراز کرنے کے لیے مخالف پارٹی کے سامنے پھیلایا تھا؟''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں!'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر باجوہ! میں تو صرف یہ سمجھ سکا ہوں کہ آپ نے اپنے مؤکل کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ چند نوٹوں کی خاطر آپ نے ایک بے گناہ شخص کو موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔''

''آپ خواہ مخواہ غصہ نہ دکھائیں بیگ صاحب!'' وہ ندامت کا اظہار کیے بغیر بولا۔ ''آپ

جب اس کیس کو اسٹڈی کریں گے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ملزم کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے پھانسی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ جب اسے مرنا ہی ہے تو کچھ میرا بھلا ہو جائے گا تو اس میں آخر خرابی کیا ہے۔''

میرے جی میں تو آئی کہ اسے دھکے دے کر اپنے دفتر سے نکال دوں لیکن میں نے برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ''رفیق باجوہ! تمہارے جیسے وکیلوں نے اس مقدس پیشے کو خاصا بدنام کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے' تم یہ پیشہ چھوڑ کر ''مردہ فروشی'' شروع کر دو۔''

اگر رفیق باجوہ میں رتی برابر بھی شرم یا غیرت ہوتی تو وہ میرے ان الفاظ کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین میں گڑ جاتا لیکن اس کا خمیر جس مٹی سے اٹھا تھا اس کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کے ہر پیشے اور شعبے کی طرح ''وکالت'' میں بھی چند کالی بھیڑیں پائی جاتی ہیں جو اس پیشے کے سینے کا داغ ہیں۔

میں نفرت انگیز نظروں سے رفیق باجوہ کو گھور رہا تھا کہ وہ منافقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کسی مشورے کا ذکر کیا تھا بیگ صاحب!''

''کیسا مشورہ۔''

اس نے مجھے یاد دلانے کی کوشش کی۔ ''آپ نے کہا تھا...... مشورہ اب بھی ہو سکتا ہے۔'' اس کی نگاہوں میں طمع کی چمک تھی' ''میں اسی سلسلے میں تو حاضر ہوا ہوں۔''

''ذرا کھل کر بتاؤ' آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''سیدھی سی بات ہے بیگ صاحب!'' وہ بالکل کاروباری انداز میں گویا ہوا۔ ''آپ میرے منہ کا نوالہ چھین رہے ہیں۔ اب یہ کیس آپ لڑیں گے۔ میں تو سراسر نقصان میں رہا۔ میرے ساتھ یہ زیادتی تو نہیں ہونا چاہیے نا۔ آخر ایک سال تک میں نے اس کیس پر کام کیا ہے۔''

اس کی لالچی فطرت کو زبان مل گئی تھی۔ اگرچہ مجھے اس کی باتیں انتہائی ناگوار گزر رہی تھیں لیکن میں یہ سب کچھ محض اسی لیے برداشت کر رہا تھا کہ ممکن تھا' اس دوران میں کوئی ایسی کام کی بات معلوم ہو جاتی جو بعد ازاں میرے لیے مفید و معاون ثابت ہوتی۔

میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ نے نوالہ چھینا ہے تو آپ ہی میرا پیٹ بھریں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ پھر اس نے اپنی گود میں رکھی ہوئی فائلوں کو تھپتھپاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''ان میں ملزم اور میرے سابق مؤکل صفدر علی کی فائل بھی موجود ہے۔ آپ مجھ سے اس فائل کا سودا کر لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے بہت کارآمد اور معلومات افزا ثابت ہو گی۔''

''ان معلومات سے تم نے کوئی فائدہ کیوں نہیں اٹھایا؟''

''بس اپنے اپنے تجربے کی بات ہے۔'' وہ نہایت ہی بھونڈے انداز میں مسکرایا۔ ''میں اس

فیلڈ میں نیا ہوں۔ میری ناکامی کا سبب میری کم علمی اور اناڑی پن بھی ہو سکتا ہے۔ آپ ایک تجربے کار اور منجھے ہوئے وکیل ہیں۔ قطرے کو سمندر اور نقطے کو داستان بنا سکتے ہیں۔ آپ یہ فائل مجھ سے خرید لیں۔ اسی طرح کچھ میرا بھی بھلا ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا' ''تمہاری ڈیمانڈ کیا ہے؟''

اس نے ایک رقم بتائی۔ میں نے کہا۔ ''یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

وہ بولا۔ ''آپ اپنی آفر بتائیں۔''

میں اس قسم کی باتیں دراصل اسے گھسنے کے لیے کر رہا تھا۔ اسی طرح بعض اوقات بہت مفید باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے رویے اور باتوں سے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی تجویز میرے لیے خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کے جھانسے میں آ رہا ہوں تو میں نے اپنی آفر کے طور پر ایک نہایت ہی معمولی رقم بتا دی۔

''بیگ صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ تو دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو تمہاری مرضی۔ مجھے تمہارے حالات کا سن کر خیال آ گیا تھا ورنہ یہ فائل میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ویسے ایک بات تھی۔ رفیق باجوہ خاصا ہوشیار اور چالاک شخص تھا۔ اس میں منفی ذہانت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ میرے ذہن میں ایک فوری خیال نے سر ابھارا۔ میں نے سوچا' میں اس کیس میں رفیق باجوہ کو کسی اور طریقے سے بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ ایسے شاطر اور مکار لوگوں کو اگر ڈھنگ سے کنٹرول کیا جائے تو بڑے اچھے اور سودمند نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ میں نے آؤٹ ڈور بھاگ دوڑ کے لیے رفیق باجوہ کو اپنا آلۂ کار بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

''مسٹر رفیق باجوہ!'' میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''اس فائل کو تم فی الحال بھول جاؤ۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک تجویز ہے۔ تمہارے ہاتھ کی تنگی بھی دور ہو جائے گی اور تمہیں اس فیلڈ میں کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملے گا۔''

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ایسی کون سی تجویز ہے آپ کے پاس؟''

''تم آج سے میرے لیے کام کرنا شروع کر دو۔'' میں نے کہا۔

''کیسا کام؟''

''تفصیلات میں مت جاؤ۔ میں تم سے کوئی غلط کام نہیں لوں گا۔'' میں نے سرزنش آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم فی الحال آموں پر دھیان دو' پیڑ گننے کا تکلف نہ کرو۔ میں تمہیں اس کام کے لیے معقول رقم دوں گا۔''

پھر میں نے اسے کام کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کیں۔ وہ فی الفور تیار ہو گیا۔ میں نے

بطور ایڈوانس اسے کچھ رقم دی اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ جاتے ہوئے وہ صفدر علی کے مقدمے کی فائل بھی میرے پاس چھوڑ گیا تھا۔

میں نے رفیق باجوہ سے جس قسم کا کام لینے کا فیصلہ کیا تھا' میرے خیال میں وہ اس کام کے لیے خاصا مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی میری یہ خواہش بھی تھی کہ اگر ممکن ہو سکا تو میں اس کی کچھ مثبت تربیت کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ اگر وہ اچھا وکیل نہیں بن سکتا تھا تو نہ بنتا' کم از کم بُرا وکیل بن کر اس پیشے کو رسوا تو نہ کرتا۔ میں نے ممکنہ طور پر اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

چھ بجے کے بعد میرے موکلوں کا تانتا ٹوٹا تو میں صفدر علی کی فائل کھول کر بیٹھ گیا۔ اس فائل کے مطالعے' ملزم صفدر علی سے طویل بات چیت' پہلے اور بعد میں پیش آنے والے واقعات اور حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں جو حقائق میرے علم میں آئے۔ میں ان میں سے غیر ضروری باتوں کی تفصیل کو حذف کر کے خلاصۂ حالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

❁ ❁ ❁

''جیلانی سوپ انڈسٹری'' اگرچہ ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی مگر اس کا کاروبار اچھا خاصا تھا۔ انور جیلانی کی قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ قدرت نے ایک طرف اگر اسے گھریلو آسودگی سے محروم رکھا تھا تو دوسری جانب معاشی طور پر اسے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔ انور جیلانی کی رہائش نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں تھی۔ وہ چار سو گز کے ایک عالی شان بنگلے میں تنہا رہتا تھا۔ اس کی بیوی نادرہ جیلانی کا دو سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک طویل ازدواجی زندگی گزاری تھی مگر اولاد ایسی نعمت سے محروم رہے تھے۔ نادرہ کی وفات کے بعد انور جیلانی اکیلا رہ گیا تھا۔ وسیع و عریض بنگلے میں اس کے علاوہ صرف ایک چوکیدار تھا۔ صنوبر خان نامی وہ چوکیدار کل وقتی ملازم تھا اور اس کی رہائش بنگلے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ایک کوارٹر میں تھی۔

ملزم صفدر علی کو انور جیلانی کی فیکٹری میں کام کرتے ہوئے کم و بیش آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس کا ریکارڈ بہت اچھا تھا اس لیے انور جیلانی اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ پہلے وہ صرف اکاؤنٹس کے شعبے سے متعلق تھا۔ بعد ازاں انور جیلانی نے کیش کا شعبہ بھی اسے سونپ دیا تھا۔ صفدر علی پر انور جیلانی کے بھروسے کا یہ عالم تھا کہ اگر اسے کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جانا پڑتا تو وہ چند سادہ چیک سائن کر کے اس کے حوالے کر جاتا تھا تاکہ فیکٹری کا سرکل متاثر نہ ہو۔ ویسے بھی فیکٹری کا ماہانہ ٹرن اوور آٹھ دس لاکھ کے قریب تھا جس کا بیشتر حصہ کیش کی صورت میں ہوتا تھا۔ یہ سارا کیش صفدر علی کے ہاتھ سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ بعض اوقات دو تین روز کے بعد کیش کو بینک میں جمع کرواتا' کبھی اس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی۔

انور جیلانی کا اصول تھا کہ کم از کم عملے سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے یہی وجہ تھی کہ اس کی

فیکٹری میں ہر شخص دو یا دو سے زیادہ کام کر رہا تھا۔ انور جیلانی کا چھوٹا بھائی اصغر جیلانی بھی فیکٹری کے اسٹاف میں شامل تھا۔ وہ بیک وقت پروڈکشن منیجر' کوالٹی کنٹرولر اور مارکیٹنگ منیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا تھا۔ تنخواہ کے رجسٹر کے مطابق اسے فیکٹری دس ہزار روپے بطور تنخواہ دیتی تھی۔ ممکن ہے' اس کے علاوہ بھی انور جیلانی اپنی جیب خاص سے چھوٹے بھائی کی مدد کرتا ہو۔

فیکٹری کی سب سے اہم اور دلچسپ ورکر ایک عیسائی لڑکی تھی۔ نازیہ نامی یہ لڑکی بیک وقت بہت کچھ تھی۔ وہ اپنے باس انور جیلانی کی سیکریٹری تھی' آفس اسسٹنٹ تھی' ٹائپسٹ تھی اور ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ وہ ''جیلانی سوپ انڈسٹری'' میں کام کرنے والی واحد لڑکی تھی۔ نازیہ ناز کی رہائش گارڈن ویسٹ کے ایک فلیٹ میں تھی جہاں وہ تنہا رہتی تھی۔ عام عیسائی لڑکیوں کی بہ نسبت وہ خاصی کم گو اور ''ریزرو'' تھی۔ فیکٹری کے دفتر میں اس کی کسی سے زیادہ میل ملاقات نہیں تھی۔ اس کے بال شانوں پر کٹے ہوئے تھے مگر وہ ہر وقت سر پر دوپٹا اوڑھے رکھتی تھی۔ یہ سانولی سلونی لڑکی صفدر علی کو اچھی لگتی تھی مگر اس نے کبھی اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ نازیہ کے رویے کو دیکھتے ہوئے صفدر علی کی کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی وہ خاصا شرمیلا واقع ہوا تھا۔

صفدر علی کو کام کی زیادتی کے باعث عام طور پر خاصی دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ ایک روز وہ حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت اس کے سوا دفتر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ انور جیلانی گزشتہ دو روز سے لاہور گیا ہوا تھا۔ نازیہ اپنے وقتِ مقررہ پر چھٹی کر کے جا چکی تھی اور اصغر جیلانی آج فیکٹری ہی نہیں آیا تھا۔ البتہ فیکٹری کے صابن سازی والے حصے میں کام ہو رہا تھا جس کی نگرانی فورمین فراست علی کر رہا تھا۔

صفدر علی نے فون اٹینڈ کیا۔ دوسری جانب اصغر جیلانی تھا۔ اصغر نے پوچھا۔ ''تم ابھی تک موجود ہو صفدر؟''

صفدر نے جواب دیا۔ ''آپ کو تو معلوم ہی ہے اصغر صاحب' جب انور صاحب یہاں نہیں ہوتے تو میرا کام خود بخود ہی بڑھ جاتا ہے۔''

''تم تو کام کرتے کرتے ہی مر جاؤ گے یار۔''

''اصغر صاحب! غریب آدمی کام نہیں کرے گا تو کھائے گا کہاں سے۔'' صفدر نے مزاح کے انداز میں کہا پھر اضافہ کیا۔ ''میں آپ کی طرح فیکٹری اونر کا چھوٹا بھائی تو نہیں ہوں۔''

اصغر نے کہا۔ ''معاشی خوش حالی کے لیے کسی فیکٹری اونر کا بھائی ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ سب دماغی کھیل ہے۔ جو شخص اپنے دماغ سے جتنا کام لیتا ہے' اتنا ہی کما لیتا ہے۔''

''میں تو دن رات کام میں دماغ استعمال کرتا ہوں جناب۔'' صفدر نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی تک میری کایا نہیں پلٹی۔''

اصغر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''صفدر! تم دماغ کو استعمال نہیں کرتے بلکہ دماغ کو کھپاتے ہو

اسی لیے تمہاری آمدنی محدود ہے۔ کایا پلٹ کے لیے دماغ کو استعمال کرنا سیکھو۔"

"آپ کی باتیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آتیں اصغر صاحب!" صفدر نے کہا۔ "یا تو آپ کی باتیں ہوتی ہی پیچیدہ اور مشکل ہیں یا پھر میں ہی کم فہم ہوں۔"

"آخر الذکر بات زیادہ درست ہے۔" اصغر جیلانی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ میں تو سیدھی اور سادہ بات کرتا ہوں۔"

"چلیں، آپ کی بات ہی ٹھیک ہوگی۔" صفدر نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ بتائیں، اس وقت آپ نے کیسے یاد کیا...... اور آج آپ فیکٹری کیوں نہیں آئے؟"

"بس یار، آج صبح ہی سے طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔" اصغر نے بتایا۔ "میں نے سوچا، آرام کرنا چاہیے۔"

"تو اس وقت آپ گھر پر ہیں؟"

اصغر نے جواب دیا۔ "گھر پر تو نہیں ہوں لیکن گھر سے زیادہ آرام دہ اور سکون بخش فضا میں سانس لے رہا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں جناب!" صفدر علی نے تعجب کا اظہار کیا۔

"سمجھنے کے لیے تمہیں میرے پاس آنا پڑے گا۔" اصغر جیلانی نے اس انداز میں کہا جیسے یہ کوئی نہایت ہی اہم بات ہو۔ "میں تمہیں فون پر نہیں سمجھا سکتا۔"

صفدر نے متردد لہجے میں کہا۔ "لیکن میں تو بہت اہم کام......"

"یہ تمہارے "بہت...... اہم کام" ہی تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔" اصغر جیلانی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر تم کچھ اور عرصہ انہی کاموں میں غرق رہے تو یا تو وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاؤ گے یا پھر پاگل خانے پہنچ جاؤ گے۔"

صفدر علی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں اصغر صاحب!"

"میں ہمیشہ ٹھیک ہی کہتا ہوں۔" اصغر نے بھاری آواز میں کہا۔ "لیکن بہت کم لوگوں کی سمجھ میں میری باتیں آتی ہیں۔ جیسے اس وقت میں تمہارے فائدے کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن تم خواہ مخواہ جرح وقدح کر رہے ہو۔"

فائدے کی بات ہر شخص کو اچھی لگتی ہے اور خاص طور پر محدود آمدنی والے غریب افراد تو فائدے کے کچھ زیادہ ہی متلاشی ہوتے ہیں۔ صفدر بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اصغر جیلانی آخر کس قسم کے فائدے کے بارے میں اسے بتانا چاہتا تھا۔ اپنی تسلی کے لیے اس نے پوچھا۔

"اصغر صاحب، آپ میرے فائدے سے متعلق سوچ رہے ہیں۔ کیا اس فائدے کا تعلق مالی امور سے ہے؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔؟"

صفدر علی کے دل میں مزید جاننے کا اشتیاق جاگا۔ اس نے پوچھا۔ "کوئی اشارہ دیں گے جناب؟"

"میں نے بتایا نا، فون پر ایسی بات نہیں ہو سکتی۔"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" صفدر علی نے استفسار کیا۔

اصغر جیلانی نے بتایا۔ "میں اس وقت ہالیڈے ان (موجود میریٹ) کے ڈائننگ ہال میں موجود ہوں۔ اگر تمہیں اپنے فائدے سے دلچسپی ہے تو چلے آؤ۔ دیکھو، مجھے زیادہ انتظار نہیں کروانا۔"

"میں آ رہا ہوں۔" صفدر علی نے بے تابی سے کہا۔ اور ریسیور رکھ دیا۔

صفدر علی کو شکار کرنے کے لیے جو جال بچھایا گیا تھا، صفدر علی نے اس کی جانب پہلا قدم اٹھا دیا تھا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہالیڈے ان کے ڈائننگ ہال میں اصغر جیلانی کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ اصغر جیلانی کے ساتھ اس وقت وہاں ایک ایسی شخصیت موجود تھی جسے دیکھ کر صفدر علی کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا...... وہ شخصیت نازیہ ناز تھی۔

نازیہ کا سر دوپٹے سے عاری تھا۔ اس کے خوب صورت باؤنسی بال شانوں کو چھو رہے تھے۔ اس کی چوڑی ٹھوڑی کا گڑھا اور ناک کی بائیں جانب پڑی ہوئی طلائی لونگ واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی اور لانبی پلکیں جھکائے بیٹھی تھی۔ صفدر علی یک ٹک، محویت کے عالم میں اسے تکے چلا جا رہا تھا۔

"بھائی اب واپس بھی آ جاؤ۔" اصغر جیلانی کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا۔

صفدر علی نے بے یقینی سے پہلے اصغر کو اور پھر نازیہ کی جانب دیکھا۔ اصغر نے پوچھا۔ "یار، کس بات پر حیرت کر رہے ہو۔ یہ تمہاری ہونے والی بھابی ہے۔"

"بھابی!" صفدر علی پر پے در پے حیرت حملہ آور ہو رہی تھی۔ "مگر یہ تو نازیہ ناز ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟" اصغر علی نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ صفدر علی کی آمد کے بعد دوبارہ کافی منگوائی گئی تھی۔ اس سے قبل اصغر جیلانی اور نازیہ اچھی خاصی پیٹ پوجا کر چکے تھے۔ اصغر جیلانی نے بات جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا خدانخواستہ نازیہ پر شادی کرنے کی کوئی پابندی عائد ہے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب!" صفدر علی جزبز ہو کر بولا۔ "میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ تو ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔ آپ کے تین بچے بھی ہیں۔ آپ خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں......"

"تمہاری طرح، بھائی صاحب (انور جیلانی) اور دوسرے لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ میں ایک مطمئن اور پُرسکون گھریلو زندگی گزار رہا ہوں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میری زندگی میں جس قدر تلخیاں گھلی ہوئی ہیں اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ خیر کچھ عرصے کی بات ہے، عنقریب میں نازیہ سے شادی کر لوں گا پھر تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔"

ایک تو نازیہ جیسی کم آمیز لڑکی کو یہاں اصغر جیلانی کے ساتھ دیکھ کر صفدر علی کو حیرت ہو رہی تھی۔ پھر اصغر نے اپنے جن عزائم کا اظہار کیا تھا وہ ناقابل یقین لگ رہے تھے۔ فیکٹری میں ان دونوں کا تعلق صرف کام کی حد تک تھا۔ اس کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مستقبل قریب میں کون سا کارنامہ انجام دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایک بات کا صفدر علی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ دونوں چھپ چھپ کر ہی ملتے ہوں گے۔''

ایک فوری خیال کے تحت اس نے اصغر جیلانی سے پوچھا۔ ''اصغر صاحب! کیا انور صاحب آپ کے اس ارادے سے واقف ہیں؟''

''قطعی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اور یہ راز آپ کے سینے میں اس وقت دن تک رہے گا جب تک ہم از خود اپنی شادی کو طشت از بام نہیں کر دیں گے۔'' نازیہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے آپ پر اعتماد کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے اعتماد پر پورے اتریں گے۔''

صفدر علی کو خود پر فخر محسوس ہوا کہ وہ دونوں اسے اپنے اتنے بڑے اور اہم راز میں شریک کر رہے تھے اور اس خوشی میں وہ یہ سوچنا بھول گیا کہ آخر انہیں ایسی کون سی مجبوری آن پڑی تھی جو وہ اسے اپنا ہم راز بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ درحقیقت یہ اصغر جیلانی اور نازیہ کی ایک چال تھی۔ وہ صفدر علی کو یہ باور کروانا چاہتے تھے کہ وہ اسے اپنا سمجھتے تھے اور اس پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ اسے اپنی زندگی کے ایک نہایت ہی اہم راز کا امین بنا لیا تھا۔ وہ اپنی اس کوشش میں صد فیصد کامیاب رہے تھے۔ صفدر علی کو انہوں نے شیشے میں اتار لیا تھا۔

صفدر علی، نازیہ کا یہ نیا روپ دیکھ کر اپنی حیرت پر قابو پانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ خاموش طبع لڑکی اس وقت ایک شوخ اور البیلی محبوبہ کے انداز میں اصغر جیلانی کے سامنے بیٹھی تھی۔ اصغر جیلانی اس سے بے تکلفانہ گفتگو کر رہا تھا۔

''یار، تم کس سوچ میں ڈوب گئے ہو؟'' اصغر نے صفدر علی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، میں نازیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''اس کے بارے میں جتنا سوچو گے، الجھتے چلے جاؤ گے۔'' اصغر جیلانی نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میں نے تمہیں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ میری خاطر مسلمان ہونے پر بھی تیار ہو گئی ہے۔''

صفدر علی نے پرستائش نظروں سے نازیہ کی جانب دیکھا پھر اصغر جیلانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں آپ خاصے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔''

''شکریہ!'' اصغر جیلانی نے کہا۔ ''میں واقعی خوش قسمت ہوں۔''

''آپ اپنی ہی باتیں کرتے رہیں گے یا صفدر صاحب کو وہ بات بھی بتائیں گے جس کی خاطر

آپ نے انہیں یہاں بلایا ہے۔'' نازیہ نے اصغر جیلانی کو یاددہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''اوہ یار، معاف کرنا۔'' اصغر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں واقعی بھول گیا تھا۔'' پھر وہ نازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کیا ضروری ہے کہ وہ بات میں ہی صفدر کو بتاؤں؟''

''ضروری نہیں ہے۔'' نازیہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''آپ کہتے ہیں تو میں بتائے دیتی ہوں۔''

وہ سوچے سمجھے پلان کے تحت صفدر علی کو گھیر رہے تھے لیکن صفدر جیسے سادہ دل اور شریف انسان کو یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ وہ اس پر اچانک اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں۔

نازیہ نے کہا۔ ''دراصل اصغر صاحب کے ایک جاننے والے بہت بڑے کاروباری شخص ہیں۔ وہ اپنا کاروبار تو کرتے ہی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رقم بھی اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں۔ اس رقم پر وہ اتنا زیادہ منافع دیتے ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔''

صفدر علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اصغر جیلانی نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''وہ کم از کم تین ماہ کے لیے رقم لیتے ہیں۔ تین ماہ بعد اصل رقم منافع کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں لیکن چونکہ وہ میرے بہت قریبی دوست ہیں اس لیے میرے کہنے پر وہ تین ماہ سے پہلے بھی رقم واپس دے سکتے ہیں۔ کیا تم ان کے کاروبار میں کچھ رقم لگانا چاہتے ہو؟''

''میں......'' صفدر علی نے ہونقوں کی طرح اصغر جیلانی کو دیکھا۔ ''میں تو بڑی مشکل سے اپنے گھر کا خرچہ چلا پاتا ہوں۔ انویسٹ کرنے کے لیے میرے پاس رقم کہاں ہے؟''

''خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔'' نازیہ نے کہا۔ ''آپ تو ہر وقت نوٹوں میں کھیلتے رہتے ہیں۔''

صفدر علی نے کہا۔ ''میرے پاس جو رقم ہوتی ہے وہ فیکٹری کی ہوتی ہے۔ اس کا استعمال میرے اختیار میں نہیں ہوتا۔ خاص طور پر میں اسے ذاتی استعمال میں لانے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اگرچہ وہ رقم تمہاری نہیں ہوتی مگر وہ تمہارے قبضے میں تو رہتی ہے۔'' اصغر جیلانی نے کہا۔ ''بینک کے سارے معاملات بھی بھائی صاحب نے تم پر چھوڑ رکھے ہیں۔ سارے کیش کی آمد و شد تمہارے ہاتھ سے ہوتی ہے۔ انڈسٹری کا بیلنس اس قدر رہتا ہے کہ دس ہزار کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

صفدر نے سہمی ہوئی نظروں سے اصغر جیلانی کو دیکھا پھر قدرے خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''اگر انور صاحب آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں قابل اعتماد ہوں۔ نہیں، اصغر صاحب! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں انور صاحب کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔''

''اس میں دھوکا دینے کی کون سی بات ہے۔'' نازیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''دھوکا اور فراڈ تو جب ہوگا، اگر آپ رقم کو ہڑپ کر جائیں۔ آپ تو عارضی طور پر کچھ رقم لے لیں گے اور

مناسب وقت پر اسے دوبارہ بیلنس میں شامل کر دیں گے۔"

اصغر جیلانی نے چارا پھینکتے ہوئے کہا۔ "یار! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ کاروبار کس قدر محفوظ اور منافع بخش ہے۔ میں نے خود بھی اچھی خاصی رقم انویسٹ کر رکھی ہے اور ہر تین ماہ کے بعد منافع سمیٹتا رہتا ہوں۔" پھر وہ نازیہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "ذرا تم اسے منافع کی شرح تو بتاؤ۔"

"یہ تو وہی بات ہے کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔" نازیہ نے کافی کے کپ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "رقم جس قدر تگڑی ہوگی' منافع بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "میں نے شروع میں اصغر صاحب کے مشورے سے صرف دس ہزار روپے لگائے تھے۔ تین ماہ بعد مجھے گیارہ ہزار روپے واپس مل گئے یعنی اصل زر دس فی صد منافع کے ساتھ۔"

اصغر جیلانی نے بتایا۔ "رقم جس قدر بڑھتی جائے گی' منافع کی شرح میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ دس ہزار روپے پر دس فیصد منافع' بیس ہزار روپے پر بیس فی صد منافع...... ایک لاکھ پر سو فی صد یعنی ایک لاکھ روپے انویسٹ کرنے کے بعد تین ماہ کی مدت پوری ہونے پر دو لاکھ واپس ملیں گے۔"

صفدر علی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس قسم کے منافع بخش کاروبار کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اصغر جیلانی کی تجویز اسے خاصی پرکشش محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کی شرافت آڑے آ رہی تھی۔

اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "اصغر صاحب! آپ میرے سچے خیر خواہ ہیں۔ آپ یقینی طور پر مجھے ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی ہمدردی اور خلوص نے مجھے بہت متاثر کیا ہے لیکن......"

"لیکن کیا؟" نازیہ نے جلدی سے پوچھا۔

وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "اگر انور صاحب کو پتہ چل گیا کہ میں نے فیکٹری کے حسابات میں ہیرا پھیری کی ہے تو ان کی نظر میں میری عزت دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو میرے دوست۔" اصغر جیلانی نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ "تم صرف ایمان دار ہی نہیں بلکہ انتہائی سیدھے سادے شخص بھی ہو۔ معاف کرنا' تم بے وقوفی کی حد تک معصوم ہو۔ اس دنیا میں اتنی زیادہ شرافت نقصان دہ ہوتی ہے۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے کچھ سوچا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "او اللہ کے بندے! تمہیں حسابات میں ہیرا پھیری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھی سی بات ہے' تم جتنی رقم اس منافع بخش کاروبار میں انویسٹ کرنا چاہو' اتنی رقم فیکٹری کے اکاؤنٹ میں کم جمع کروانا۔ سمندر میں سے قطرہ نکال لیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اگر انور صاحب کو......"

"دیکھو میاں!" اصغر جیلانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور خود

کہا۔ "دولت کمانے کے لیے کچھ نہ کچھ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ اب ایسے معجزے رونما نہیں ہوتے کہ سڑک پر دولت سے بھرا ہوا کوئی بریف کیس پڑا ہوا مل جائے۔"

نازیہ نے کہا۔ "جب کہ میرے خیال میں اس کام میں سرے سے رسک کا وجود ہی نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو نازیہ!" اصغر نے تصدیقی لہجے میں کہا۔ "جب سے بھابی نادرہ کا انتقال ہوا ہے' بھائی صاحب نے کاروبار میں دلچسپی لینا بھی کم کر دی ہے۔ اب تو وہ کئی کئی ماہ تک فیکٹری کے حسابات بھی چیک نہیں کرتے۔"

یہ بات صفدر علی کے دل کو لگی۔ انور جیلانی نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد سے فیکٹری کے معاملات میں واقعی دلچسپی لینا بڑی حد تک کم کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ "گوشہ نشینی" کی زندگی کی طرف جا رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں اصغر جیلانی اور نازیہ کی ترغیب خاصی پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اسے یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے فیکٹری کے اکاؤنٹ میں سے ایک معقول رقم حاصل کر سکتا تھا لیکن یہ بات اس کے اصول کے خلاف تھی۔ اس نے پوری زندگی میں کبھی امانت میں خیانت نہیں کی تھی۔ لیکن اس پیش کش کے پیش نظر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ تھوڑا بہت رسک لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اگر منافع کی شرح وہی تھی جو بتائی جا رہی تھی تو کچھ ہی عرصے میں وہ اس قابل ہو سکتا تھا کہ اپنے پیسوں سے انویسٹ منٹ کر سکتا لیکن یہ طے تھا کہ پہلی مرتبہ اسے فیکٹری کے اکاؤنٹ سے ہی رقم نکلوانا پڑتی۔ بہ الفاظ دیگر وہ اکاؤنٹ میں اتنی رقم کم جمع کرواتا جو اس کی ضرورت ہوتی۔

وہ خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا کہ اس کی سماعت سے اصغر جیلانی کی آواز ٹکرائی۔ "صفدر! تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہیں اس کام کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ تمہاری بھلائی کے لیے ہمیں ایک آئیڈیا سوجھا تھا وہ ہم نے تمہارے گوش گزار کر دیا۔ اب فیصلہ کرنا تم پر منحصر ہے۔"

"ہاں' میں اتنا ضرور کہوں گی صفدر صاحب!" نازیہ نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ جو بھی فیصلہ کریں' اچھی طرح سوچ سمجھ کر کریں۔ آپ خود پر کوئی دباؤ محسوس نہ کریں۔ اگر آپ کو ہماری تجویز میں کوئی برائی یا خرابی نظر نہ آئے تو اس پر ضرور عمل کریں۔ اس سے زیادہ محفوظ اور منافع بخش کوئی اور کاروبار ہو ہی نہیں سکتا۔"

صفدر علی نے باری باری ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلا آیا۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں گزار دی۔ وہ جب بھی سونے کی کوشش کرتا' کرارے کرارے نوٹ اس کے پردۂ ذہن پر پھڑ پھڑانے لگتے اور وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتا۔ صبح ہونے تک وہ اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ تجرباتی طور پر اصغر جیلانی کی بات مان لینا چاہیے۔ آگے اللہ مالک ہے۔

دوسرے روز وہ دفتر پہنچا تو رت جگا اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ اصغر سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا۔ ایک دو بار نازیہ سے اس کا سامنا ہوا لیکن وہ حسبِ معمول انتہائی سنجیدہ اور لیے دیے رہی لنچ کے بعد صفدر علی کو ایک موقع مل گیا۔ اس وقت اصغر جیلانی اس کے پاس سے گزر

رہا تھا۔

''اصغر صاحب!'' اس نے اصغر جیلانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی تجویز پر غور کیا ہے......''

اصغر جیلانی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔ ''اس سلسلے میں یہاں فیکٹری میں کوئی بات نہیں ہو سکتی۔''

''پھر!'' صفدر علی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''چھٹی کے بعد باہر ملیں گے۔'' اصغر جیلانی نے کہا پھر اسے ایک قریبی کیفے کا نام بتایا۔ صفدر علی اس کیفے سے واقف تھا۔

صفدر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے' لیکن کتنے بجے؟''

''چھ بجے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اس کا مطلب ہے' میں آج بھی دیر تک دفتر میں کام نہیں کر سکوں گا۔'' صفدر علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وقت کی قربانی تو دینا ہی پڑے گی۔'' اصغر نے کہا اور وہاں سے ہٹ گیا۔

قصہ مختصر' اسی شام چھ بجے وہ دونوں مذکورہ کیفے میں موجود تھے۔ اصغر نے چائے کا آرڈر دیا اور صفدر علی کی بے چینی سے محظوظ ہوتا رہا۔ صفدر علی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔ اس وقت تک بیرا چائے رکھ گیا تھا اور اصغر جیلانی چائے بنانے میں مصروف تھا۔

''اصغر صاحب!'' صفدر نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی تجویز پر بہت غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے آپ کی بات مان لینا چاہیے۔''

''خاصا عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے تم نے۔''

صفدر علی نے پوچھا۔ ''میں کم از کم کتنے پیسے انویسٹ کر سکتا ہوں؟''

''میں نے تمہیں رقم اور شرح منافع کے بارے میں تفصیلی طور پر بتا تو دیا تھا۔'' اصغر جیلانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کم از کم دس ہزار کا ذکر کیا تھا۔'' صفدر نے کہا۔ ''کیا اس سے کم رقم نہیں لگائی جا سکتی؟''

اصغر جیلانی نے بے پروائی سے کہا۔ ''میاں لگانے کو تو ایک ہزار روپے بھی لگائے جا سکتے ہیں لیکن اس معمولی رقم پر منافع کی شرح بھی ایک فیصد ہو گی یعنی تین ماہ بعد ایک ہزار کی رقم پر صرف دس روپے منافع ملے گا۔ نازیہ نے کتنی پتے کی بات کی تھی...... جتنا گڑ ڈالیں گے' اتنا ہی میٹھا ہو گا۔ صفدر' یار تم تو میٹھا در میں رہتے ہو۔ تمہیں تو اچھا خاصا گڑ ڈالنا چاہیے۔''

صفدر کافی دیر سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ میں فی الحال دس ہزار روپے لگا کر دیکھتا ہوں۔ اگر

مجھے یہ کام راس آ گیا اور کسی قسم کا کوئی نقصان نہ ہوا تو آگے بھی دیکھوں گا۔''

''کسی قسم کے نقصان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اصغر جیلانی نے تیقن سے کہا۔ ''زبانی کلامی کی بات نہیں ہے۔ اسٹامپ پیپر پر باقاعدہ معاہدہ ہو گا۔ سیٹھ ولی بھائی رنگون والا کوئی کام بے قاعدہ و بے ضابطہ نہیں کرتا۔ تمہاری رقم ڈوبنے کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے۔''

''مجھے سب سے زیادہ فکر اسی بات کی ہے کہ انور صاحب کے سامنے میرے کرتوت کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔'' صفدر علی نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

''یار! تم تو خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔'' اصغر جیلانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اول تو اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ اتنی معمولی رقم کا بھائی صاحب کو پتا بھی چلے اور اگر بالفرض محال انہیں پتا چل بھی گیا تو کوئی بہانہ کر دینا۔''

صفدر علی نے کہا۔ بہانہ تو میں کوئی بھی کر دوں گا لیکن اس بہانے کو نبھانا بھی تو پڑے گا۔''

''میں ہوں نا یار!'' اصغر نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اگر فوری طور پر تمہیں رقم کی ضرورت پڑ گئی تو مجھ سے ادھار لے لینا۔''

صفدر علی کے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ اس نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کو دیکھا اور ممنونیت سے لبریز آواز میں کہا۔ ''اصغر صاحب' آپ میرے سچے دوست ثابت ہو رہے ہیں۔''

اس وقت یقینی طور پر اصغر نے اپنے دل میں کہا ہو گا...... بیٹا' یہ تو تمہیں بعد میں پتا چلے گا کہ میں کتنا سچا اور مخلص دوست ہوں۔ بہر حال اس نے زبان سے کہا۔ ''صفدر علی' تم رقم کب لا رہے ہو؟''

''دو روز بعد میں رقم کا بندوبست کر لوں گا۔''

''ایک بات یاد رکھنا۔'' اصغر نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''فیکٹری میں اس معاملے پر کوئی بات نہیں ہو گی اور نہ ہی تم کسی اور شخص کو اس بارے میں بتاؤ گے۔''

''میں کوئی پاگل تھوڑا ہی ہوں جو اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار لوں گا۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''یہ معاملہ جتنا راز میں رہے گا' اتنا ہی میں فائدے میں رہوں گا۔''

''تمہیں ایک اور راز کی بھی حفاظت کرنا ہے۔''

''کون سا راز؟''

''بھئی اتنی جلدی بھول گئے۔'' اصغر جیلانی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ارے یار' وہی راز میری اور نازیہ کی شادی والا۔''

''اچھا وہ۔'' صفدر علی نے چونک کر کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں پیٹ کا ہلکا نہیں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اصغر جیلانی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بھائی صاحب بلاوجہ تم پر اتنا اعتماد نہیں کرتے۔''

صفدر علی اپنی تعریف سن کر خوش ہوگیا۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ اصغر اور نازیہ کا ایک اہم راز اس کے قبضے میں تھا۔ اسے تحفظ کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا' کم از کم اصغر اور نازیہ کی طرف سے تو اسے بالکل بے فکر رہنا چاہیے۔ وہ رقم کی ہیرا پھیری کے بارے میں کسی کے سامنے زبان نہیں کھولیں گے۔

اصغر جیلانی اور نازیہ ناز نے ملی بھگت سے جو جال بچھایا تھا' صفدر علی نے اس جال کے اندر قدم رکھ دیا تھا۔ اب ان لوگوں نے بڑے شاطرانہ انداز میں اس جال کو سمیٹنا تھا۔ اتنی احتیاط اور مہارت کے ساتھ کہ شکار کو کانوں کان خبر نہ ہوسکے۔

صفدر علی نے حسب وعدہ دس ہزار روپے اصغر جیلانی کے حوالے کردیے جواب میں اس نے دس ہزار روپے کی وصولی کا اسٹامپ پیپر پر کیا ہوا معاہدہ صفدر کو تھما دیا۔ اس معاہدے پر رقم اور شرح منافع کی تفصیل درج تھی۔ یہ معاہدہ پر کسی سیٹھ ولی بھائی کے دستخط بھی موجود تھے۔ گواہ کے ذیل میں ایک نام اصغر جیلانی کا بھی تھا۔ صفدر چونکہ اصغر جیلانی پر اعتماد کرتا تھا اس لیے اس نے زیادہ سوالات نہیں کیے اور وہ معاہدہ اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیا۔

حسب وعدہ ٹھیک تین ماہ کے بعد اصغر جیلانی نے گیارہ ہزار روپے صفدر علی کو دے دیے۔ صفدر علی نے دس ہزار واپس فیکٹری کے اکاؤنٹ میں ڈالے اور ایک ہزار روپے کی بیوی کو شاپنگ کروا دی۔

چند روز بعد اسے پھر ہری ہری سوجھنے لگی۔ اس مرتبہ اس نے بیس ہزار روپے اصغر جیلانی کے حوالے کردیے۔ تین ماہ بعد بیس فیصد کے حساب سے بیس ہزار پر اسے چار ہزار کا منافع ملا۔ اس نے اصل زر کو واپس اکاؤنٹ میں ڈالا اور منافع کے چار ہزار سے گھریلو استعمال کی چند نہایت ضروری چیزیں خرید ڈالیں۔ اس دوران میں چونکہ فیکٹری کے اکاؤنٹ کے حوالے سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لیے اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

دو ماہ بعد اس نے پورے پچاس ہزار روپے اصغر جیلانی کو دیے اور معاہدے والا اسٹامپ پیپر حاصل کرلیا۔ ٹھیک تین ماہ کے بعد اصغر نے اسے پچھتر ہزار روپے واپس کردیے۔ پچاس ہزار اصل زر اور پچیس ہزار منافع کی مد میں۔ اس ماہ صفدر علی ایک رنگین ٹی وی اور نیا فریج خرید لایا۔ بیوی نے استفسار کیا تو اس نے یہ کہہ کر بیوی کو مطمئن کردیا کہ اس کا اتفاق سے انعامی بانڈ لگ گیا تھا۔

لالچ ایک ایسی پرکشش بیماری ہے کہ جسے یہ لگ جائے پھر اس کا دیوالیہ نکال کر ہی چھوڑتی ہے۔ اس مرض میں مبتلا شخص اس کے مضرات پر دھیان نہیں دیتا اور زیادہ سے زیادہ کے حصول میں وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ خود کو تباہی کے دہانے پر کھڑا پاتا ہے۔ صفدر علی کی آنکھوں پر لالچ نے ایسی پٹی باندھ دی تھی کہ بربادی اس کا مقدر بن گئی۔

اس نے آسانی سے دولت اپنے پاس آتی دیکھی تو اس کے دل میں دبی ہوئی نا آسودہ

خواہشات سر اٹھانے لگیں۔ ایک اپنا گھر اس کا برسوں کا خواب تھا۔ اس نے سوچا' ایک ہی بار لمبا ہاتھ مارا جائے۔ اس طرح اپنا گھر بھی بن جائے گا اور آئے روز یہ چھوٹی موٹی ہیرا پھیری بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

صفدر علی نے اصغر جیلانی سے خفیہ ملاقات کی اور پوچھا۔ ''اصغر صاحب' میں سیٹھ رنگون والا کے کاروبار کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی معلومات؟''

''آپ نے بتایا تھا کہ ایک لاکھ کی رقم پر سو فیصد منافع ملے گا۔'' صفدر علی نے کہا۔ ''یعنی تین ماہ بعد ایک لاکھ کی رقم دگنی ہوجائے گی۔ ایک لاکھ اصل زر اور ایک لاکھ منافع۔''

''ہاں' میں نے یہی بتایا تھا۔'' اصغر جیلانی نے ٹھوس لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم ایک لاکھ روپیہ انویسٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''میں اس سے بھی آگے کی سوچ رہا ہوں۔'' صفدر علی نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے کہا۔

اصغر جیلانی کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے لیکن اس نے اپنی دلی کیفیت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور معتدل لہجے میں دریافت کیا۔

''مثال کے طور پر کتنا آگے کی سوچ رہے ہو؟''

''اس کا فیصلہ میں منافع کی شرح جاننے کے بعد کروں گا۔'' صفدر علی نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ ''میں یہی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

اصغر جیلانی نے شکار کو جکڑنے کے لیے اس قدر ڈھیل دے رکھی تھی کہ شکار کو اپنے پھنسنے کا احساس ہی نہیں تھا بلکہ پے در پے حاصل ہونے والی رقم نے اسے حد سے زیادہ بااعتماد بنا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر گزرتے دن کے بعد اصغر جیلانی پر اس کا اعتقاد بڑھتا جا رہا تھا۔ جو اصغر جیلانی کی فن کارانہ مہارت کا ثبوت تھا۔ وہ اپنے شکار کو مناسب طور پر دام میں لانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

اصغر جیلانی نے بتایا۔ ''ایک لاکھ کی انویسٹ منٹ پر منافع سو فیصد ہے۔ اسی حساب سے دو لاکھ پر منافع دو سو فیصد...... دس لاکھ پر منافع ایک ہزار فیصد...... وغیرہ وغیرہ۔''

اپنی بات ختم کرکے اس نے سوالیہ نظروں سے صفدر علی کی طرف دیکھا' صفدر علی نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میں دو لاکھ روپے لگاؤں تو تین ماہ بعد مجھے چھ لاکھ روپے ملیں گے۔ دو لاکھ اصل زر اور چار لاکھ منافع کے طور پر؟''

''ہاں تمہارا حساب بالکل درست ہے۔''

''اصغر صاحب' میں دو لاکھ انویسٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' صفدر علی نے اپنا خیال ظاہر کیا پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس سلسلے میں مجھے ایک پریشانی نے بھی گھیرا ہوا ہے۔ کیا آپ اس

ڈیل میں سیٹھ رنگون والا سے کچھ رعایت حاصل کر سکتے ہیں؟"

"کیسی رعایت صفدر علی؟" اصغر جیلانی نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "دو لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے اصغر صاحب! اور آپ یہ بات جانتے ہیں کہ میں یہ رقم فیکٹری کے اکاؤنٹ سے لگاؤں گا۔ میں رعایت یہ چاہتا ہوں کہ اگر تین ماہ کے مقررہ عرصے کے دوران میں اچانک رقم کی ضرورت پڑ گئی تو کیا سیٹھ رنگون والا مجھے یہ رقم مہیا کر دیں گے؟ اس صورت میں، میں اپنا منافع چھوڑنے پر بھی تیار ہوں۔"

اصغر جیلانی نے جواب دیا۔ "میں سیٹھ سے بات کر کے بتاؤں گا۔"

صفدر علی نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یہ آخری ہیرا پھیری کرے گا۔ اگر کامیاب ہو گیا تو فیکٹری کا بیلنس پورا کرنے کے بعد اس کے پاس چار لاکھ روپے بچ جائیں گے۔ اس رقم سے وہ کوئی معقول سا فلیٹ خرید لے گا۔ واضح رہے کہ یہ واقعہ آج سے چوبیس پچیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں چار لاکھ میں اچھا خاصا فلیٹ مل جاتا تھا۔

دوسرے روز اصغر جیلانی نے صفدر علی کو بتایا کہ سیٹھ رنگون والا اس بات پر تیار ہے کہ اگر صفدر علی منافع کی رقم چھوڑنے کا وعدہ کرے تو چوبیس گھنٹے کی پیشگی اطلاع پر اسے اصل رقم واپس کی جا سکتی ہے۔ نیز اس نے وضاحت کی کہ اسٹامپ پیپر پر جو معاہدہ تحریر کیا جائے گا اس میں منافع چھوڑنے والی شق کا بطور خاص تذکرہ کیا جائے گا۔

صفدر علی کو سیٹھ کی اس شرط میں کوئی قباحت نظر نہ آئی اور دو روز کے بعد اس نے دو لاکھ کی رقم اصغر جیلانی کے حوالے کر دی۔ صفدر علی شروع ہی سے ایک فاش غلطی کر رہا تھا اور وہ یہ کہ وہ آج تک سیٹھ سے بہ نفسِ نفیس نہیں ملا تھا۔ سارا کاروبار اصغر جیلانی کے توسط سے ہو رہا تھا۔ وہی صفدر علی سے رقم وصولتا تھا، وہی معاہدے والا اسٹامپ پیپر لا کر اس کے حوالے کرتا تھا۔ پھر ٹھیک تین ماہ بعد وہ اصل زر مع منافع صفدر علی کو دیتا اور معاہدے والا اسٹامپ پیپر واپس لے جاتا۔ اس ڈیل کو چلتے ہوئے اب قریب قریب دس ماہ ہونے کو آئے تھے اور ابھی تک صفدر علی نے سیٹھ ولی بھائی رنگون والا کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

جس روز صفدر علی نے اصغر جیلانی کو دو لاکھ روپے دیے اس سے اگلے دن اصغر فیکٹری نہیں آیا۔ صفدر علی دن بھر پریشان رہا۔ وہ دو لاکھ کی رسید کے طور پر اسٹامپ پیپر کا منتظر تھا۔ تیسرے روز اصغر علی نظر آیا تو اس نے آنکھ کے اشارے سے معاہدے والے اسٹامپ پیپر کے بارے میں استفسار کیا۔

اصغر جیلانی نے بھی اشارے ہی سے اسے بتایا کہ چھٹی کے بعد کیفے میں بات ہوگی۔

کیفے میں پہنچنے کے بعد اصغر جیلانی نے بتایا۔ "یار صفدر! ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟" صفدر علی نے بے تابی سے پوچھا۔

اصغر جیلانی نے بتایا۔ "سیٹھ ولی بھائی کو اچانک امریکا جانا پڑ گیا ہے۔ ان کی واپسی کوئی پندرہ

دن بعد ہوگی۔ اس لیے تمہیں اسٹامپ پیپر کے لیے پندرہ روز انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اوہ!" صفدر علی کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ "اصغر صاحب، کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی نا؟"

اصغر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ سب نارمل رہے گا۔"

"اگر اس دوران میں رقم کی ضرورت پڑ گئی تو؟"

"ہاں، ایسا ہو تو سکتا ہے۔" اصغر نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "لیکن میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔"

صفدر علی نے کہا۔ "جب آپ نے سیٹھ صاحب کو رقم دی تھی تو اسی وقت اسٹامپ پیپر تیار کروا لینا چاہیے تھا۔"

"اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔" اصغر جیلانی نے جلدی سے کہا۔ "پھر سیٹھ ولی بھائی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ کھرا اور سچا بزنس مین ہے، تمہاری رقم کہیں نہیں جاتی۔"

صفدر علی کے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اصغر جیلانی کے دلاسوں پر تکیہ کر کے سیٹھ ولی بھائی رنگون والا کی امریکا سے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اسے یہ تو یقین تھا کہ اس کی رقم ڈوبے گی نہیں لیکن ایک موہوم سی کسک اس کے اندرون کو دھیرے دھیرے کھرچ رہی تھی۔ اس کے شب و روز ایک نامعلوم سے کرب میں گزر رہے تھے۔ وہ ایک بے نام سی بے چینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے خود کو سپردِ عذاب کر دیا تھا۔

اس واقعے کے آٹھویں روز جو بم پھٹا اس نے صفدر علی کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ صفدر علی کے بیان کے مطابق اس روز کوئی چار بجے کے قریب اس کے باس انور جیلانی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ اس وقت اصغر جیلانی فیکٹری کے مشینوں والے حصے میں مصروف تھا۔ دفتری حصے میں صرف نازیہ ناز موجود تھی جو انور جیلانی کے کمرے سے ملحق اپنے کیبن میں ٹائپ رائٹر پر جھکی کوئی لیٹر ٹائپ کر رہی تھی۔

صفدر علی، انور جیلانی کے کمرے میں پہنچا تو باس کے رویے کو خلافِ معمول پایا۔ آج اس نے صفدر علی کے سلام کا جواب دیا اور نہ ہی اسے بیٹھنے کو کہا۔ اس کے بالکل برعکس نہایت ہی غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے صفدر علی سے استفسار کیا۔

"صفدر! تمہارے پاس اس وقت کتنا کیش ہے؟"

اس سوال پر صفدر بوکھلا گیا۔ ذرا سنبھل کر بولا۔ "مجھے زبانی یاد نہیں ہے۔ چیک کرنا پڑے گا۔"

"پہلے تو تم کھڑے کھڑے انگلیوں پر فیکٹری کی ایک ایک پائی گنوا دیا کرتے تھے۔ آج تمہاری زبان کیوں لڑکھڑا رہی ہے۔" انور جیلانی نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

"سر، وہ بات یہ ہے کہ......"

"بات جو بھی ہے وہ بعد میں بتانا۔" انور جیلانی نے اسے کہنے سے روک دیا۔ "جاؤ' کیش بک اور سارا کیش لے کر میرے پاس آ جاؤ۔"

"مم......میں الماری کی چابی آج گھر بھول آیا ہوں سر!" صفدر علی نے بہانہ کیا۔ "کل ہر چیز آپ کو چیک کروا دوں گا۔"

انور جیلانی قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "دیکھو صفدر! میں نے ہمیشہ تم پر اعتماد کیا ہے اور تم میرے اعتماد پر پورے بھی اترتے رہے ہو لیکن کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم سب کچھ سچ سچ مجھے بتا دو تو میں تمہارے ساتھ نرمی برت سکتا ہوں۔"

"سر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" صفدر علی نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "آپ کو یقینی طور پر کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی سور کے بچے!" انور جیلانی طیش کے عالم میں دہاڑا۔ "مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ چند ماہ سے تم فیکٹری کے کیش میں کچھ گڑبڑ کر رہے ہو۔ میں نے اپنے ذرائع سے بینک اکاؤنٹ اور دیگر حسابات بھی چیک کئے ہیں اور اس اطلاع کو صد فیصد درست پایا ہے۔"

"سر' میری سمجھ میں نہیں آ رہا' آپ کس قسم کی گڑبڑ کا ذکر کر رہے ہیں۔" صفدر علی نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو ہمیشہ نہایت ایمان داری اور......"

انور جیلانی نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹی "جب تک تم ایمان دار تھے' میں نے تم سے کبھی اس انداز کی بات نہیں کی لیکن اب میں تصدیق کر چکا ہوں کہ تم ایمان دار نہیں رہے۔"

"کاش میں آپ کو اپنی بات کا یقین دلا سکتا!"

"تم ابھی کیش رجسٹر اور نقد کیش لے کر آؤ۔" انور جیلانی نے کہا۔ "میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کہاں کہاں گھپلا کیا ہے۔"

صفدر علی اندر سے دہل گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ انور جیلانی کو تمام حالات سے آگاہی ہو چکی ہے ورنہ وہ اتنے وثوق سے اس کو لتاڑنے کی کوشش نہ کرتا۔ ایک مرحلے پر اس نے خود کو داد بھی دی کہ چابی گھر بھول آنے کا بہانہ کر کے اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ کل تک وہ اصغر جیلانی سے مشورہ کر کے کوئی بچت کی راہ نکال سکتا تھا۔

"انور صاحب!" اس نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع بھی نہیں دیں گے؟"

"کیسا موقع چاہتے ہو؟" انور جیلانی نے بے رخی سے پوچھا۔

صفدر علی نے کہا۔ "آج تو میں الماری کی چابی گھر بھول آیا ہو۔ آپ مجھے کل تک مہلت دے

دیں۔ میں صبح تمام حسابات اور بینک اکاؤنٹ کے معاملات آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔"

انور جیلانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں تمہیں کل صبح دس بجے تک اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ اگر تم قصوروار ثابت ہوئے تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا......اور اب یہاں سے۔"

انور جیلانی نے تھوڑی دیر پہلے حسابات اور بینک اکاؤنٹ چیک کرنے کی بات محض صفدر پر دباؤ ڈالنے کے لیے کی تھی حالانکہ وہ اس سلسلے میں تفصیلات سے واقف نہیں تھا۔ اسے اصغر جیلانی نے نہایت ہی خفیہ طور پر یہ اطلاع دی تھی کہ صفدر علی فیکٹری کے مالی امور میں کچھ گھپلا کر رہا تھا۔ اصغر نے بڑے بھائی کو محض اشارہ دیا تھا' کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ انور جیلانی کو چھوٹے بھائی کی فراہم کردہ اطلاع پر کلی طور پر یقین تو نہیں آیا تھا تاہم اس نے سوچا' پوچھ گچھ کرنے میں کیا حرج ہے۔

صفدر علی' انور جیلانی کے کمرے سے نکل کر اصغر جیلانی کو تلاش کرنے لگا۔ آخر وہ اسے پیکنگ ڈپارٹمنٹ کے قریب مل گیا۔ اس نے مختصر الفاظ میں اصغر جیلانی کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

پوری بات سننے کے بعد اصغر جیلانی نے کہا۔ "بہانہ تو تم نے بہت اچھا بنایا ہے لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ سیٹھ ولی بھائی ابھی امریکا سے نہیں لوٹا۔"

"اصغر صاحب! میری عزت اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔" صفدر نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر میں نے کل صبح تک حسابات کو درست نہ کیا تو انور صاحب مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

اصغر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "دو لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ اگر بیس تیس ہزار کی بات ہوتی تو میں تمہیں اپنے پاس سے دے دیتا۔"

"آپ کے بینک اکاؤنٹ میں تو اتنی رقم موجود ہو گی۔" صفدر علی نے کہا۔ "آپ مجھے کچھ عرصے کے لیے دو لاکھ روپے ادھار دے دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ سیٹھ ولی بھائی سے ملنے والے منافع میں سے آدھے آپ کو دے دوں گا۔"

اصغر جیلانی نے کہا۔ "میں نے دو روز پہلے ہی بینک سے اچھی خاصی رقم نکلوائی ہے۔ میں نے ایک پلاٹ کا سودا کیا تھا۔ اب بینک میں مشکل سے پانچ دس ہزار روپے پڑے ہوں گے۔"

"اوہ میرے خدا!" صفدر علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "اب مجھے تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میری باقی زندگی جیل میں گزرے گی۔ میری بیوی اور معصوم بچی کا جانے کیا حشر ہو گا؟"

اصغر جیلانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اتنا زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرے دوست۔ میں تمہارے لیے کچھ سوچتا ہوں۔ میری پوری کوشش ہو گی کہ تمہاری رسوائی نہ ہو۔ مجھے امید ہے' میں کل صبح سے پہلے پہلے تمہاری بچت کا کوئی معقول بندوبست کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"دوستوں پر احسان نہیں کیا جاتا' ان کے کام آیا جاتا ہے۔"

"آپ بہت عظیم دوست ہیں' اصغر صاحب!" صفدر نے کہا۔

"سچا دوست ہمیشہ عظیم ہی ہوتا ہے صفدر!" اصغر جیلانی نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "تم کافی دیر سے اپنی سیٹ سے غائب ہو۔ جاؤ اپنے دفتر میں بیٹھ کر کام کرو۔ انور بھائی کو احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم ان کے استفسار سے ہراساں ہو گئے ہو۔ سب کچھ نارمل انداز میں کرو۔ جاؤ' شاباش۔"

صفدر علی نے تشکر آمیز نگاہوں سے اپنے عظیم محسن کو دیکھا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اصغر نے کہا۔ "اور ہاں......" صفدر علی نے مڑ کر دیکھا تو اصغر جیلانی نے کہا۔ "آج دیر تک دفتر میں بیٹھ کر کام کرنا۔ میں رقم کا کوئی معقول بندوبست کرنے کے بعد تمہیں فون کروں گا۔"

صفدر علی اپنی سیٹ پر آ کر فائلوں میں سر کھپانے لگا لیکن اب اس کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ پانچ بجے کے قریب انور جیلانی دفتر سے اٹھ گیا۔ نازیہ ناز بھی اس کے ساتھ ہی نکل گئی۔ اب وہ دفتری حصے میں تنہا تھا۔ انور جیلانی کے جانے کے بعد اسے قدرے سکون محسوس ہوا تھا۔

چھ بجے اصغر جیلانی اس کے پاس آیا اور کہا۔ "لے پیارے' میں تو چلا۔ تم دفتر ہی میں موجود رہنا۔"

"میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد کوئی مناسب انتظام ہو جائے۔" اصغر جیلانی نے کہا۔ "باقی اللہ کو جو منظور ہو۔"

صفدر علی نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "اصغر صاحب! اوپر خدا اور نیچے آپ ہی میرے ہمدرد اور غمگسار ہیں۔ مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔"

"انسان تو اپنی سی کوشش ہی کر سکتا ہے۔"

"میں کب تک آپ کے فون کا انتظار کروں؟"

"کم از کم نو بجے تک۔"

"ٹھیک ہے۔" صفدر علی نے کہا اور اصغر جیلانی اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

صفدر علی عام طور پر آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک تو دفتر میں بیٹھتا ہی تھا۔ کبھی کبھار اسے نو اور دس بھی بج جاتے تھے۔ اس کی بیوی اس تاخیر کی عادی تھی۔ اصغر جیلانی کے جانے کے بعد صفدر علی بادل ناخواستہ کام میں دل لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

فون کی گھنٹی بجی تو صفدر علی نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک آٹھ بج کر بیس منٹ کا وقت بتا رہا تھا۔ اس نے ریسیور میں "ہیلو" کہا دوسری جانب اصغر جیلانی تھا۔

"کیا ہوا اصغر صاحب؟" صفدر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"میں نے تمہارا کام کر دیا ہے۔ صفدر!"

"اوہ تھینکس!" صفدر کے سینے سے طمانیت بھری سانس خارج ہوئی۔ اس نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔ "کیا رقم کا بندوبست ہو گیا؟"

"رقم کے بندوبست کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیا مطلب؟"

اصغر جیلانی نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "تم فوری طور پر میرے پاس چلے آؤ۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا جناب!" صفدر نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "رقم کے بندوبست کی ضرورت کیوں نہیں رہی؟"

اصغر جیلانی نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "بے وقوف' میں نے بھائی صاحب کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ میں نے انہیں یقین دلا دیا ہے کہ تم کوئی گھپلا کر ہی نہیں سکتے۔ تم نے فیکٹری اکاؤنٹ میں سے جو رقم نکالی تھی وہ میرے ایما پر ہی نکالی تھی۔ میں نے بھائی صاحب کو بتایا ہے کہ مجھے اچانک فوری طور پر دو لاکھ روپے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ بات کچھ ایسی تھی کہ میں بھائی صاحب سے ذکر نہیں کر سکتا تھا اس لیے تم سے میں نے وہ رقم بہ طور قرض لے لی۔"

"میرا روم روم آپ کے احسانات میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے اصغر صاحب!" صفدر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ نے مجھے بچانے کے لیے خود پر بات لے لی۔"

"جب تمہیں دوست کہا ہے تو یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔"

صفدر نے پوچھا۔ "کیا انور صاحب نے آپ کی بات کا یقین کر لیا ہے؟"

"جزوی طور پر۔"

"میں سمجھا نہیں!" صفدر کا لہجہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

اصغر جیلانی نے بتایا۔ "بھائی صاحب' تم سے میرے بیان کی تصدیق چاہتے ہیں اس لیے تم فوری طور پر یہاں چلے آؤ۔"

"کیا آپ اس وقت انور صاحب کے بنگلے پر ہیں؟"

"ہاں' میں یہیں ہوں۔" اصغر جیلانی نے کہا۔ "اور بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"میں ابھی آ رہا ہوں جناب!"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ صفدر نے ریسیور رکھا۔ میز پر پھیلی ہوئی مختلف فائلوں اور رجسٹرز کو ان کی مناسب جگہوں پر رکھا اور دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت دیوار گیر کلاک ساڑھے آٹھ کا وقت بتا رہا تھا۔

صفدر علی کے بیان کے مطابق جب وہ انور جیلانی کے بنگلے پر پہنچا تو نو بجنے میں چند منٹ باقی

تھے۔ اس نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد چوکیدار صنوبر اسے اپنے ساتھ بنگلے کے اندرونی حصے میں لے جا رہا تھا۔

وہ دونوں ایک ایسے کمرے میں پہنچے جہاں اصغر جیلانی پہلے سے موجود تھا۔ جیسے ہی صفدر نے مصافحے کے لیے اصغر جیلانی کی طرف ہاتھ بڑھایا' پیچھے سے صنوبر خان نے اس کی گدی پر ایک ناپا تلا ہاتھ رسید کیا۔ صفدر لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ اس کے ساتھ ہی اصغر جیلانی نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ وہ اس غیر متوقع صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مارے تعجب کے اس کی زبان پر تالا پڑ گیا تھا۔ وہ بولنا چاہتا تھا' اصغر جیلانی سے اس روپے کے بارے میں سوال کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اب صنوبر خان بھی اس پر ٹھڈے برسا رہا تھا۔

جب وہ دونوں اچھی طرح اس کی مرمت کر چکے تو وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا تھا۔ صفدر علی کے سر میں اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں اور اسے کمرے کے در و دیوار چکراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان ناگہانی حالات کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتا تو اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا۔ اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی تو تیورا کر گر پڑا۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ناچار وہ وہیں لیٹ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور تین چار پولیس والے کمرے میں داخل ہوئے۔ پولیس والوں کے پیچھے صفدر علی کو اصغر جیلانی اور صنوبر خان کے چہرے بھی دکھائی دیے۔

اصغر جیلانی نے چیخ کر کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! یہی ہے میرے بھائی کا قاتل۔ اسے فوری طور پر گرفتار کر لیں۔“

صفدر نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے باری باری سب کو دیکھا اور منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مم...... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑی پہنا دی۔ صفدر علی نے مزاحمت کرنا چاہی تو پولیس والوں نے اسے زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ پہلے ہی خاصی مار کھا چکا تھا' اب مزید ٹھکائی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ہر قسم کی مزاحمت ترک کر کے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

پولیس پندرہ بیس منٹ تک اس سے مختلف سوالات کرتی رہی لیکن اس کے پاس پولیس والوں کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انسپکٹر نے موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد گواہوں کے بیانات نوٹ کیے اور صفدر علی کو اپنے باس انور جیلانی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔

یہ تھے وہ حالات جن کا شکار ہو کر صفدر علی اپنے باس کے بنگلے سے حوالات' حوالات سے عدالت اور عدالت سے جیل پہنچ گیا تھا۔ وہ گزشتہ ایک سال سے ایک ایسے جرم کی پاداش میں تختہ مشق

بنا ہوا تھا جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔

❀❀❀

پوسٹ مارٹم کے مطابق مقتول انور جیلانی کی موت بیس اکتوبر کی شب آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلۂ قتل ایک تیز دھار چھری تھی جس کا پھل دس انچ کا تھا۔ قصابوں والی اس چھری سے انور جیلانی کی گردن کاٹی گئی تھی۔ شہ رگ کٹنے سے خون اس تیزی سے بہا تھا کہ چند منٹ میں ہی انور جیلانی کی موت واقع ہو گئی تھی۔ انور جیلانی کو اس کے بیڈ روم میں اس کے بیڈ کے اوپر قتل کیا گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے موکل صفدر علی کے بیان سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات میں سب سے اہم بیان اصغر جیلانی کا تھا۔ وہ اس مقدمے کا مدعی بھی تھا اور مقتول انور جیلانی کا واحد وارث بھی۔ اصغر جیلانی کے بیان میں مجھے ایک ایسا نکتہ مل گیا تھا جو اس کیس کا پانسہ پلٹ سکتا تھا۔ وہ زیادہ ہوشیاری دکھانے کے چکر میں ایک ایسی غلطی کر گیا تھا جو میرے لیے بہت مفید ثابت ہونے والی تھی۔ اس کا بیان پڑھ کر مجھے یقینِ واثق ہو گیا تھا کہ صفدر علی بہرحال قاتل نہیں تھا۔

اصغر جیلانی نے پہلے پولیس کو اور پھر عدالت میں جو بیان دیا تھا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ اصغر کے مطابق' صفدر علی نے فیکٹری کے کیش میں دو لاکھ روپے کا غبن کیا تھا۔ جب انور جیلانی کو اس کی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے صفدر کو اپنے کمرے میں بلا کر استفسار کیا۔ صفدر صاف مکر گیا۔ انور جیلانی نے کیش رجسٹر اور بینک بیلنس وغیرہ دکھانے کو کہا تو وہ چابی گھر بھول آنے کا بہانہ کرنے لگا۔ بہرحال انور جیلانی نے اس سے کہا کہ وہ فوری طور پر گھر جائے اور چابی لے کر آئے پھر تمام ضروری رجسٹر اور کاغذات لے کر اس کے بنگلے پر پہنچ جائے۔ انور جیلانی اپنے چھوٹے بھائی کی موجودگی میں بنگلے پر صفدر علی سے باز پرس کرنا چاہتا تھا۔

صفدر علی آٹھ بیس پر انور جیلانی کے بنگلے پر پہنچا۔ اصغر جیلانی وہاں پہلے سے موجود تھا اور دونوں بھائی بیڈ روم میں صفدر کا انتظار کر رہے تھے۔ چوکیدار نے صفدر کی آمد کی اطلاع دی تو انور نے اسے بیڈ روم میں ہی طلب کر لیا۔ جب انور جیلانی نے دیکھا کہ صفدر خالی ہاتھ آیا ہے تو وہ سخت برہم ہوا۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ رجسٹر وغیرہ لے کر آنا؟“

”سر میں ابھی ہر بات کی وضاحت کرتا ہوں۔“ صفدر نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ مجھے سانس تو لینے دیں۔“

”ٹھیک ہے' ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔“ انور جیلانی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

صفدر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی روداد سنانے لگا۔ اس دوران میں اصغر جیلانی ہاتھ منہ دھونے کے

لیے ملحق واش روم میں چلا گیا۔ اصغر کے بیان کے مطابق اس نے واش روم کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ وہ منہ دھونے کے بعد تولیے سے خشک کر رہا تھا کہ اس نے واش بیسن کے آئینے میں ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔ اس آئینے میں وہ کرسی واضح طور پر نظر آ رہی تھی جہاں صفدر علی بیٹھا ہوا تھا۔ اصغر جیلانی نے دیکھا کہ انور جیلانی سے بات کرتے ہوئے صفدر اچانک کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا پھر اس نے اپنی انٹی میں سے ایک کنگ سائز چھری برآمد کی اور انور جیلانی کی طرف جھپٹا پھر اس سے قبل کہ اصغر جیلانی اس صورت حال کو سمجھ پاتا' صفدر بیڈ پر لیٹے ہوئے انور جیلانی کی شہ رگ پر چھری پھیر چکا تھا۔

اصغر جیلانی باتھ روم سے باہر نکلا تو صفدر آلۂ قتل کو وہیں پھینک کر موقع واردات سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اصغر نے آواز دے کر چوکی دار صنوبر خان کو بلایا۔ پھر دونوں نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے صفدر کو دبوچ لیا۔ بعدازاں انہوں نے اسے انور جیلانی کے بیڈروم سے ملحقہ ایک دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ اس کے بعد اصغر جیلانی نے فی الفور پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ اصغر جیلانی نے اپنے بیان میں اس بات کا اقرار کیا تھا کہ صفدر علی پر قابو پانے کے لیے اسے اور چوکی دار صنوبر خان کو ہاتھ پاؤں کا استعمال بھی کرنا پڑا تھا۔

استغاثہ کی جانب سے عدالت میں نصف درجن گواہوں کے نام پیش کیے گئے تھے جن میں مقتول کا چھوٹا بھائی اور اکلوتا وارث اصغر جیلانی' مقتول کی سیکرٹری نازیہ ناز' بنگلے کا چوکی دار صنوبر خان' جیلانی سوپ انڈسٹریز کا فورمین فراست علی اور مقتول کے دو پڑوسی دلدار حسین اور فیاض کرمانی شامل تھے۔ ان آخرالذکر پڑوسیوں کو پولیس نے مشیرنامہ تیار کرتے وقت جائے وقوعہ پر بلا لیا تھا۔

دلدار حسین اور فیاض کرمانی کا بیان محض کاغذات کا پیٹ بھرنے کے لیے شامل کیا گیا تھا ورنہ ان کے بیان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ وہ صرف اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے انور جیلانی کو ذبح شدہ حالت میں اپنے بیڈروم میں پڑا دیکھا تھا۔ انہیں یہ بات بھی اصغر جیلانی کی زبانی معلوم ہوئی تھی کہ انور جیلانی کو صفدر نے قتل کیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان دونوں کے ناموں پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ باقی چار گواہوں کو میں نے گھنے کا فیصلہ کیا۔ خصوصی طور پر اصغر جیلانی کو تو میں ایسا رگڑا دینا چاہتا تھا کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں۔ سارے فساد کی جڑ وہی شخص تھا۔ اس کے بیان میں سے میں نے جو نکتہ تلاش کیا تھا' وہ اصغر جیلانی کو چاروں خانے چت کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نکتے کا ذکر مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گا۔

ہم مقررہ روز عدالت میں پیش ہوئے۔ اس پیشی پر رفیق باجوہ کے بجائے میں صفدر علی کی وکالت کر رہا تھا۔ اپنے کیس کی آواز پڑنے پر جب ہم عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے تو وکیل سرکار کو ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص سے رازدارانہ انداز میں سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھا۔ اس خوش پوش شخص کے ساتھ ایک ماڈرن اور خوش شکل خاتون بھی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص مقتول کا بھائی اصغر جیلانی اور اس کی ساتھی خاتون نازیہ ناز تھی۔

جج نے ہمارے کیس کی فائل کا بغور جائزہ لیا۔ پھر حاضرین پر نگاہ دوڑانے کے بعد بھاری آواز میں کہا۔ ''اس کیس کے تمام متعلقہ افراد عدالت کے کمرے میں موجود ہیں؟''

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''یور آنر' میں نے چند روز قبل ملزم صفدر علی کا کیس اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ کیس فائل کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم کی طرف سے مکمل حقائق اور واقعات عدالت میں پیش نہیں کیے گئے حتیٰ کہ ملزم کا بیان بھی ادھورا ہے۔''

جج نے اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی کیس فائل کو دیکھا اور پوچھا۔ ''وکیل صاحب! یہ بات آپ محض تاریخ لینے کے لیے کہہ رہے ہیں یا آپ کے پاس کوئی ٹھوس دلیل بھی ہے؟''

''جناب عالی! میں اپنے پاس ٹھوس دلیل رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سردست میں اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔''

وکیل سرکار نے کہا۔ ''یور آنر' وکیل صفائی ایک سیدھے سادے کیس کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں ہے میرے دوست!'' میں نے وکیل سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر یہ کیس اتنا ہی سیدھا سادہ ہوتا تو اب تک اچھی خاصی کارروائی ہو چکی ہوتی بلکہ میرے خیال میں تو اب تک اس کا مقررہ فیصلہ بھی ہو جانا چاہیے تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''میرے فاضل دوست! میں اس کیس کے خفیہ پہلوؤں کو سامنے لا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا چاہتا ہوں۔'' پھر میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی' میرا موکل ایک سادہ دل انسان ہے جو ایک سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوا ہے۔ میں اس مقدمے کے درپردہ پہلوؤں کو ملزم کے اضافی بیان کی صورت میں معزز عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں لرنڈ کورٹ سے استدعا کرتا ہوں کہ ملزم کا اضافی بیان شامل مسل کرنے کے لیے مقدمے کی تاریخ دے دی جائے۔''

وکیل استغاثہ نے فوری اعتراض جڑ دیا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی کی درخواست کے دونوں حصے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نہ تو نئی تاریخ کی ضرورت ہے اور نہ ہی ملزم کے اضافی بیان کی۔ میرے خیال میں عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھانا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! اب تک جو وکیل صفائی اس کیس کی پیروی کرتا رہا ہے' میں اس کی کارکردگی سے انتہائی غیر مطمئن ہوں۔ مجھے باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ وکیل صفائی نے اس کیس کے بہت سے نہایت اہم پہلوؤں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے کیس کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے اس لیے عدالت سے میری درخواست ہے کہ حقائق کو اپنی تمام تر وضاحت کے ساتھ عدالت کے علم میں آنا چاہیے تا کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔''

جج نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے دس روز بعد کی تاریخ دے دی۔ میں نے نہایت

مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''یور آنر! میں ایک چھوٹی سی استدعا مزید کرنا چاہتا ہوں۔'' وکیل استغاثہ نے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں اس کیس کو جلد از جلد حل کرنے کے لیے اپنے پاس نہایت اہم پوائنٹ رکھتا ہوں۔ اور یہ چاہتا ہوں کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے چار گواہان اصغر جیلانی، نازیہ ناز، فراست علی اور صنوبر خان کو عدالت میں حاضر ہونے کی خصوصی تاکید کی جائے۔''

جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ مذکورہ گواہوں کو آئندہ پیشی پر ضرور عدالت میں لائیں۔''

''آل رائٹ یور آنر۔'' وکیل استغاثہ نے سر جھکا کر کہا۔

❀ ❀ ❀

آئندہ پیشی پر میں نے اپنے مؤکل صفدر علی کا اضافی بیان عدالت میں داخل کر دیا۔ جج نے کئی صفحات پر مشتمل اس اضافی بیان پر نگاہ دوڑاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! یہ تو خاصا طویل بیان ہے۔ ملزم نے اس سے پہلے ان باتوں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟''

اس اضافی بیان میں، میں نے دراصل اصغر جیلانی کے کرتوتوں کی تفصیل درج کی تھی۔ اصغر نے صفدر کو جس طرح بے وقوف بنایا تھا اور زیادہ منافع کا لالچ دے کر اسے جس طرح بے ایمانی پر مجبور کیا تھا، میں نے مرحلہ وار ہر بات اس بیان میں شامل کر دی تھی۔

جج کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''جناب عالی! میرا مؤکل اتنا سیدھا ہے کہ دوست اور دشمن کی تمیز نہیں کر سکتا۔ وہ جس وکیل کو اپنا ہمدرد سمجھ رہا تھا، وہ ایک بھاری رقم لے کر مخالف پارٹی سے مل گیا تھا اور انہی کے اشاروں پر میرے مؤکل کو مس گائیڈ کر رہا تھا۔ میرے مؤکل نے اسے ان واقعات کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تو وکیل موصوف نے انہیں ''غیر ضروری'' گردانتے ہوئے نظر انداز کر دیا اور ملزم صفدر علی کو باور کرایا کہ اگر اس نے عدالت میں یہ قضیہ چھیڑا تو پھر اس کی بریت کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔''

وکیل استغاثہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ جج نے اضافی بیان کی ایک کاپی وکیل استغاثہ کو تھما دی۔ وہ ان کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جب اس بیان کی حقیقت اس پر کھلی تو اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! اس طول طویل بیان کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ اصل بات محض اتنی سی ہے کہ ملزم نے اپنے محسن مقتول انور جیلانی کی رقم میں دو لاکھ روپے کا غبن کیا تھا۔ مقتول کو ملزم کی اس حرکت کا علم ہو گیا اور اس نے ملزم کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی۔ جواب میں ملزم نے انور جیلانی کے بنگلے پر پہنچ کر اسے قتل کر دیا۔ وکیل صفائی معاملات کو الجھا کر کیس کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔''

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ملزم کے اضافی بیان کا خلاصہ معزز عدالت کے سامنے بیان کریں۔''

میں نے جج کی ہدایت پر عمل کیا۔ اپنے بیان کے آخر میں، میں نے کہا۔ ''یور آنر! میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ اس نے انور جیلانی کو قتل نہیں کیا بلکہ جب وہ بنگلے پر پہنچا تو اس کے ساتھ خلاف توقع حالات پیش آئے جن کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے۔ ملزم کو اس بات کا اقرار ہے کہ اس نے انور جیلانی کی فیکٹری کے اکاؤنٹس میں سے دو لاکھ روپے نکالے تھے۔ اس کی وجوہات بھی بیان کی جا چکی ہیں۔ میں استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے دوران میں یہ بات ثابت کر دوں گا کہ قتل میرے مؤکل نے نہیں کیا۔''

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''جناب عالی، یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قتل کا محرک غبن ہے۔ ملزم نے اپنے اضافی بیان میں بھی دو لاکھ روپے کے غبن کا اقرار کیا ہے۔ پھر سب سے مضبوط شہادت استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے چھوٹے بھائی اصغر جیلانی کی ہے جو اس قتل کا عینی شاہد بھی ہے۔''

جج نے عدالت کے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''کیا استغاثہ کے مطلوبہ گواہان موجود ہیں؟''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''اصغر جیلانی اور صنوبر خان موجود نہیں ہیں۔ اصغر جیلانی نے بیماری کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے اور صنوبر خان کو اچانک ایبٹ آباد جانا پڑ گیا ہے۔''

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ باقی ماندہ گواہوں پر جرح کریں گے یا آئندہ پیشی کی تاریخ دے دی جائے۔''

میں نے کہا۔ ''یور آنر! مجھے معزز عدالت کے قیمتی وقت کا بہت احساس ہے اور میری شدید خواہش ہے کہ یہ کیس جلد از جلد کسی نتیجے سے ہم کنار ہو جائے اس لیے میں حاضر اسٹاک گواہوں پر ضرور جرح کروں گا۔''

جج کی اجازت سے پہلے ''جیلانی سوپ انڈسٹری'' کا فورمین فراست علی گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ اس نے اپنے گزشتہ بیان کو دہرایا۔ میں صفحات کی تنگی کے سبب اس کے بیان کا ذکر حذف کرتے ہوئے براہ راست جرح کی طرف آتا ہوں۔ جج کی اجازت کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''فراست صاحب! میں نے کٹہرے کے نزدیک آ کر کہا۔'' وقوعہ کے روز آپ کتنے بجے تک فیکٹری میں موجود تھے؟''

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''اس روز میں دس بجے تک فیکٹری کے ورکنگ ڈیپارٹمنٹ میں موجود رہا تھا۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں' مذکورہ روز ملزم صفدر علی کتنے بجے تک دفتر میں موجود رہا تھا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''ٹھیک آٹھ بجے صفدر علی فیکٹری سے نکل گیا تھا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ رٹا رٹایا جواب دے رہا تھا اور یہ جواب اسے یقینی طور اصغر جیلانی نے یاد کرایا ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ ''فراست صاحب! آپ یہ بتائیں کہ آٹھ بجے سے پہلے بھی ملزم کچھ دیر کے لیے فیکٹری سے باہر گیا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''انور صاحب کے جانے کے تھوڑی دیر بعد صفدر علی ایک گھنٹے کے لیے فیکٹری سے چلا گیا تھا۔ وہ واپس آیا اور اپنے دفتر میں مصروف رہا پھر ٹھیک آٹھ بجے وہ چھٹی کر کے چلا گیا تھا۔''

اصغر جیلانی نے بہت محنت سے اسے سب کچھ یاد کرایا تھا۔ میں نے ذرا دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ ''فراست صاحب! آپ کے خیال میں ملزم صفدر علی کیسا شخص ہے؟''

''اس واقعے سے پہلے تو میرے نزدیک وہ ایک اچھا انسان تھا۔'' فراست علی نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کسی نے سچ کہا ہے' انسان کو بدلتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگتی۔''

میں نے پوچھا۔ ''فراست صاحب! فیکٹری کا ورکنگ ڈیپارٹمنٹ دفتری حصے سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''فاصلہ نہ زیادہ ہے اور نہ ہی کم ہے۔''

''کیا صفدر علی اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ورکنگ ڈیپارٹمنٹ پر نظر رکھ سکتا ہے؟''

''یہ تو ممکن نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ورکنگ ڈیپارٹمنٹ کے اندر سے صفدر علی کو بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا؟''

''ظاہری بات ہے۔'' فراست علی نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ انور صاحب کے جانے کے بعد صفدر علی ایک گھنٹے کے لیے فیکٹری سے کہیں چلا گیا تھا۔ واپسی پر وہ اپنے دفتر میں مصروف رہا پھر ٹھیک آٹھ بجے وہ چھٹی کر گیا تھا؟''

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہاں' میں نے یہی کہا ہے۔''

''آپ کو وقوعہ کے روز صفدر علی کی ان مصروفیات کا کیسے علم ہوا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا یہ سب کچھ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟''

''جی ہاں' میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ اس وقت ورکنگ ڈیپارٹمنٹ میں نہیں ہوں گے؟''

''جی نہیں...... جی ہاں......'' وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

جج نے اسے سرزنش کی۔ ''مسٹر فراست! پہلے سوال پر غور کرو پھر کوئی ایک جواب دو۔''

فراست علی خاصا ہراساں نظر آنے لگا' سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جناب' ویسے تو میں پورا وقت ورکنگ ڈیپارٹمنٹ میں ہی رہا تھا لیکن یہ اتفاق ہے کہ جب ملزم ایک گھنٹے کے لیے فیکٹری سے کہیں باہر گیا تھا تو اس وقت میں دفتر کے آس پاس ہی تھا...... اور اس بات کو بھی اتفاق ہی سمجھ لیں کہ رات آٹھ بجے میں کسی کام سے فیکٹری کے گیٹ کے قریب کھڑا تھا تو میں نے صفدر علی کو فیکٹری سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس وقت ملزم نے تم سے کوئی بات کی تھی؟''

اس نے نفی میں جواب دیا' میں نے سوال کیا۔ ''کیا اس وقت تم نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا یا محض یہ تمہارا اندازہ ہے کہ ملزم ٹھیک آٹھ بجے فیکٹری سے نکلا تھا؟''

''میرا خیال ہے' میں نے وقت دیکھا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''فراست علی! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وقوعہ کے روز انور جیلانی کے جانے کے بعد ایک گھنٹے کے لیے ملزم فیکٹری سے باہر رہا تھا۔ کیا یہ بات تمہیں اصغر جیلانی نے بتائی تھی؟''

''جی ہاں' اصغر صاحب ہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔''

وہ روانی میں سچ بول گیا تھا لیکن جب اسے اپنے جواب کی سنگینی کا احساس ہوا تو پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے اسے سوچنے کا موقع دیے بغیر اگلا سوال کیا۔

''فراست علی! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ ملزم کی فیکٹری سے ایک گھنٹے کی غیر حاضری کے بارے میں تمہیں اتفاق سے معلوم ہو گیا تھا کیونکہ تم اس وقت دفتر کے آس پاس ہی موجود تھے۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ یہ بات تمہیں اصغر جیلانی نے بتائی تھی۔ تمہاری کون سی بات کو سچ سمجھا جائے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے فی الفور مداخلت ضروری سمجھی اور کہا۔ ''اصغر جیلانی والی بات وکیل صفائی نے خود گواہ کو سجھائی تھی۔''

''اور استغاثہ کے گواہ نے اس کی تصدیق کی ہے۔'' میں نے معنی خیز نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''آپ کو اعتراض کس بات پر ہے۔ وکیل صفائی کے بات سجھانے پر یا گواہ کے تصدیق کرنے پر؟''

وکیل استغاثہ کھسیانہ انداز میں بولا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''واللہ' میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

جج نے وکیل استغاثہ کا اعتراض مسترد کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کوئی اور سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنر۔''

''فراست علی کے بعد نازیہ ناز گواہوں کے کٹہرے میں آ کر کھڑی ہوئی۔ میں نے جج کی اجازت سے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''نازیہ ناز صاحبہ! کیا میں آپ کو صرف ناز کہہ سکتا ہوں؟''

وہ بولی۔ ''آپ مجھے نازیہ کہیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔''

''اوکے نازیہ صاحبہ!'' میں نے خوش دلی سے کہا پھر پوچھا۔ ''نازیہ صاحبہ! میں نے سنا تھا آپ اصغر جیلانی سے شادی کرنے والی تھیں۔ کیا یہ نیک فریضہ تکمیل کے مراحل سے گزر چکا؟''

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیل استغاثہ نے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔

''وکیل صفائی معزز گواہ کی ذات پر حملہ کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھا جائے۔''

جج کے کچھ بولنے سے پہلے نازیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو مس گائیڈ کیا گیا ہے۔ آپ کی معلومات ناقص ہیں۔ اصغر جیلانی میرے باس کے چھوٹے بھائی ہیں اور ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہ تھی اور نہ ہے جو شادی پر منتج ہو۔''

نازیہ کے اعتماد نے مجھے متاثر کیا۔ مجھے تو اس بات پر ہی حیرت تھی کہ اصغر جیلانی کی غیر حاضری کے باوجود بھی وہ میری جرح کا سامنا کرنے چلی آئی تھی۔ یہ اس کا اپنی ذات پر مضبوط اعتماد ہی تھا۔ در حقیقت نازیہ اور اصغر نے صفدر کے ساتھ جو ''کھیل'' کھیلا تھا اس کے لیے اعتماد بنیادی شرط تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ کھلاڑیوں کے ساتھ نہایت عمدگی سے کھیلنا چاہیے۔ میں نے اصغر جیلانی کو شکار کرنے کے لیے ناز کو چارے کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کیا اور اس پر ایسی جرح کرنے لگا جو بظاہر غیر متعلقہ تھی۔ اس سے میں نازیہ پر یہ تاثر بھی چھوڑنا چاہتا تھا کہ میں ایک بے ضرر سا وکیل تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''نازیہ صاحبہ! آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟''

''گارڈن ویسٹ کے ایک فلیٹ میں۔''

''اصغر جیلانی صاحب کہاں رہتے ہیں؟''

''وہ پاپوش میں رہتے ہیں۔''

''نازیہ صاحبہ!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اصغر صاحب آج عدالت میں کیوں حاضر نہیں ہوئے؟''

''یہ تو آپ ان ہی سے پوچھیے گا۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا ثبوت دینا ضروری

سمجھا۔ ''یور آنر! میں معزز عدالت کو بتا چکا ہوں کہ گواہ اصغر جیلانی نے بیماری کا سرٹیفکیٹ دیا ہے پھر وکیل صفائی کے اس سوال کی کیا تک ہے۔ میرے فاضل دوست خواہ مخواہ عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھے ٹو دی پوائنٹ جرح کرنے کی ہدایت کی۔

میں نے کہا۔ ''نازیہ صاحبہ! وقوعہ کے روز...... یعنی بیس اکتوبر کو آپ دفتر سے کتنے بجے نکلی تھیں؟''

''میں روزانہ پانچ بجے آف کرتی ہوں۔'' نازیہ نے جواب دیا۔

''آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ جب انور جیلانی ملزم کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے تو ان کی کچھ باتیں آپ نے بھی سنی تھیں؟''

''جی ہاں۔'' نازیہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''انور صاحب کیش کے ہیر پھیر کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے اور ایک موقع پر انہوں نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔''

''آپ سے آخری سوال۔'' میں نے نازیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ سیٹھ ولی بھائی رنگون والا کو جانتی ہیں؟''

''میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں۔''

''دیٹس آل یور آنر۔'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

وکیل استغاثہ نے حیرت سے مجھے دیکھا کیونکہ میں انتہائی سخت جرح کے لیے مشہور تھا۔ وکیل موصوف کی حیرت بجا تھی۔ میں نے نازیہ پر سخت جرح کی تھی اور نہ ہی اس سے کوئی کام کی بات اگلوا سکا تھا۔ میں اس کی وجہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میں نے یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! آئندہ پیشی پر گواہان اصغر جیلانی اور صنوبر خان کی عدالت میں موجودگی نہایت ضروری ہے۔ میں ان پر بہت اہم جرح کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو تاکید کی۔ ''وکیل صاحب! آپ اپنے گواہوں کو عدالت میں حاضر کریں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے؟''

''وہ آئندہ پیشی پر عدالت میں موجود ہوں گے۔'' وکیل استغاثہ نے یقین دلایا۔

میرے موکل صفدر علی کی بیوی نزہت بیگم ہر پیشی پر باقاعدہ عدالت میں حاضر ہوتی تھی۔ وہ اب تک کی عدالتی کارروائی اور میری کارکردگی سے مطمئن تھی۔ ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو

اس نے پوچھا۔

''بیگ صاحب! میرا شوہر باعزت بری ہو جائے گا نا؟''

میں نے کہا۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟''

وہ بولی۔ ''آپ بہت عمدہ جا رہے ہیں۔ آپ نے ایک ڈیڑھ ماہ میں کیس کا نقشہ پلٹ دیا ہے۔''

''تو پھر خدا پر بھروسا رکھیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیس پر میری گرفت مضبوط ہے۔ انشاء اللہ آئندہ پیشی پر کیس کا نتیجہ بڑا واضح ہو جائے گا۔''

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''خدا پر تو میرا پورا اعتماد ہے۔ زمینی سہارا آپ ہیں۔''

میں نے اس کی تسلی تشفی کے لیے دو چار مزید باتیں کیں اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔ آج وہ خاصی پر امید اور مطمئن تھی۔

میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

❁ ❁ ❁

منظر اس عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ اور مقتول کا چوکی دار صنوبر کھڑا تھا۔ جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا اور میں جج کی اجازت سے جرح کے لیے آگے بڑھا۔ آج عدالت کے کمرے میں خاصا رش تھا۔ نزہت بیگم کے علاوہ سیٹھ رمضان بھائی دبئی والا بھی موجود تھا۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے صنوبر خان سے پوچھا۔ ''خان صاحب! آپ پچھلی پیشی پر غیر حاضر تھے۔ آپ کے وکیل نے بتایا تھا کہ آپ کسی ضروری کام سے ایبٹ آباد چلے گئے تھے۔ وہ ضروری کام کیا تھا؟''

''چہ وکیل صیب' ادھر ایبٹ آباد میں امارا نانی کے بیٹے کا بیٹی انتقال فرما گیا تھا اسی لیے ام کو ضروری جانا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''خان صاحب! آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ آپ اصغر جیلانی کے پکارنے پر اندر گئے تھے اور آپ نے اصغر کے ساتھ مل کر ملزم پر قابو پایا تھا۔ بعدازاں اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ ملزم کی آمد کے کتنی دیر بعد اصغر جیلانی نے آپ کو اندر بلایا تھا؟''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''امارا خیال ہے' پندرہ بیس منٹ بعد۔''

میں نے کہا۔ ''اندر جا کر آپ نے کیا دیکھا؟''

وہ ملزم صفدر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اس خدائی خوار نے امارے مالک کو قتل کر دیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ذرا سوچ کر بتائیں' اصغر جیلانی جس جگہ ملزم سے الجھا ہوا تھا' مقتول کی لاش وہی پڑی تھی؟''

''امارے مالک کا لاش بیڈ روم میں پڑا تھا۔'' صنوبر خان نے جواب دیا۔ ''امیں اصغر صاحب نے بھی بتایا اور ام نے بیڈ روم میں جھانک کر بھی دیکھا تھا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''اس کے بعد..... اس کے بعد ام نے اور اصغر صیب نے مل کر ملزم کو قابو کیا اور اسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔'' صنوبر خان نے بتایا۔ ''پھر اصغر صیب نے پولیس کو پون کر دیا تھا۔''

میں نے جج کی میز پر پڑے ہوئے آلۂ قتل کو اٹھا لیا۔ وہ کنگ سائز قصابوں والی چھری ایک سیلوفین بیگ میں محفوظ تھی۔ میں نے وہ سیلوفین بیگ صنوبر خان کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس کو پہچانتے ہیں خان صاحب؟''

''وکیل صیب' آپ ام سے کیوں مذاق فرماتا ہے!''

''اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟'' میں نے تعجب خیز نظروں سے اسے گھورا۔

''او یارا! یہی تو وہ ظالم چھری ہے' جس سے ملزم نے امارے مالک کا گلا کاٹا تھا۔'' صنوبر خان نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی چھری ہے؟''

''ایک دم پکا یقین۔'' وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''ام اس تلوار کے مافق قاتل چھری کو کیسے بھول سکتا ہے۔''

میں نے آلۂ قتل والا سیلوفین بیگ واپس جج کی میز پر رکھ دیا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ آلۂ قتل کی شناخت سے میں جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا' وہ پورا ہو چکا تھا۔''

میں صنوبر خان کی طرف مڑا اور سوال کیا۔ ''خان صاحب! آپ کو مقتول کے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟''

''ایک سال۔''

''آپ خود ملازمت کی تلاش میں مقتول انور جیلانی سے ملے تھے یا کسی اور نے آپ کو اس کے پاس بھیجا تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''اصغر صیب نے امارا سفارش کیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''خان صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے ملزم کے لیے گیٹ کھولا تھا' کیا یہ سچ ہے؟''

''جی ہاں' ام نے ہی گیٹ کھولا تھا۔''

''اس وقت کیا بجا تھا؟''

''ام نے گھڑی نہیں دیکھا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اپنے بیان میں بتایا کہ آپ ملزم کو اپنے ساتھ لے کر بنگلے کے اندر

گئے تھے؟‘‘

’’ہاں ام نے یہی بیان دیا ہے۔‘‘

’’ذرا سوچ کر بتاؤ خان صاحب!‘‘ میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔ ملزم اس وقت نارمل انداز میں چل رہا تھا یا اس کی چال مین آپ نے کوئی لنگڑاہٹ محسوس کی تھی؟‘‘

’’وہ ایک صحت مند آدمی کے مافق چل رہا تھا۔‘‘ صنوبر خان نے جواب دیا۔

’’آپ نے اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دیکھی تھی؟‘‘

صنوبر خان نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ’’اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔‘‘

’’صنوبر خان، آپ ملزم کو بنگلے کے کس حصے میں چھوڑنے گئے تھے؟‘‘

’’میں نے اسے اپنے مالک کے بیڈروم میں پہنچادیا تھا۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’وہاں آپ کے مالک کے علاوہ بھی کوئی تھا؟‘‘

’’اصغر صیب بھی وہاں موجود تھے۔‘‘

’’آپ کا مالک مقتول انور جیلانی اس وقت کیا کر رہا تھا؟‘‘

’’ام کو کیا مالوم۔‘‘ صنوبر خان میرے سوال سے الجھ گیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ’’آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول اس وقت بیڈروم میں موجود نہیں تھا؟‘‘

صنوبر خان نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور بتایا۔ ’’امارا یہ مطلب نہیں تھا۔ انور صیب اس وقت اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔‘‘

میں نے دو چار رسمی سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا۔

صنوبر خان کے بعد اس کیس کا مدعی اور استغاثہ کا سب سے اہم گواہ اصغر جیلانی کٹہرے میں آیا۔ میں بڑے خشوع وخضوع سے اس کی جانب بڑھا۔ جج سے اجازت لینے کے بعد میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ میرے پاس اتنے اہم پوائنٹس موجود تھے کہ میں بہت جلد اسے چت کر سکتا تھا۔

’’اصغر جیلانی صاحب!‘‘ میں نے نہایت ہی شائستہ لہجے میں کہا۔ ’’میں نے سنا تھا کہ پچھلے دنوں آپ کی طبیعت ناساز تھی۔ اب کیا حال ہے؟‘‘

وہ وکیل مخالف کے دوستانہ رویے سے پہلے تو متعجب ہوا پھر جواب دیا۔ ’’بس ذرا وائرل انفیکشن ہو گیا تھا۔ اب اللہ کا شکر ہے۔‘‘

میں نے ایک مرتبہ پھر جج کی میز سے آلۂ قتل والا سیلوفین بیگ اٹھا لیا۔ چھری کے پھل پر خون خشک ہونے کے بعد سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا۔ دس انچ لمبے پھل والے قصابی چھری میں چار انچ لمبا اور ڈیڑھ انچ چوڑا دستہ لگا ہوا تھا۔ یوں چھری کی کل لمبائی چودہ انچ بنتی تھی۔

میں نے سیلوفین بیگ کو اصغر جیلانی کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور سوال کیا۔ ’’کیا آپ کو یقین ہے کہ اسی چھری سے آپ کے بھائی کو قتل کیا گیا تھا؟‘‘

’’وکیل صاحب! یقین نہ کرنے کی اس میں کون سی بات ہے۔‘‘ وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ ’’میں اس قتل کا عینی شاہد ہوں۔ اس موذی چھری کو بھول سکتا ہوں اور نہ ہی اس خبیث انسان کو۔‘‘ اس نے ملزموں والے کٹہرے میں کھڑے ہوئے میرے موکل صفدر علی کی طرف اشارہ کیا۔

’’اس کا مطلب ہے، آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے؟‘‘

’’مجھے اپنی یادداشت پر فخر ہے۔‘‘ وہ نخوت سے بولا۔

’’ویری گڈ۔‘‘ میں نے توصیفی انداز میں کہا۔ ’’ذرا اپنی یادداشت کو کھنگال کر بتائیں کہ سیٹھ ولی بھائی رنگون والا امریکہ سے واپس آ گئے ہیں یا وہیں سے رنگون چلے گئے ہیں؟‘‘

’’میں کسی رنگون والا کو نہیں جانتا۔‘‘ وہ ناگواری سے بولا۔

وکیل استغاثہ نے مداخلت کی۔ ’’جناب عالی! مجھے اعتراض ہے۔ وکیل صفائی اچانک غیر متعلق سوالات شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں عدالت کے قیمتی وقت کا احساس کرنا چاہیے۔‘‘

جج نے مجھ سے کہا۔ ’’بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات کو انور جیلانی کے قتل تک محدود رکھیں۔‘‘

’’میں اسی طرف آ رہا تھا جناب عالی!‘‘ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے انکسار سے لبریز لہجے میں کہا پھر اصغر جیلانی کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

’’اصغر صاحب! آپ اس قتل کے عینی شاہد ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟‘‘

وکیل استغاثہ نے فوری طور پر کہا۔ ’’جناب! معزز گواہ اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا پھر اس کے عینی شاہد ہونے میں وکیل صفائی کو کیا شک ہے؟‘‘

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ’’آپ کو کوئی شک ہے؟‘‘

’’بات شک کی نہیں ہے جناب عالی!‘‘ میں نے کہا۔ ’’دراصل اب میں جو سوالات کرنے جا رہا ہوں، ان کے لیے ضروری ہے کہ میں گواہ کے عینی شاہد ہونے کی معزز عدالت کے سامنے تصدیق کر لوں۔‘‘

’’آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔‘‘ جج نے بھاری آواز میں کہا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اصغر جیلانی کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ’’آپ مطمئن رہیں وکیل صاحب! میں بھری عدالت کے سامنے ایک مرتبہ پھر اقرار کرتا ہوں کہ میں اپنے بھائی کے قتل کا عینی شاہد ہوں۔‘‘

’’تھینک یو۔‘‘ میں نے سادہ لہجے میں کہا پھر سوال کیا۔ ’’اصغر جیلانی صاحب! آپ کا یہ بیان

ہے کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ملزم صفدر علی نے آپ کے بھائی انور جیلانی پر چھری سے حملہ کیا تھا اور اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی تھی؟"

"جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"اور آپ نے وہ منظر واش روم کے آئینے میں دیکھا تھا؟"

"آدھی بات درست ہے۔" اصغر جیلانی نے مضبوط لہجے میں کہا پھر وضاحت کی۔ "میں نے ملزم کو چھری نکال کر بھائی صاحب پر جھپٹتے ہوئے آئینے میں دیکھا تھا لیکن جب میں واش روم سے نکل کر بیڈ روم میں آیا تو یہ نمک حرام بھائی صاحب کو قتل کر چکا تھا۔"

"آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے بھائی نے ملزم کو ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا تھا۔" میں نے پوچھا۔ "آپ کے بیان کے مطابق ملزم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا؟"

"جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔"

"ملزم کتنی دیر تک اس کرسی پر بیٹھا رہا تھا؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میں ٹھیک طور پر تو نہیں بتا سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ملزم پانچ سات منٹ تو بیٹھا ہوگا۔ اس دوران میں، میں ہاتھ منہ دھونے واش روم میں چلا گیا تھا۔ میں منہ دھونے کے بعد تولیے سے خشک کر ہی رہا تھا کہ میں نے ملزم کو کرسی سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔"

"یعنی آپ نے آئینے میں ملزم کو کرسی سے اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"بالکل درست۔" اصغر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بیڈ روم میں موجود وہ کرسی جس پر ملزم بیٹھا ہوا تھا، ...... واش روم کے آئینے میں بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔"

میں نے کہا۔ "اصغر صاحب! آپ نے پہلے پولیس کو اور بعد میں معزز عدالت کو جو بیان دیا ہے اس میں یہ بات درج ہے کہ آپ نے آئینے میں ملزم کو کرسی سے اٹھتے ہوئے دیکھا، پھر بڑی سرعت کے ساتھ ملزم نے اپنی انٹی سے ایک کنگ سائز چھری نکالی اور آپ کے بھائی صاحب کی طرف جھپٹا۔ پھر جب آپ واش روم سے باہر آئے تو ملزم انور جیلانی کی شہ رگ پر چھری پھیر چکا تھا؟"

"آپ یہ بات کتنی مرتبہ دہرائیں گے؟" وہ بیزاری سے بولا۔

"جتنی مرتبہ ضرورت محسوس ہوگی۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیں، جب ملزم اپنی انٹی سے چھری نکال کر مقتول پر حملہ آور ہوا تو چھری اسی حالت میں تھی؟" میں نے سیلوفین بیگ اس کی نگاہوں کے قریب کر دیا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کے سوال کو سمجھ نہیں پایا ہوں!"

"میں وضاحت کرتا ہوں۔" میں نے پھر پوچھا۔ "آپ یہ بتائیں کہ جب ملزم نے اپنی انٹی سے چھری نکالی تو وہ اسی طرح برہنہ تھی یا کسی خول وغیرہ کے اندر بند تھی؟"

"وہ بالکل اسی طرح تھی......" اس نے چھری کی طرف اشارہ کیا۔

جواب دینے کے بعد وہ پریشان نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ کے چہرے پر بھی الجھن کے آثار تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ دونوں میرے سوال کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے تھے۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! اس کیس کا انکوائری افسر اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے انکوائری افسر انسپکٹر وارث شاہ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے اصغر جیلانی کو بینچ پر بیٹھنے کی ہدایت کی اور انسپکٹر وارث شاہ کو کٹہرے میں بلا لیا۔ میں نے انسپکٹر کے قریب جا کر سوال کیا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ نے ضابطے کی کارروائی کے طور پر آلۂ قتل سے فنگر پرنٹس ضرور حاصل کیے ہوں گے لیکن چالان میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ ملزم موقع پر گرفتار ہوا تھا پھر قتل کا عینی گواہ موجود تھا۔ فنگر پرنٹس لینا ہم نے ضروری نہیں سمجھا۔"

"یعنی آپ نے فنگر پرنٹس لینے کا تکلف ہی نہیں کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا سا بھی نادم نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔ "انسپکٹر صاحب! گرفتاری کے بعد آپ نے ملزم کا طبی معائنہ تو کیا ہوگا؟'

اس نے اثبات میں جواب دیا، میں نے پوچھا "آپ کو ملزم کے جسم پر تازہ زخم کا کوئی نشان ملا تھا؟ بالخصوص رانوں کے پاس؟"

"کوئی نشان نہیں ملا تھا۔"

"ملزم کے کپڑوں پر خون وغیرہ کے دھبے تھے؟"

"جی نہیں۔"

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! انور جیلانی کو ایک تیز دھار چھری سے قتل کیا گیا تھا اور ملزم موقع پر ہی گرفتار ہوا تھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے لباس پر خون کے دھبے موجود نہیں تھے جبکہ اس قسم کی صورتِ حال میں تو مقتول کی گردن سے خون کا ایک فوارہ ابل پڑا ہوگا۔" پھر میں نے انسپکٹر وارث شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"انسپکٹر صاحب! گرفتاری کے بعد آپ نے ملزم کی جامہ تلاشی تو ضرور لی ہوگی۔ آپ کو اس کے لباس میں سے کوئی خول یا کوئی ایسی چیز ملی جس میں چھری کو چھپایا جا سکتا ہو؟"

"نہیں جناب ایسی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔"

"آپ نے موقع واردات کا نقشہ تیار کرتے ہوئے یقینی طور پر جائے وقوعہ کا بغور جائزہ لیا

ہوگا۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''مذکورہ بالا کوئی چیز آپ کی نظر میں آئی؟''

اس نے نفی میں جواب دیا' میں نے پوچھا۔''کیا ملزم نے اقبال جرم کرلیا تھا؟''

''ملزم تا حال اپنے جرم سے انکاری ہے۔'' انسپکٹر وارث شاہ نے جواب دیا۔

میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔''جناب عالی! میں اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ایک عملی ثبوت بالفاظ دیگر ایک عملی مظاہرہ کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے گہری دلچسپی سے مجھے دیکھا۔ وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہا۔''اس عملی مظاہرے کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت ہوگی بیگ صاحب؟''

میں نے کہا۔''جناب عالی! میں پورے انتظام کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوں۔''

وکیل استغاثہ' انسپکٹر وارث شاہ اور اصغر جیلانی بوکھلائی ہوئی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی جج کو دیکھ رہے تھے۔ حاضرین عدالت کی کیفیت بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

''بیگ صاحب! آپ اپنے موکل کے بے گناہی تو ثابت کر سکتے ہیں۔'' جج نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

میں نے عدالت میں موجود افراد پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور حاضرین میں سے ایک شخص کا انتخاب کرلیا۔ وہ ایک صحت مند اور چاق وچوبند شخص تھا۔ میرے اشارے پر وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ عدالت میں موجود ہر شخص کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔

میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے چودہ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی ایک لکڑی نکالی پھر مذکورہ شخص سے کہا۔''آپ اس لکڑی کو اپنی انٹی میں رکھ لیں۔''

اس شخص کا نام کریم بخش تھا۔ کریم بخش نے میری ہدایت پر عمل کیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔''کریم بخش صاحب! اب آپ عدالت کے کمرے میں چل پھر کر دکھائیں۔''

کریم بخش نے دوبارہ میری ہدایت پر عمل کیا لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے۔ ساتھ ہی اس کی چال میں بھی فرق آ گیا۔

میں نے پوچھا۔''کیا ہوا کریم صاحب۔ آپ کوئی تکلیف محسوس کر رہے ہیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔''جی ہاں' انٹی میں موجود لکڑی بری طرح میری ران پر چبھ رہی ہے اور تکلیف کے باعث چلنے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے' آپ ادھر میرے پاس آ جائیں۔'' میں نے کہا۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''آپ یہاں بیٹھ جائیں۔''

کرسی پر بیٹھنے کی کوشش میں اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی اور وہ بیٹھنے سے

پہلے ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا''اب کیا ہوا؟''

''جناب' یہاں یہ جو موجود ہے۔'' اس نے اپنی انٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔''میں کرسی پر کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔''

میں نے داد طلب نظروں سے جج کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا پھر اس کی مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔ وہ میرے عقب میں دیکھ رہا تھا میں نے مڑ کر جج کی نظروں کا تعاقب کیا۔ میں نے دیکھا اصغر جیلانی بینچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور دروازے کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔

''رک جاؤ مسٹر اصغر جیلانی۔'' جج کی بھاری آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔

وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔''جناب! میں ذرا باتھ روم......''

''تم باہر نہیں جا سکتے۔'' جج نے حتمی لہجے میں کہا۔''اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔''

اصغر جیلانی نے جج کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے دروازے کی جانب سفر جاری رکھا تو جج نے پٹے والے سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''دروازہ بند کردو۔''

ادھیڑ عمر پٹے والا اصغر کی جانب بڑھا تو اس نے پٹے والے کو زور دار دھکا دیا اور دروازے سے نکلنے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں انکوائری افسر وارث شاہ بھی حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے لپک کر اصغر علی کو کالر سے پکڑ لیا اور اسے کمرے کے اندر گھسیٹ لیا۔

''انسپکٹر! اسے گرفتار کرلو۔'' جج نے انکوائری افسر کو حکم دیا۔

انکوائری افسر نے فوری طور پر اصغر جیلانی کو گرفتار کرلیا۔

صورت حال معمول پر آئی تو عدالتی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی میں نے اس عملی مظاہرے کے ذیل میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میرا موکل بے گناہ اور معصوم انسان ہے۔ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کے مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے جبکہ قاتل کوئی اور شخص ہے۔''

''یور آنر' ایک صحت مند شخص جب لکڑی کے ٹکڑے کو اپنی انٹی میں رکھ کر چلنے میں اذیت ناک دشواری محسوس کرتا ہو اور کرسی پر بیٹھنا اس کے لیے ممکن نہ ہو تو میرا موکل ایک تیز دھار برہنہ چھری کو اپنی انٹی میں چھپا کر کس طرح اطمینان سے چل پھر سکتا ہے اور کرسی پر بیٹھ کر مقتول انور جیلانی سے گفتگو کر سکتا ہے؟''

''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ صنوبر خان نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ملزم اس کے ساتھ نہایت آرام سے چلتے ہوئے بنگلے کے اندر پہنچا تھا اور اس کے ہاتھ میں اور کوئی چیز بھی موجود نہیں تھی۔ پھر استغاثہ کے دوسرے گواہ اصغر جیلانی کے بیان کے مطابق ملزم نے انٹی سے برہنہ چھری

نکال کر مقتول پر حملہ کر دیا تھا۔ حملہ آور ہونے سے قبل وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور چودہ انچ لمبا آلۂ قتل اس کی انٹی میں موجود تھا۔ پھر انکوائری افسر وارث شاہ نے تصدیق کی ہے کہ ملزم کے طبی معائنے میں اس کی ران پر زخم کا کوئی نشان نہیں پایا گیا تھا جبکہ انٹی میں ایک خوف ناک برہنہ چھری کی موجودگی سے ران کو لہولہان ہو جانا چاہیے تھا۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے سانس لی پھر دلائل کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! ابھی معزز عدالت کے سامنے جو عملی مظاہرہ کیا گیا ہے اس کے بعد استغاثہ کے گواہ اصغر جیلانی نے فرار کی کوشش کی تھی جو انکوائری افسر نے ناکام بنا دی۔ گواہ کی اس حرکت سے اس کی ذات مشکوک ہو گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا موجود ہے۔

ازیں علاوہ، جب انور جیلانی کا قتل ہوا' اس وقت بیڈ روم میں گواہ اصغر جیلانی بھی موجود تھا۔ حالات' واقعات اور شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور وہ کسی گہری سازش کا شکار ہوا ہے۔ میرے موکل کے علاوہ بنگلے میں صنوبر خان اور اصغر جیلانی کی موجودگی کسی اور طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے اصغر جیلانی نے جس رویّے کا مظاہرہ کیا ہے' اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

واضح رہے کہ اپنے اضافی بیان میں میرا موکل دو لاکھ روپے کے غبن کا اقرار کر چکا ہے اور اس کی وجوہات بھی تفصیل سے بیان کر چکا ہے۔ استغاثہ کا زور اسی بات پر ہے کہ غبن کے انکشافات پر مقتول نے ملزم کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تھی چنانچہ...... اس نے مقتول کو قتل کر دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر بفرض محال میرے موکل نے ایسا سوچ ہی لیا تھا تو پھر اسے یہ کام مناسب موقع پر کرنا چاہیے تھا نہ کہ مقتول کے چھوٹے بھائی کی موجودگی میں اس نے خود کو پھنسانے والا کام کیا۔ استغاثہ کے موقف میں کوئی جان نظر نہیں آتی۔ ایک احمق سے احمق انسان بھی دیدہ دانستہ اپنے جرم کا سراغ نہیں چھوڑتا۔ ازیں علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غبن کے جرم میں میرے موکل کو چند سال کی سزا ہوتی پھر اس نے ایسا قدم' انتہائی مضبوط ثبوت کے ساتھ کیوں اٹھایا کہ سیدھا پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے؟

جناب عالی! سوالات تو ان گنت ہیں لیکن میں ایک اہم پوائنٹ کی جانب آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ''سوچنے کی بات یہ ہے کہ انور جیلانی کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ کس کو پہنچ سکتا تھا۔ میرے موکل صفدر علی کو یا مقتول کے چھوٹے بھائی اصغر جیلانی کو؟ واضح رہے کہ گواہ اصغر جیلانی مقتول کا واحد وارث ہے۔

ان حالات کی روشنی میں' میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے موکل کو باعزت بری کرنے کے احکامات جاری کرے تا کہ اس کی شہرت کو اب تک جو نقصان پہنچا ہے اس کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ ہاں' بطور گواہ اسے مقدمے میں ضرور شامل رکھا جائے۔'' ایک لمحے کے توقف

سے میں نے اضافہ کیا۔ ''نیز مشکوک گواہ اصغر جیلانی کو شامل تفتیش کیا جائے۔ اس نے عدالت کے کمرے سے فرار کی کوشش کر کے اپنی ذات کو شکوک و شبہات کی دبیز چادر میں لپیٹ لیا ہے۔''

اس کے بعد میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جج کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری بات سمجھ چکا تھا۔ میرے دلائل اور کریم بخش کے توسط سے عملی مظاہرے نے اسے متاثر کیا تھا۔ میں اپنی ان تھک محنت اور وزنی دلائل سے اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کر چکا تھا۔ اب جج کے فیصلے کا انتظار تھا۔

جج کافی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات اور مقدمے کی فائل کا جائزہ لیتا رہا پھر وکیل استغاثہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''وکیل صاحب' آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

میرے طرز استدلال نے وکیل استغاثہ کے تعزیے ٹھنڈے کر دیے تھے وہ خاصا مایوس اور بددل نظر آ رہا تھا۔ جج کے سوال پر اس نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

''جناب عالی! اس نئی صورت حال کے پیش نظر مقدمے کی سماعت جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پولیس کو کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرنا پڑے گی۔''

جج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''فی الحال میں ملزم صفدر علی کو ضمانت پر رہا کر رہا ہوں۔ اس کی بریت کے بارے میں آئندہ پیشی پر فیصلہ کیا جائے گا۔'' پھر اس نے انکوائری افسر وارث شاہ کو حکم دیا کہ وہ استغاثہ کے گواہان صنوبر خان اور اصغر جیلانی کو شامل تفتیش کر کے نیا چالان عدالت میں پیش کرے۔

میں ایک بات کا ذکر کرنا شاید بھول گیا ہوں۔ گزشتہ پیشی پر میں نے اپنے موکل کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں داخل کر دی تھی۔ جج کے حکم پر انکوائری افسر نے میرے موکل صفدر علی کی ہتھکڑی کھول دی۔

انکوائری افسر کے ہاتھ میں اب جو ہتھکڑی نظر آ رہی تھی اس کے دوسرے سرے پر اصغر جیلانی تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی ابھی وہ یتیم ہوا ہے۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❀❀❀

آئندہ پیشی پر پولیس نے نیا چالان پیش کر دیا۔ اصغر جیلانی نے عدالت کے کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کر کے خود کو مجرم ثابت کر دیا تھا۔ باقی کا کام انسپکٹر وارث شاہ کی ''عملی محنت'' نے کر دیا۔ وارث شاہ بھی حقیقت حال سے واقف ہو چکا تھا اس لیے اس نے صنوبر خان اور اصغر جیلانی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ صنوبر خان نے وعدہ معاف گواہ بننے کا فیصلہ کر لیا اور اصغر جیلانی کا سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ ازاں بعد پولیس کی ''خدمت'' سے گھبرا کر اصغر جیلانی نے اپنے بھائی کے قتل کا اقرار کر

نکال کر مقتول پر حملہ کر دیا تھا۔ حملہ آور ہونے سے قبل وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور چودہ انچ لمبا آلۂ قتل اس کی انٹی میں موجود تھا۔ پھر انکوائری افسر وارث شاہ نے تصدیق کی ہے کہ ملزم کے طبی معائنے میں اس کی ران پر زخم کا کوئی نشان نہیں پایا گیا تھا جبکہ انٹی میں ایک خوف ناک برہنہ چھری کی موجودگی سے ران کو لہولہان ہو جانا چاہیے تھا۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے سانس لی پھر دلائل کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! ابھی معزز عدالت کے سامنے جو عملی مظاہرہ کیا گیا ہے اس کے بعد استغاثہ کے گواہ اصغر جیلانی نے فرار کی کوشش کی تھی جو انکوائری افسر نے ناکام بنا دی۔ گواہ کی اس حرکت سے اس کی ذات مشکوک ہو گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دال میں کچھ کالا موجود ہے۔

ازیں علاوہ، جب انور جیلانی کا قتل ہوا، اس وقت بیڈ روم میں گواہ اصغر جیلانی بھی موجود تھا۔ حالات، واقعات اور شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور وہ کسی گہری سازش کا شکار ہوا ہے۔ میرے موکل کے علاوہ بنگلے میں صنوبر خان اور اصغر جیلانی کی موجودگی کسی اور طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے اصغر جیلانی نے جس رویّے کا مظاہرہ کیا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

واضح رہے کہ اپنے اضافی بیان میں میرا موکل دو لاکھ روپے کے غبن کا اقرار کر چکا ہے اور اس کی وجوہات بھی تفصیل سے بیان کر چکا ہے۔ استغاثہ کا زور اسی بات پر ہے کہ غبن کے انکشافات پر مقتول نے ملزم کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تھی چنانچہ...... اس نے مقتول کو قتل کر دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر بفرض محال میرے موکل نے ایسا سوچ ہی لیا تھا تو پھر اسے یہ کام مناسب موقع پر کرنا چاہیے تھا نہ کہ مقتول کے چھوٹے بھائی کی موجودگی میں اس نے خود کو پھنسانے والا کام کیا۔ استغاثہ کے موقف میں کوئی جان نظر نہیں آتی۔ ایک احمق سے احمق انسان بھی دیدہ دانستہ اپنے جرم کا سراغ نہیں چھوڑتا۔ ازیں علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غبن کے جرم میں میرے موکل کو چند سال کی سزا ہوتی پھر اس نے ایسا قدم، انتہائی مضبوط ثبوت کے ساتھ کیوں اٹھایا کہ سیدھا پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے؟

جناب عالی! سوالات تو ان گنت ہیں لیکن میں ایک اہم پوائنٹ کی جانب آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ ''سوچنے کی بات یہ ہے کہ انور جیلانی کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ کس کو پہنچ سکتا تھا۔ میرے موکل صفدر علی کو یا مقتول کے چھوٹے بھائی اصغر جیلانی کو؟ واضح رہے کہ گواہ اصغر جیلانی مقتول کا واحد وارث ہے۔

ان حالات کی روشنی میں، میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے موکل کو باعزت بری کرنے کے احکامات جاری کرے تاکہ اس کی شہرت کو اب تک جو نقصان پہنچا ہے اس کا کچھ ازالہ ہو سکے۔ ہاں، بطور گواہ اسے مقدمے میں ضرور شامل رکھا جائے۔'' ایک لمحے کے توقف

سے میں نے اضافہ کیا۔ ''نیز مشکوک گواہ اصغر جیلانی کو شامل تفتیش کیا جائے۔ اس نے عدالت کے کمرے سے فرار کی کوشش کر کے اپنی ذات کو شکوک و شبہات کی دبیز چادر میں لپیٹ لیا ہے۔''

اس کے بعد میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جج کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری بات سمجھ چکا تھا۔ میرے دلائل اور کریم بخش کے توسط سے عملی مظاہرے نے اسے متاثر کیا تھا۔ میں اپنی ان تھک محنت اور وزنی دلائل سے اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کر چکا تھا۔ اب جج کے فیصلے کا انتظار تھا۔

جج کافی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات اور مقدمے کی فائل کا جائزہ لیتا رہا پھر وکیل استغاثہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''وکیل صاحب، آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

میرے طرز استدلال نے وکیل استغاثہ کے تعزیے ٹھنڈے کر دیے تھے وہ خاصا مایوس اور بددل نظر آ رہا تھا۔ جج کے سوال پر اس نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

''جناب عالی! اس نئی صورت حال کے پیش نظر مقدمے کی سماعت جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پولیس کو کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرنا پڑے گی۔''

جج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''فی الحال میں ملزم صفدر علی کو ضمانت پر رہا کر رہا ہوں۔ اس کی بریت کے بارے میں آئندہ پیشی پر فیصلہ کیا جائے گا۔'' پھر اس نے انکوائری افسر وارث شاہ کو حکم دیا کہ وہ استغاثہ کے گواہان صنوبر خان اور اصغر جیلانی کو شامل تفتیش کر کے نیا چالان عدالت میں پیش کرے۔

میں ایک بات کا ذکر کرنا شاید بھول گیا ہوں۔ گزشتہ پیشی پر میں نے اپنے موکل کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں داخل کر دی تھی۔ جج کے حکم پر انکوائری افسر نے میرے موکل صفدر علی کی ہتھکڑی کھول دی۔

انکوائری افسر کے ہاتھ میں اب جو ہتھکڑی نظر آ رہی تھی اس کے دوسرے سرے پر اصغر جیلانی تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی ابھی وہ یتیم ہوا ہے۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

❁ ❁ ❁

آئندہ پیشی پر پولیس نے نیا چالان پیش کر دیا۔ اصغر جیلانی نے عدالت کے کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کر کے خود کو مجرم ثابت کر دیا تھا۔ باقی کا کام انسپکٹر وارث شاہ کی ''عملی محنت'' نے کر دیا۔ وارث شاہ بھی حقیقتِ حال سے واقف ہو چکا تھا اس لیے اس نے صنوبر خان اور اصغر جیلانی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ صنوبر خان نے وعدہ معاف گواہ بننے کا فیصلہ کر لیا اور اصغر جیلانی کا سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ ازاں بعد پولیس کی ''خدمت'' سے گھبرا کر اصغر جیلانی نے اپنے بھائی کے قتل کا اقرار کر

لیا تھا۔

اصغر جیلانی نے دولت کے لالچ میں آ کر یہ انتہائی سنگین قدم اٹھایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سیدھے سادے صفدر علی کو قربانی کا بکرا بنا کر خود بچ نکلے گا لیکن عین وقت پر وہ پھنس گیا۔ اس میں کچھ ہاتھ صفدر علی کی خوش بختی کا بھی تھا۔ اگر وہ ابھی تک رفیق باجوہ کے ہی رحم و کرم پر ہوتا تو ممکن ہے اس وقت تک وہ عدالت سے موت کی سزا پا چکا ہوتا۔

اس پیشی پر عدالت نے صفدر علی کو باعزت بری کر دیا اور اصغر جیلانی پر فردِ جرم عائد کر کے صفدر علی کو بطور گواہ مقدمے میں شامل کر لیا۔

جس دولت کے حصول کی خاطر اصغر نے اپنے بھائی کے خون میں ہاتھ رنگے تھے اور ایک معصوم انسان کو پھنسانے کی کوشش کی تھی وہ دولت اسے نہ مل سکی۔ اگرچہ وہ انور جیلانی کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا واحد وارث تھا لیکن وہ ایک ثابت شدہ قاتل بھی تھا۔

ازروئے قانون کوئی قاتل کسی بھی قسم کی جائیداد کا وارث نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

نزہت بیگم اپنے شوہر کی بریت پر بہت خوش تھی۔ فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ صفدر علی نے اس کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے میری جانب اشارہ کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''نزہت! یہ سب کچھ بیگ صاحب کی ذہانت کا کرشمہ ہے۔ میں اس معجزے کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''میری ذہانت کے ساتھ ساتھ تمہاری رہائی میں تمہاری بیوی کی کوششوں کا بھی عمل دخل ہے۔ تمہیں سب سے زیادہ اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''میں نے سن رکھا ہے کہ عورت اپنے زیور کو سب سے زیادہ عزیز رکھتی ہے تمہاری بیوی نے تم پر اپنی عزیز ترین چیز قربان کر دی۔''

''میں اسے سونے میں پیلا کر دوں گا۔'' صفدر علی جذباتی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن خدارا! زیادہ سونا خریدنے کے لیے کسی انویسٹ منٹ کے چکر میں نہ پڑ جانا۔''

وہ جھینپ گیا اور نزہت سے نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

✿✿✿

صید و صیاد

''میرے نزدیک بہترین وکیل وہ نہیں جو قاتل کو پھانسی کے پھندے سے بچا لیتا ہے بلکہ میں ایک اچھا اور معتبر وکیل اسے سمجھتا ہوں جو اپنے موکل کو انصاف مہیا کرتا ہے۔'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دوٹوک الفاظ میں بتایا۔ ''ایک بات کان کھول کر سن لیں فرقان صاحب میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنی فیس کھری کرنے کے لیے حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔ آپ جب تک کھل کر اپنے حالات مجھے نہیں بتائیں گے، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے موکل کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے سے بھی انصاف کرنے کا قائل ہوں۔''

فرقان صدیقی نامی وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی عدالتی کاموں سے نمٹ کر اپنے دفتر پہنچا تھا۔ آج عدالت میں میری کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی اس لیے عام دنوں کی بہ نسبت میں بہت جلدی دفتر آ گیا تھا۔ میرے دفتر پہنچتے ہی فرقان صدیقی مجھ سے ملنے آن پہنچا تھا۔ فرقان کو میرے چیمبر میں بھیجنے سے قبل میری سیکریٹری نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گذشتہ ایک گھنٹے میں تین مرتبہ دفتر کے چکر لگا چکا تھا۔

جب فرقان صدیقی میرے چیمبر میں داخل ہوا تو اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے حد درجہ پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اور وہ زیر لب کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی اور اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ مجھے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد جب میں نے اس کی آمد کی غرض و غایت دریافت کی تو اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اضطراری لہجے میں بتایا تھا۔

''وکیل صاحب! میں ایک عجیب و غریب سچویشن میں پھنس گیا ہوں۔''

''اس سچویشن کی کچھ وضاحت کریں؟''

وہ بولا۔ ''گذشتہ رات میں اس شہر میں موجود نہیں تھا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے تشویش

ناک نظر سے چیمبر کے داخلی دروازے کو دیکھا پھر مطمئن ہونے کے بعد کہنے لگا۔ ''میری غیر موجودگی میں کسی نے میری گاڑی چوری کی۔ اس گاڑی میں ایک شخص کو قتل کیا پھر لاش اور گاڑی کو ایک سنسان سڑک پر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے سوال کیا۔ ''آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟''

''یہ دیکھیں۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تہ شدہ اخبار میرے سامنے میز پر پھیلا دیا اور بولا۔ ''میں نے یہ ساری باتیں اسی اخبار میں پڑھی ہیں۔''

اخبار کا وہ حصہ جہاں یہ خبر چھپی ہوئی تھی وہاں مذکورہ گاڑی کی تصویر بھی نظر آ رہی تھی۔ فرقان صدیقی کے مطابق یہ اس کی گرے کلر ٹویوٹا گاڑی تھی۔ خبر کے مطابق مقتول کا نام ساجد حسن تھا۔ اس کی عمر کم و بیش تیس سال بتائی گئی تھی۔ مقتول کی پیشانی میں گولی اتار کر اسے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔ پولیس پوری سرگرمی سے گرے ٹویوٹا کے مالک فرقان صدیقی کو تلاش کر رہی تھی۔ گاڑی میں موجود کاغذات سے فرقان صدیقی کا سراغ لگانا مشکل نہیں تھا لیکن وہ اپنی رہائش گاہ پر نہیں پایا گیا تھا۔

اس خبر کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے فرقان صدیقی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''فرقان صاحب! ابھی آپ نے بتایا ہے کہ گذشتہ رات آپ کراچی میں موجود نہیں تھے اور آپ کی عدم موجودگی میں کسی نے آپ کی گاڑی چرا کر یہ واردات کی ہے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''جی ہاں' بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''گذشتہ رات آپ کراچی سے باہر کہاں گئے ہوئے تھے۔''

''نواب شاہ۔''

''آپ کی رہائش کہاں پر ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے' کراچی میں آپ کہاں رہتے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بہادر آباد میں۔''

''مذکورہ گاڑی آپ کی رہائش گاہ سے چوری ہوئی ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''جج...... جی ہاں۔''

مجھے اس کا لہجہ کھوکھلا اور بات بے وزن سی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے پاس اس بات کا ثبوت تو ہوگا کہ آپ گذشتہ رات واقعی نواب شاہ میں تھے؟''

اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک پرچھائیں سی لہرائی' بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ یقین کریں وکیل صاحب! میں آج صبح ہی نواب شاہ سے واپس آیا ہوں۔ آپ پہلے میرے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کا کچھ بندوبست کریں پھر میں آپ کو تفصیلاً سب کچھ بتا دوں گا۔''

اس کے انداز نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا۔ میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''فرقان

صاحب! آپ کے حالات خاص الجھے ہوئے اور پیچیدہ معلوم ہو رہے ہیں جب تک آپ میرے سوالات کے واضح جوابات نہیں دیں گے' میں نہ تو آپ کے معاملات کو سمجھ سکوں گا اور نہ ہی اس سلسلے میں آپ کی کوئی قانونی مدد کر سکوں گا۔''

''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''میں نے گذشتہ رات نواب شاہ میں آپ کی موجودگی کا ثبوت مانگا تھا۔ آپ مجھے بتائیں' کیا آپ وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے یا کسی عزیز رشتے دار' دوست وغیرہ کے پاس رات گزاری تھی؟''

''کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟''

''بے حد ضروری۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''جب تک نواب شاہ میں آپ کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا' کراچی میں آپ کی غیر موجودگی ثابت نہیں کی جا سکے گی۔''

وہ قدرے تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھہرا تو میں ہوٹل میں ہی تھا۔''

''کس ہوٹل میں؟''

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ مجھے شک ہوا کہ یا تو وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہی نہیں تھا یا پھر کسی خاص وجہ سے ہوٹل کا نام بتانے میں متردد تھا۔ میں نے کہا۔ ''آپ کی فراہم کردہ تمام معلومات میرے پاس محفوظ رہیں گی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں واقعی آپ کی کوئی مدد کروں تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے جرم چھپانے میں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔''

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ یقین کریں' ساجد حسن کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ کسی نے سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے پھانسنے کی کوشش کی ہے۔''

''اور آپ میرے پاس اس لیے آئے ہیں کہ میں آپ کو اس سوچی سمجھی سازش سے نکالنے کی کوشش کروں۔''

''بالکل ایسی ہی بات ہے۔''

''اس کے باوجود آپ مجھ سے حقائق چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ٹھہرا تو میں ہوٹل میں ہی تھا لیکن اس وقت پریشانی کے باعث مجھے ہوٹل کا نام یاد نہیں آ رہا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نواب شاہ کس ذریعے سے گئے تھے؟''

''میں وہاں بائی ٹرین گیا تھا۔''

''اور واپسی کیسے ہوئی؟''

''واپسی بھی ٹرین ہی سے ہوئی ہے۔''

''آپ کے پاس آنے اور جانے کا ریلوے ٹکٹ تو ہوگا؟''

وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''افسوس' میں وہ ٹکٹ سنبھال کر نہیں رکھ سکا۔'' قدرے توقف سے وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں' یاد آیا۔ وکیل صاحب۔ آنے اور جانے کے ریلوے ٹکٹ تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے ٹکٹ چیکر نے مجھ سے لے لیے تھے۔''

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''جس ہوٹل کا آپ کو نام یاد نہیں آرہا' وہاں رات گزاری کی کوئی رسید وغیرہ تو ہوگی انہوں نے آپ کو۔ میرا مطلب ہے کرائے وغیرہ کی رسید؟''

''رسید دی تو تھی۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں نے غیر ضروری سمجھ کر ضائع کردی۔''

''فرقان صاحب!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات غیر ضروری چیزیں بہت ضروری ہو جاتی ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عدالت بغیر ثبوت کے کوئی بات سچ تسلیم نہیں کرتی۔ جو کچھ آپ بتا رہے ہیں وہ مبہم اور معاف کیجئے گا' خاصا مشکوک ہے۔ اگر گذشتہ رات آپ کی کراچی میں غیر موجودگی ثابت نہ ہوئی تو آپ بہت بڑی مصیبت میں بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔''

''میں اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی آپ میری حفاظت کا کوئی انتظام کردیں۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یہ خبر پڑھنے کے بعد تو میں اپنے گھر بھی نہیں گیا۔ پولیس والوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ پھر میرے ایک مخلص دوست نے مشورہ دیا کہ پولیس سے چھپنے کے بجائے مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کرنا چاہیے چنانچہ میں آپ کے پاس چلا آیا ہوں لیکن آپ تو مجھے بہت مایوس کر رہے ہیں۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''کراچی میں آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں ایک ٹیکسٹائل مل میں منیجر ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''مذکورہ مل کا نام فائن ٹیکسٹائل مل ہے۔ شاید آپ نے اس کا نام نہ سنا ہو۔ بہت چھوٹی سی مل ہے۔''

''واقعی میں نے اس مل کا نام نہیں سنا۔'' میں نے کہا پھر سوال کیا۔ ''فرقان صاحب! گذشتہ روز آپ مل کے کسی کام سے نواب شاہ گئے تھے یا ذاتی کام سے؟'' میں نے ایک خاص مقصد کے تحت یہ سوال کیا تھا۔

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب!...... اگر نواب شاہ کا ذکر مناسب نہ ہو تو کوئی اور بات سوچ لیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے' آپ تو قانون داں ہیں۔ آپ کے پاس ایک سو ایک حل ہوں گے میرے مسئلے کے۔''

''میں معافی چاہوں گا فرقان صاحب۔'' میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی تک آپ کا مسئلہ ہی نہیں سمجھ سکا ہوں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ مجھے آدھی ادھوری معلومات بہم پہنچا رہے ہیں آپ کی باتیں آپ کی ذات کو مشکوک بنا رہی ہیں۔ موجودہ صورت حال میں' میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

اس کا منہ لٹک گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب میرا خیال ہے' عدالت کا وقت ختم ہونے ہی والا ہے۔ آپ پہلے میری ضمانت قبل از گرفتاری منظور کروالیں پھر میں آپ کو پوری تفصیل سے سب کچھ بتا دوں گا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ میں گذشتہ رات کراچی میں ہی تھا۔ میں نے یہ رات اپنے ایک دوست کے گھر گزاری ہے۔ وہیں سے میری گاڑی چوری ہوئی ہے۔ پہلے میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ گاڑی میری رہائش گاہ واقع بہادر آباد سے چرائی گئی ہے۔ دراصل' میں اپنے دوست کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے دروغ گوئی کا سہارا لینا پڑا۔''

''آپ کا مذکورہ دوست کہاں رہتا ہے؟''

''طارق روڈ پر۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا ضرورت پڑنے پر آپ کا دوست عدالت میں گواہی دے سکتا ہے کہ گذشتہ رات آپ اس کے گھر میں تھے؟''

''وہ میری خاطر یہ سچ بولنے عدالت تک جاسکتا ہے۔''

''آپ کے دوست کا نام اور پتا کیا ہے؟''

''سب کچھ بتا دوں گا' آپ سمجھ جائیں نا۔'' فرقان صدیقی نے انگشت شہادت سے اپنے دائیں نتھنے کو دباتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ''عدالت کا وقت نکلا جا رہا ہے وکیل صاحب! تفصیلی باتیں واپسی پر آپ کے دفتر میں ہوں گی۔''

میں اس کا اشارہ واضح طور پر سمجھ گیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ ذہین قارئین فرقان صدیقی کے مذکورہ دوست کا جغرافیہ باآسانی جان گئے ہوں گے۔

میں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ فرقان صدیقی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس کا ''دوست'' گذشتہ رات اپنے گھر میں اس کی موجودگی کو ثابت کرسکتا ہے لہٰذا میں نے مطمئن ہو کر اس کی درخواست ضمانت ٹائپ کروائی اور اسے ساتھ لے کر عدالت میں پہنچ گیا۔

میں سیدھا پیش کار کے پاس پہنچا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پیش کار نے وہ درخواست میرے ہاتھ سے لے کر مجسٹریٹ کی میز پر رکھ دی پھر باآواز بلند پوچھا۔ ''بیگ صاحب! درخواست دہندہ کدھر ہے؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ایک سادہ لباس شخص کمرے میں داخل ہوا اور پیش کار سے پوچھا۔ ''یہ کس قسم کی درخواست ہے؟''

پیش کار نے جواب دیا۔ ''درخواست ضمانت قبل از گرفتاری۔''

''درخواست دہندہ کہاں ہے؟'' سادہ لباس والے نے پوچھا۔

میں سمجھ گیا کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ سادہ لباس والا یقیناً پولیس کا آدمی تھا۔ سادہ لباس پولیس اہلکار

کے سوال پر پیش کار نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔

''میرا موکل شاید کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے فرقان صدیقی کو اشارہ بھی کیا۔

وہ میرا اشارہ سمجھ نہیں سکا۔ مزید حماقت کا ثبوت یہ دیا کہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! میں اِدھر کھڑا ہوں۔''

سادہ لباس پولیس اہل کار نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ اس دوران میں پیش کار اس پولیس والے کو بتا چکا تھا۔ ''جناب یہ فرقان صدیقی ولد عرفان صدیقی کی درخواست ضمانت قبل از گرفتاری ہے اور درخواست دہندہ کو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔''

میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔ اگر فرقان میرا اشارہ سمجھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل جاتا تو اس کی بچت ہو سکتی تھی۔ مگر اب تو اس کے حق میں کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ سادہ لباس پولیس اہلکار کے مخصوص اشارے پر پلک جھپکتے میں دو وردی پوش پولیس اہل کار وہاں نمودار ہو گئے تھے اور انہوں نے دائیں بائیں دونوں بازوؤں سے فرقان صدیقی کو پکڑ لیا تھا۔

سادہ لباس پولیس والے نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہم صبح سے یہاں بیٹھے آپ کے موکل کا انتظار کر رہے تھے۔ اب آپ اس کے لیے ایک درخواست ضمانت بعد از گرفتاری تیار کریں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے فرقان صدیقی کو ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ اس نے اپنے طور پر پولیس والوں کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈھکے چھپے انداز میں مک مکا کا اشارہ بھی دیا مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں فرقان صاحب! یہ لوگ ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے آپ کو کل عدالت میں پیش کریں گے۔ میں یہاں موجود ہوں گا اور انشاءاللہ آپ کی ضمانت ہو جائے گی۔''

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں۔ اپنے دفتر سے نکلنے سے پہلے میں نے فرقان صدیقی سے وکالت نامہ سائن کروا لیا تھا اور فیس کے معاملات بھی طے کر لیے تھے۔ اب وہ باقاعدہ میرا موکل تھا۔

فرقان صدیقی نے پولیس والوں کے ساتھ جانے سے پہلے مجھے اپنے ''دوست'' کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا اور درخواست کی کہ میں اسے اس گرفتاری کی اطلاع دے دوں۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

دفتر پہنچنے کے بعد میں نے حسبِ وعدہ اپنے موکل کے ''دوست'' سے ٹیلی فونک رابطہ کیا۔ اس دوست کا نام ستارہ تھا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری جانب سے فون ریسیو کر لیا گیا۔

میں نے یہ تصدیق کرنے کے بعد کہ دوسری طرف میرا مطلوبہ فرد ہی ہے' اپنا تعارف کرواتے

ہوئے کہا۔ ''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں فرقان صاحب کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''فرقان صاحب خیریت سے تو ہیں نا۔ کیا آپ نے ان کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کروالی ہے؟''

''مجھے افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا۔'' میں نے کہا۔ ''فرقان صاحب کی ایک بے موقع غلطی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ پولیس نے انہیں عدالت میں گرفتار کر لیا ہے لیکن آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں انشاءاللہ کل صبح ان کی ضمانت کروالوں گا۔''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ فرقان صاحب بہت نائس انسان ہیں۔''

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''فرقان صاحب کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ وقوعہ کی رات یعنی آٹھ اگست کی رات فرقان صاحب آپ کے پاس آپ کے گھر پر تھے۔''

ستارہ نے تصدیق کی۔ ''ہاں' فرقان صاحب پوری رات میرے پاس رہے تھے۔ دوسرے دن اخبار میں اپنی گاڑی سے متعلق خبر پڑھ کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ یہ مشورہ میں نے ہی انہیں دیا تھا کہ وہ فکرمند ہونے کے بجائے کسی تجربےکار وکیل سے مل کر اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کا انتظام کریں مگر افسوس کہ اس میں انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''ستارہ صاحبہ! آپ کی گواہی نہایت ہی اہم ہے۔ کیا آپ عدالت کے روبرو یہ بات کہہ سکتی ہیں کہ وقوعہ کی رات ملزم فرقان صدیقی آپ کے گھر میں رہا تھا۔''

وہ اداس سے لہجے میں بولی۔ ''وکیل صاحب! میں عدالت میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ اب آپ اس سچ کی روشنی میں اپنی قابلیت کو آزمائیں اور فرقان صاحب کو جلد از جلد ضمانت پر رہا کروانے کی کوشش کریں۔ میں نہیں چاہتی کہ فرقان صاحب کی خاندانی شرافت پر کوئی حرف آئے اس لیے آپ مجھے عدالت میں نہ ہی گھسیٹیں تو اچھا ہے۔''

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''محض میرے یہ کہہ دینے سے کہ وقوعہ کی رات ملزم آپ کے گھر میں تھا' عدالت میری بات کو تسلیم نہیں کرے گی۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو باقاعدہ عدالت میں آ کر گواہی دینا ہوگی۔ اور اگر عدالت نے اس ضمن میں کوئی ثبوت مانگا تو وہ بھی مہیا کرنا ہوگا۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''وکیل صاحب! ہمیں اپنے دوستوں کی عزت کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے کیونکہ وہ ساری دنیا سے چھپ کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ میں عدالت میں حاضر ہو کر اس راز کو عیاں نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کوشش کریں کہ مجھ سے تعلق ظاہر کیے بغیر آپ کسی طرح فرقان صاحب کی ضمانت کروالیں۔''

وہ خاصی صاف گو لڑکی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے' وہ کوئی عورت ہو' تاہم اس کی آواز اور گفتگو سے میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے قریب ہوگی۔ قارئین بخوبی سمجھ گئے ہوں گے' ستارہ کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے تھا جو اپنے دوستوں کو آسودگی بخش تفریح مہیا کرتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''ستارہ صاحبہ! آٹھ اگست کی شام فرقان صاحب کتنے بجے آپ کے گھر پہنچے تھے؟''

''تقریباً سات بجے۔''

''اور دوسری صبح کتنے بجے رخصت ہوئے تھے؟''

''کم و بیش دس بجے۔''

''آپ غالباً کسی فلیٹ میں رہتی ہیں؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ستارہ صاحبہ! کیا فرقان صاحب نے اپنی گاڑی گلی میں کھڑی کر رکھی تھی؟''

ایک لمحے کے تامل کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''فرقان صاحب بہت محتاط آدمی ہیں۔ وہ جب بھی میرے پاس آتے ہیں تو اپنی گاڑی کو ہماری گلی میں نہیں لاتے بلکہ ایک گلی پیچھے ہی پارک کر دیتے ہیں۔''

فرقان صدیقی مجھے بتا چکا تھا کہ اسے اخبار کے ذریعے اپنی گاڑی کی چوری کے بارے میں معلوم ہوا تھا تاہم میں نے یہی سوال ستارہ سے پوچھا۔ ''ستارہ صاحبہ! آج صبح فرقان صاحب کو کیسے پتا چلا تھا کہ ان کی گاڑی کسی قتل کی واردات میں استعمال کی گئی ہے؟''

''یہ بات انہیں اخبار پڑھنے کے بعد معلوم ہوئی تھی۔'' ستارہ نے جواب دیا۔ ''پوری خبر پڑھنے کے بعد بھی جب انہیں یقین نہیں آیا تو وہ دوڑتے ہوئے اس گلی میں پہنچے جہاں رات کو اپنی گاڑی پارک کی تھی لیکن اس وقت وہاں گاڑی کو غیر موجود پا کر وہ بوکھلا گئے اور میرے پاس واپس آ کر مجھے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلی فرصت میں انہیں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کا انتظام کرنا چاہیے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ ٹیکسی پکڑ کر آپ کے پاس پہنچے تھے۔''

میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''ستارہ صاحبہ! مجھے آپ کی صاف گوئی بہت پسند آئی تھی۔ آپ کے بیان میں مجھے کوئی جھوٹ نظر نہیں آ رہا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے دوست کے حق میں ضرور گواہی دیں گی۔ میں کل عدالت کے کمرے میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' پھر میں نے اسے متعلقہ عدالت کا نام بتا دیا۔

وہ بولی۔ ''آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ میرا سامنے آنا فرقان صاحب کی شرافت کو داغ دار کر دے

گا۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

میں اس کی بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''فرقان صاحب کی شرافت ان کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں' ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ کبھی ان کی زندگی پر بن آئی تو میں بے دھڑک گواہی دینے عدالت میں پہنچ جاؤں گی۔ فی الحال تو صرف ان کی ضمانت کا معاملہ ہے جو میرا خیال ہے آپ اپنی قابلیت اور تجربے ہی سے نمٹا لیں گے۔ میں نے آپ کا نام پہلے بھی سن رکھا ہے۔ آپ بہت چوٹی کے وکیل ہیں' ضمانت وغیرہ تو آپ کے لیے چٹکیوں کا کھیل ہے۔''

''میں کل فرقان صاحب کی ضمانت کروانے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔'' میں نے اس کے عدم تعاون کا گلہ کیے بغیر کہا۔ ''اور آئندہ کسی نازک مرحلے پر اگر آپ کی ضرورت پیش آئی تو مجھے امید ہے' آپ حق دوستی ضرور نبھائیں گی۔''

''اگر کوئی ایسا سنگین موقع آیا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔''

میں اس کی مجبوری کو سمجھ رہا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔ ''اگر گاڑی چوری ہو گئی تھی تو اس کی چابیاں کہاں گئیں؟''

ستارہ نے ایک لمحے کے توقف کے بعد بتایا۔ گاڑی کی چابیاں اس وقت میرے پاس ہیں۔ فرقان صاحب گھبراہٹ میں صبح چابیاں میری ڈریسنگ پر ہی چھوڑ گئے تھے۔''

''کیا آپ وہ چابیاں آج میرے دفتر میں پہنچا سکتی ہیں؟''

اس نے پوچھا۔ ''آپ کب تک دفتر میں ہوتے ہیں؟''

''عموماً میں آٹھ بجے تک اپنے دفتر میں ہوتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اگر آپ آ رہی ہیں تو میں تھوڑا انتظار بھی کر لوں گا۔''

وہ بولی۔ ''آپ کو انتظار کی زحمت نہیں دوں گی۔ میں پانچ بجے سے پہلے آپ کے دفتر میں چابیاں پہنچوا دوں گی۔''

''ایک بات کا خیال رہے' یہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ آپ نے گاڑی کی چابیاں مجھے دی ہیں۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں۔'' وہ تشفی آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہم راز کو راز رکھنا بخوبی جانتے ہیں۔''

دو چار باتوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

ٹھیک پانچ بجے ایک اونچا لمبا شخص میرے دفتر میں داخل ہوا اور ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ باجی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔''

میں نے کوئی سوال کیے بغیر وہ لفافہ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس شخص کو میرے چیمبر میں بھیجنے

سے پہلے میری سیکریٹری مجھے اس کے بارے میں بتا چکی تھی کہ ستارہ صاحبہ کا بھیجا ہوا ایک شخص مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ شخص سلام کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

اس شخص کے جانے کے بعد میں نے وہ لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے کے اندر ٹویوٹا گاڑی کی چابیوں کا گچھا موجود تھا۔ میں نے مذکورہ چابیوں کا گچھا اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا۔ اس گچھے سے مجھے آگے چل کر کس طرح کام لینا تھا اس کے بارے میں میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا۔

اگلے روز تقریباً دس بجے پولیس فرقان صدیقی کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے اسے عدالت میں لے کر آئی۔ میں نے فوراً اس کی ضمانت کی درخواست دائر کر دی لیکن جب میں نے ایف آئی آر کا مطالعہ کیا تو ایک لمحے کے لیے پریشانی نے مجھے آن گھیرا۔ پولیس نے میرے موکل پر قتلِ عمد کا الزام عائد کیا تھا۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ قتل کا محرک محبت اور رقابت تھی۔ مقتول ساجد حسن کی پیشانی میں اعشاریہ تین دو کے ریوالور سے گولی ماری گئی تھی جو اس کی موت کا سبب بنی تھی۔ آلۂ قتل ملزم فرقان علی کی ملکیت ثابت ہونا ہی اس کے لیے کسی مصیبت کے پیش خیمے سے کم نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم کی تفصیلی رپورٹ ابھی نہیں ملی تھی تاہم ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت آٹھ اگست کی رات ساڑھے دس اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔

یہ صورت حال خاصی سنگین تھی۔ عدالت نے دونوں طرف کے دلائل سننے کے بعد میرے موکل کی درخواست ضمانت مسترد کر دی۔ میں اپنی پوری کوشش کے باوصف بھی فرقان صدیقی کی ضمانت نہ کروا سکا۔ ویسے بھی قتل کے مقدمے کی ضمانت اتنی آسانی سے نہیں ہوتی۔ تاہم اگر ستارہ اس موقع پر گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہو جاتی تو صورت حال مختلف ہو سکتی تھی پھر فرقان صدیقی نے گاڑی چوری ہونے کا جو موقف اختیار کیا تھا وہ خاصا کمزور تھا۔ وہ اس لیے کہ اس نے نہ تو اس چوری کی کہیں رپورٹ درج کروائی تھی اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکا تھا۔

قصہ مختصر، عدالت نے ملزم کا سات روز کا پولیس ریمانڈ دے دیا۔

پولیس اور عدالت کی ابتدائی کارروائی نہایت ہی خشک اور ناقابل برداشت حد تک بور اور طویل ہوتی ہے۔ ضابطے کی پیچیدہ کارروائیوں سے فائلیں بھر جاتی ہیں۔ ان طولانی اور الجھن آمیز کارروائیوں کو پڑھنا، سننا اور ہضم کرنا انتہائی دل گردے کا کام ہے۔ اس لیے میں آپ کی دردسری کا خیال کرتے ہوئے اس ذکر کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ تاہم باقاعدہ عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس کیس کے پس منظر سے مختصراً آگاہ کر دوں تا کہ عدالتی سرگرمیوں کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے کڑی در کڑی بیان کر رہا ہوں۔ یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے لئے میں کئی بار اپنے موکل فرقان صدیقی سے جا کر ملا تھا۔ ازیں علاوہ میں نے مقتول ساجد کی بیوہ ماں سے بھی ملاقات کی تھی اور اس کیس کے سب سے اہم کردار

شاہدہ کریمی کے دیدار کے لیے اس کے دولت کدے کا بھی ایک چکر لگایا تھا۔

❀ ❀ ❀

مقتول ساجد حسن نے امریکا سے ایم بی اے کیا تھا۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کے پیش نظر امریکا میں اس کی ترقی کے بہتر اور زیادہ مواقع موجود تھے اور وہاں سے تنخواہ بھی زیادہ مل سکتی تھی لیکن وہ اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتا تھا اس لیے پاکستان واپس لوٹ آیا اور گذشتہ کئی سال سے اسٹاک ایکسچینج میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کی رہائش گلشن اقبال میں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور اپنی بیوہ ماں کے ساتھ گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔

حالات نے اس وقت پلٹا کھایا جب ایک تقریب میں ساجد نے شاہدہ کریمی نامی ایک لڑکی کو دیکھ لیا۔ شاہدہ نہ صرف حسین اور پرکشش تھی بلکہ وہ خوش گفتار بھی تھی۔ اپنی گفتگو سے وہ ذہین بھی لگتی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں ساجد کے دل میں اتر گئی۔ شاہدہ کی جس بات نے ساجد کو متاثر کیا وہ یہ تھی کہ شاہدہ میں تکبر نام کو نہیں تھا۔ اس معاملے میں ساجد کی ماں قمر النساء بیگم کی رائے مختلف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاہدہ چونکہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے وہ ساجد کو پھانسنے میں مصلحت کوشی سے کام لے رہی تھی۔ ساجد حسن کی تنخواہ دس ہزار کے قریب تھی اور شاہدہ اتنے روشن مستقبل والے شخص کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ شاہدہ کا باپ یوسف کریمی کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھا اور بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ شاہدہ کا چھوٹا بھائی عارف صدر میں جوتوں کی ایک دکان پر سیلز مین تھا جہاں سے اسے ایک ہزار روپے ملتے تھے۔ شاہدہ خود فائن ٹیکسٹائل مل میں کام کرتی تھی اس کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار تھی۔ شاہدہ اپنے خاندان کے ساتھ یوپی موڑ پر رہتی تھی۔

قمر النساء بیگم کو بیٹے کی پسند، پسند نہیں تھی لیکن ساجد حسن کی ضد اور جوش و خروش کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ساجد حسن نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی شاہدہ کریمی سے نہ ہوئی تو وہ اپنی جان دے دے گا۔ قمر النساء اپنے اکلوتے بیٹے کی اس دھمکی کے سامنے سرنگوں ہو گئی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد شاہدہ اور ساجد حسن کی منگنی ہو گئی۔

اصل مصیبت اس منگنی کے بعد شروع ہوئی تھی۔ قمر النساء کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ منگنی کے ایک ہفتے بعد شاہدہ کے ایک کزن نے انہیں دھمکانا شروع کر دیا تھا کہ وہ یہ منگنی توڑ دیں۔ شاہدہ کے اس کزن کا نام کاشف محمود تھا۔

کاشف فائن ٹیکسٹائل مل میں سپروائزر تھا اور مذکورہ مل میں شاہدہ کو کاشف ہی کی سفارش پر نوکری ملی تھی۔ ابھی تک کاشف انہیں ٹیلی فون پر ہی دھمکیاں دیتا آیا تھا۔ وہ اس کی شکل و صورت سے واقف نہیں تھے پھر ایک روز کاشف ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے اپنا تعارف شاہدہ کے ایک رشتے دار کے طور پر کرایا چنانچہ انہوں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

رسمی کلمات کے بعد جب کاشف محمود نے اپنا تعارف کروایا تو دونوں ماں بیٹا چونک اٹھے۔

ساجد حسن حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد غصے سے بولا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔''

''کیا سمجھانا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ تم شاہدہ سے منگنی توڑ دو۔''

ساجد حسن نے بھڑکیلے لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں اس منگنی پر کوئی اعتراض ہے تو جا کر اس کے والدین سے بات کرو۔ ہم سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟''

''واسطہ ہے' اسی لیے تو یہاں آیا ہوں۔'' کاشت نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں یہ باور کروانے آیا ہوں کہ شاہدہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔ تم اس سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔''

''اس مشورے کا شکریہ۔'' ساجد حسن نے نفرت آمیز نظر سے اسے گھورا۔ ''بس یہی بات ہے یا کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ایک بات کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو کہ شاہدہ سے شادی کر کے تم بری طرح پچھتاؤ گے۔ وہ پہلے بھی بہت سے لوگوں کو فریب دے چکی ہے۔ تم کوئی پہلے نہیں ہو...... اور نہ ہی آخری ہو۔''

ساجد کو کاشف کی باتوں سے غصہ آ رہا ہے' وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''میں اپنا اچھا برا بخوبی سمجھتا ہوں۔ تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میرا کام سمجھانا تھا سو میں نے تمہیں سمجھا دیا۔'' کاشف نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اپنے سود وزیاں کے اب تم خود ذمے دار ہو گے۔''

''شاہدہ سے شادی قطعاً میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' ساجد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''اگر بعد میں مجھے اس فیصلے پر پچھتانا پڑا تو تم بے فکر رہو' میں تمہارے پاس فریاد لے کر نہیں آؤں گا۔ تم خواہ مخواہ اس شادی میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرو۔ شاہدہ اچھی ہے یا بری' میں سوچ سمجھ کر اسے اپنا رہا ہوں' ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہیں۔''

کاشف محمود اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے' میں جا رہا ہوں۔ اس وقت تم پر شاہدہ کے عشق کا بھوت سوار ہے اس لیے تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئے گی لیکن وقت میرے الفاظ کی سچائی کو ثابت کر دے گا۔''

ساجدہ کی والدہ قمر النساء نے پوچھا۔ ''بیٹا! کیا تم شاہدہ سے شادی کے خواہش مند ہو؟''

اونہہ۔'' کاشف نے برا سا منہ بنایا۔ ''شاہدہ کسی بھی شریف آدمی کے لائق نہیں ہے۔ اگرچہ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن میں کسی بھی صورت اس سے شادی نہیں کروں گا۔''

''عجیب آدمی ہو تم بھی۔'' ساجد حسن نے کہا۔ ''تم شاہدہ سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتے اور اس کی شادی میں رکاوٹ بھی بن رہے ہو۔ تمہارا رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''اصل بات یہ ہے کہ میں بھی شاہدہ کو پسند کرتا ہوں۔''

''تمہارا فلسفہ بالکل ٹیڑھا ہے۔'' ساجد حسن نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ''تم شاہدہ کو پسند بھی کرتے ہو اور اسے برا بھی کہہ رہے ہو۔ اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتے اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ اس کی شادی کہیں ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو بھئی؟''

''میں صرف شاہدہ کو چاہتا ہوں۔'' کاشف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ چاہتا ہوں کہ کوئی اور اسے نہ چاہے۔''

پھر وہ ان کے گھر سے رخصت ہو گیا۔

وقوعہ والے روز مقتول ساجد حسن' شام کے وقت اپنی موٹر سائیکل ہنڈا ون ٹو فائیو پر گھر سے اکیلا ہی نکلا تھا۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس روز اسے دو جگہ ضروری کام سے جانا تھا۔ ایک تو درزی کی دکان پر سوٹ کی ٹرائی دینا تھی' دوسرے یوپی موڑ اپنی ہونے والی سسرال جانا تھا یعنی شاہدہ کریمی کے گھر۔ خریداری کے سلسلے میں کچھ معاملات طے کرنا تھے۔ خلاف معمول اور خلاف توقع جب رات بارہ بجے تک بھی ساجد واپس نہیں لوٹا تو قمر النساء کو تشویش ہوئی۔ اس نے یوسف کریمی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ ساجد رات دس بجے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ قمر النساء کو بتایا گیا کہ ساجد وہاں سے ٹیکسی پر روانہ ہوا تھا کیونکہ اس کی موٹر سائیکل میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی اس لیے موٹر سائیکل کو اس نے وہیں شاہدہ کے گھر میں کھڑا کر دیا تھا پھر آدھی رات کو سہراب گوٹھ کے نزدیک ایک ویران سڑک پر ساجد کی لاش گرے کلر کی ٹویوٹا گاڑی میں پڑی ہوئی ملی تھی جو میرے موکل فرقان صدیقی کی ملکیت تھی۔ لاش کے قریب ہی آلہ قتل بھی پایا گیا تھا۔ اعشاریہ تین دو کیلی بر کا یہ ریوالور بھی میرے موکل ہی کی ملکیت تھا۔

پولیس نے ایف آئی آر میں گاڑی اور ریوالور کے علاوہ قتل کا محرک محبت اور رقابت کو بیان کیا تھا جس کی تفصیل یہ تھی کہ میرا موکل فرقان صدیقی بھی شاہدہ سے محبت کرتا تھا بلکہ شاہدہ نے اس سے شادی کا وعدہ بھی کر رکھا تھا پھر جب اسے پتہ چلا کہ شاہدہ کی شادی ساجد حسن سے ہونے والی ہے تو اس نے ساجد حسن ...... اپنے رقیب روسیاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ازاں بعد بوکھلاہٹ میں وہ ساجد کی لاش کو گاڑی سمیت ایک ویران سڑک پر چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ یہ وہ تھیوری تھی جو پولیس نے اس واردات کے سلسلے میں بیان کی تھی۔

میں نے جب اپنے موکل سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا۔ ''بیگ صاحب! یہ حقیقت ہے کہ میں شاہدہ سے شادی کے بارے میں سنجیدہ تھا۔ میں ستارہ جیسے ''دوستوں'' کی ''سنگت'' میں زندگی گزارتے گزارتے اکتا گیا تھا اور واقعی اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ شاہدہ تقریباً چھ ماہ سے ہماری مل میں کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے سپروائزر کاشف محمود کی سفارش پر رکھا تھا تاہم شاہدہ کی زبانی اس کے گھریلو حالات سن کر مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی محرومیوں کی

دردناک کہانیاں مجھے سناتی رہتی تھی۔ میں ہر مشکل وقت میں اس کی مالی مدد کرتا رہا۔ میں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ شاہدہ کی معصوم اور من موہنی صورت میرے دل میں اترتی جارہی تھی۔ پھر جب اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تو میں خوشی سے نہال ہوگیا۔ میری آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب مجھے معلوم ہوا کہ عن قریب کسی ساجد حسن سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس وقت تک میں مختلف مدوں میں شاہدہ پر ہزاروں روپے خرچ کرچکا تھا۔ میں چاہتا تو فی الفور اسے نوکری سے نکال سکتا تھا لیکن میں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی بلکہ شاہدہ کے معاملے سے بالکل لاتعلق ہوگیا۔ میں نے عورت کی بے وفائی کے بارے میں اس سے قبل بہت کچھ سن رکھا تھا جب خود پر بیتی تو یقین آ گیا۔ میں طبعاً ایک بزدل انسان ہوں اس لیے...... شاہدہ سے بدلہ لینے کا خیال میرے دل میں آیا بھی تو میں اس پر عمل درآمد نہ کرسکا بلکہ واپس اپنی دنیا میں لوٹ گیا...... ستارہ کی دنیا...... الماس کی دنیا اور فیروزہ کی دنیا؟''

اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے کہا۔ ''فرقان میاں! جس ریوالور سے ساجد حسن کو قتل کیا گیا ہے وہ آپ کی ملکیت ثابت ہوچکا ہے۔ کیا وقوعہ کے روز وہ ریوالور بھی آپ کی ٹویوٹا گاڑی ہی میں موجود تھا؟''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''وقوعہ سے چند روز قبل میں نے وہ ریوالور شاہدہ کو دیا تھا۔''

''شاہدہ کو دیا تھا۔'' میں چونک اٹھا۔ ''آپ نے اپنا ریوالور اسے کیوں دیا تھا جبکہ اس کی بے وفائی آپ پر عیاں ہوچکی تھی۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہدہ کی منگنی کے بارے میں مجھے وقوعہ سے دو روز قبل معلوم ہوا تھا۔ جب میں نے اسے ریوالور دیا تو ہمارے درمیان تعلقات بڑے خوش گوار انداز میں چل رہے تھے۔''

''آپ نے کس مقصد کی خاطر شاہدہ کو اپنا ریوالور دیا تھا؟''

''ایک روز اسے مل سے دیر ہوگئی تھی۔'' فرقان نے بتایا۔ ''اس کے علاقے میں بس سے اتر کر گھر جاتے ہوئے ایک سنسان میدان سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے جب بھی اسے دیر ہوتی تو میں اپنی گاڑی میں اسے گھر کے نزدیک چھوڑ دیتا تھا۔ تاہم کچھ عرصے سے اس نے میری گاڑی میں بیٹھنا ترک کردیا تھا جس کی وجہ اس نے یہی بتائی تھی کہ لوگ خواہ مخواہ باتیں بناتے ہیں لیکن اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ ساجد حسن سے منگنی کے بعد سے اس نے مجھ سے کترانا شروع کردیا تھا۔'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا۔ ''تو میں بتا رہا تھا کہ اس روز جب مل سے نکلتے ہوئے اسے خاصی دیر ہوگئی تو وہ گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ میں نے اسے گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی تو اس نے کہا۔ ''آپ مجھے ریوالور دے دیں۔ میں اسے پرس میں رکھ لوں گی۔''

''کیا تمہیں اس سے حوصلہ ملے گا۔'' میں نے پوچھا۔

''بہت حوصلہ ملے گا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اگر میں نے کوئی خطرہ محسوس کیا تو ایک دو ہوائی فائر کردوں گی۔''

اس وقت نہ جانے میری عقل کہاں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی کہ میں نے راضی خوشی اپنا ریوالور اس کے حوالے کردیا۔''

میرا ذہن اس کیس کے تانے بانے بن رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''دوسرے روز آپ نے شاہدہ سے اپنا ریوالور واپس نہیں لیا تھا؟''

''میں نے اس سے اپنا ریوالور واپس مانگا تھا۔'' فرقان صدیقی نے بتایا۔ ''لیکن اس نے بتایا کہ وہ ریوالور گھر بھول آئی ہے۔ کل لادے گی۔ پھر آئندہ چند روز میں مصروفیت کی بنا پر اس نے ریوالور کے بارے میں پوچھنا بھول گیا۔ خود اس نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اس کے بعد ہمارے تعلقات کشیدہ ہوگئے پھر وہ واقعہ پیش آگیا جس کے طفیل میں آج حوالات میں پڑا ہوا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کا خیال ہے فرقان صاحب! ساجد حسن کے قتل میں شاہدہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہوسکتی ہے؟''

''میں اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔'' وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ ''شاہدہ کے بارے میں سوچتے ہوئے میں ہمیشہ ڈبل مائنڈڈ ہوجاتا ہوں۔ کبھی تو وہ مجھے انتہائی معصوم، سیدھی سادی، بھولی بھالی اور بے قصور نظر آنے لگتی ہے اور کبھی وہ میرے تصور کی آنکھ کے سامنے ایک ڈائن کا روپ دھار لیتی ہے۔ کیا کہوں، دماغ اسے بے قصور ماننے کو تیار نہیں اور دل اسے قصوروار ٹھہرانے کا روادار نہیں۔ آپ میری بے بسی کو ناپ نہیں سکتے۔''

''مجھے آپ کی بے بسی کا بخوبی اندازہ ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ واقعی شاہدہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ آپ کے دل میں جاگزیں ہوچکی ہے۔ دل جس کو اپنا مان لیتا ہے پھر اس کی تمام خامیاں بھی خوبیاں بن جاتی ہیں۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے چہرے کو نہیں بلکہ تصور کی آنکھ سے شاہدہ کی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے بلند آواز میں کہا۔

''شاہدہ کریمی کی میں اتنی تعریفیں سن چکا ہوں کہ اسے ایک نظر دیکھنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ میں نے سنا ہے، محلے کے کئی لڑکے بھی اس پر مرتے ہیں خاص طور پر ندیم خان اور مراد علی تو اس کے شیدائی ہیں۔''

''وہ چیز ہی ایسی ہے بیگ صاحب کہ جو دیکھے اس کا دیوانہ ہوجائے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''اگرچہ میرا دماغ اس کو ہرجائی اور بے وفا تسلیم کرچکا ہے لیکن دل کسی بھی طور اسے غلط سمجھنے کو تیار نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فرقان صاحب! آپ نے شاہدہ سے ملاقات کے شوق کو بھڑکا دیا ہے۔ کیا آپ مجھے اس کا ایڈریس دیں گے؟''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا پھر تفصیلاً مجھے شاہدہ کا ایڈریس سمجھانے لگا۔

میرا شاہدہ سے ملنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس سے گفتگو کے دوران میں مجھے کئی مفید باتیں معلوم ہو سکتی تھیں۔ ازیں علاوہ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسی ساحرہ ہے جس نے اتنے سارے مردوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ میں اگلے روز شام کو یو پی موڑ پر اس کی گلی میں پہنچ گیا۔

وہ ساٹھ گز پر بنا ہوا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس وقت گلی کے نکڑ پر دو تین لڑکے کھڑے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی وہیں نکڑ پر کھڑی کر دی تھی' انہی لڑکوں سے یوسف کریمی کے گھر کا پتا بھی پوچھا تھا۔ انہوں نے پہلے تو معنی خیز انداز میں مجھے سر سے پیروں تک گھورا تھا پھر اچانک ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ''وہاں چلے جائیں پیارے صاحب!''

مجھے ان لڑکوں کا انداز انتہائی ناگوار گزرا تھا تاہم میں ان سے الجھنے کے بجائے اپنے مطلوبہ دروازے پر پہنچ گیا تھا۔ میری دستک کے جواب میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک پری چہرہ نازنین تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں شاہدہ' یوسف کریمی اور شاہدہ کے چھوٹے بھائی عارف کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ شاہدہ کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس خوب رو لڑکی کو دیکھ کر یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ شاہدہ ہی ہو سکتی ہے۔

اس کی عمر کا اندازہ میں نے چوبیس اور پچیس کے درمیان لگایا جو ازاں بعد درست ثابت ہوا۔ اس کے سیاہ گھنے بال شانوں پر کٹے ہوئے تھے۔ اس وقت اس نے لون کا پھول دار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ آنکھیں گہری سیاہ اور جسم مائل بہ فربہی تھا۔ قد بوٹا اور اعضا متناسب۔ وہ مجموعی طور پر ایک حسین اور پرکشش لڑکی تھی تاہم اس کے حسن میں سادگی اور معصومیت کے بجائے ایک پختگی پائی جاتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا پھر باہر جھانک کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ گلی کے نکڑ پر کھڑے آوارہ لڑکوں میں سے ایک نے لوفرانہ نظر سے ہماری طرف دیکھا اور دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

''جانے دو استاد ڈبل اے۔''

دوسرے نے آوازہ کسا' سانوں وی لے چل نال وے......''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ شاہدہ کی شہرت محلے میں اچھی نہیں تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ شاہدہ کریمی......''

وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔ ''آپ بالکل ٹھیک دروازے پر آئے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرائی اور کہا۔ ''میں ہی شاہدہ کریمی ہوں۔ آپ

کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

''میں تمہارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گلی کے نکڑ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ باتیں دروازے پر کھڑے کھڑے نہیں ہو سکتیں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟''

اس نے ایک بے تکلف قہقہہ لگایا پھر چہکی۔ ''جگہ گھر میں نہیں انسان کے دل میں ہونا چاہیے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے دل میں خوب صورت انسانوں کے لیے ناقابل پیمائش جگہ موجود ہے۔ ویسے ابھی تک آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔''

''تعریف کا شکریہ۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مرزا امجد بیگ کہتے ہیں۔''

''آپ کی طرح آپ کا نام بھی خاصا کیوٹ ہے۔'' وہ میرے چہرے پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

میں نے سر کو ہلکا خم دے کر ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور مزید بتایا۔ ''میں ساجد حسن مرڈر کیس میں وکیل صفائی ہوں۔''

''اوہ! تو آپ وکیل صاحب ہیں۔'' وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔ ''آیئے' آیئے۔ تشریف لایئے۔ وکیل صفائی ہیں تو کیا ہوا۔ میرے دل میں خوب صورت چہروں کے لیے بڑی گنجائش ہے۔ چاہے وہ چہرہ دشمن کا ہو یا دوست کا۔'' پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

میں شاہدہ کی راہنمائی میں گھر کے ڈرائنگ روم نما کمرے میں آ گیا۔ اس کی گفتگو اور روّیے سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ چند روز قبل اس کے منگیتر کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یقیناً اسے ساجد حسن کے قتل سے ذرّہ برابر بھی دلی صدمہ نہیں ہوا ہو گا یا پھر وہ اپنے تاثرات کو چھپانے میں ماہر تھی۔

اپنی بات چیت سے شاہدہ خاصی بے تکلف معلوم ہوتی تھی۔ لڑکی اگر حسین و جمیل ہو اور ساتھ ہی بے تکلف بھی ہو تو اس کے چاہنے والوں کی قطار و شمار کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

شاہدہ کے گھر کا 'ڈرائنگ روم ان لوگوں کی حیثیت سے کہیں زیادہ سجا ہوا تھا۔ فرش پر نیا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ بھی خاصا قیمتی تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں شیلف پر اکائی کا ڈیک دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک عالی شان ٹی وی ٹرالی پر سونی کا بیس انچ کا ٹی وی موجود تھا۔ ٹرالی کے زیریں خانے میں نیشنل کا وی سی آر بھی نظر آ رہا تھا۔ ازیں علاوہ آرائش کی کئی چیزیں مختلف جگہوں پر سجی ہوئی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر میں شاہدہ اس وقت اکیلی ہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے والد صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے ڈیوٹی سے آئے تھے۔ ابھی ابھی مسجد گئے ہیں۔ مغرب

کی نماز پڑھنے کے بعد ہی واپس آئیں گے۔"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ مغرب کی نماز ختم ہونے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں نے استفسار کیا۔ "اور تمہارا چھوٹا بھائی عارف؟"

"وہ آٹھ بجے تک آتا ہے۔" اس نے جواب دیا پھر اچانک پوچھا۔ "آپ ہم تینوں میں سے کس سے ملنے آئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں تم سے اور تمہارے والد یوسف کریمی سے ملنے آیا ہوں۔ تم دونوں کا نام گواہوں کی فہرست میں موجود ہے۔ میں نے سوچا' تم لوگوں سے تھوڑی بات چیت ہو جائے۔"

وہ قدرے محتاط انداز میں بولی۔ "بیگ صاحب! آپ میرے منگیتر کے قاتل کو باعزت رہا کروانے پر مامور ہیں۔ اصولی طور پر تو ہمیں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اس کیس میں پارٹی نہیں ہیں۔ اگر فرقان صدیقی قاتل ہے تو اسے ضرور پھانسی چڑھنا چاہیے اور اگر وہ بے گناہ ہے تو اسے ضرور چھوٹ جانا چاہیے۔"

اس کے انداز سے مجھے محسوس ہوا' یا تو وہ واقعی نیوٹرل تھی یا پھر بہت اچھی اداکاری کر رہی تھی۔ میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "میرا بھی یہی اصول ہے کہ مجرم کو سزا ملنا چاہیے اور بے قصور کو رہائی ملنا چاہیے۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے' ساجد حسن کو فرقان صدیقی ہی نے قتل کیا ہوگا؟"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ روکھے پھیکے لہجے میں بولی۔ "میں خواہ مخواہ کسی پر الزام کیوں لگاؤں۔ ہاں' میں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ فرقان صاحب' ساجد حسن کو پسند نہیں کرتے تھے۔"

"اس ناپسندیدگی کی وجہ؟"

"انہیں ساجد حسن سے میرا شادی کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔"

"مگر یہ فیصلہ تو تمہارا تھا۔" میں نے شاہدہ کو یاد دلایا۔ "ساجد حسن کو ناپسند کرنے کی وجوہات کیا تھیں؟"

وہ بولی۔ "فرقان صاحب ساجد کو اپنا رقیب سمجھنے لگے تھے۔"

میں نے ذرا مختلف انداز میں سوال کیا۔ "وقوعہ کی رات مقتول ساجد حسن آپ کے گھر آیا تھا۔ تمہارے والد نے پولیس کو جو بیان دیا ہے' اس کے مطابق جب ساجد حسن گھر میں داخل ہوا تو اس وقت فرقان صدیقی بھی وہاں موجود تھا؟"

میرے موکل نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کے روز وہ ہرگز ہرگز شاہدہ کے گھر نہیں گیا تھا تاہم دونوں باپ بیٹی نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ اس روز فرقان صدیقی لگ بھگ آٹھ بجے ان کے گھر آیا تھا پھر جب نو بجے ساجد حسن وہاں پہنچا تو ان دونوں میں تلخ کلامی ہوگئی چنانچہ فرقان ناراض ہو کر غصے میں وہاں سے چلا گیا تھا۔ ان بیانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ باپ بیٹی فرقان کو ساجد حسن کے قتل میں ملوث کرنے کا پورا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔

شاہدہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ "ہاں فرقان صاحب اس وقت گھر میں موجود تھے لیکن ساجد کی آمد کے فوراً بعد ہی وہ رخصت ہو گئے تھے۔"

"شاید ان دونوں میں کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی تھی؟"

"اچھی خاصی گرما گرمی ہوئی تھی۔"

"ان دونوں کے علاوہ اس روز تمہارے گھر میں اور کون موجود تھا؟"

"بیگ صاحب! میں ایک مرتبہ پھر کہوں گی کہ وکیل صفائی ہونے کے ناتے ہمیں آپ سے بہت دور رہنا چاہیے لیکن ہم پرامن اور صلح جو انسان ہیں۔ ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اس لیے میں آپ کے سوال کے جواب میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ ان دونوں کے علاوہ اس روز ہمارے گھر میں باہر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کسی سوال پر بدک جائے اس لیے میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ڈرائنگ روم کا قالین بہت خوب صورت ہے۔ یہ کتنے میں خریدا ہے؟"

"پورے بارہ ہزار میں۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔

میں نے اس میں ہوا بھرتے ہوئے کہا۔ "یقیناً یہ تم نے اپنی پسند سے خریدا ہوگا۔ بہت خوب صورت انتخاب ہے تمہارا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ ایسی چوائس تم ہی کر سکتی ہو۔"

وہ خوشی آمیز حیرانی سے بولی۔ "آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" پھر پوچھا۔ "آپ نے کس بنا پر یہ اندازہ قائم کیا تھا؟"

میں نے کہا۔ "دیکھو بھئی' سیدھی سی بات ہے۔ تمہارے والد سیدھے سادے مذہبی ٹائپ کے آدمی ہیں۔ وہ اتنی قیمتی اور شان دار چیزوں کو فضول خرچی میں شمار کرتے ہوں گے۔ اس قسم کی مہنگی چیزیں تمہارے جیسی باذوق لڑکی ہی خرید سکتی ہے۔ اس عمدہ قالین کی طرح صوفہ سیٹ' ٹی وی' وی سی آر اور ڈیک وغیرہ بھی تمہاری ہی کوششوں کا نتیجہ نظر آ رہا ہے مجھے۔"

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے انداز میں ایک تفاخر' ایک غرور جھلکتا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں غیر محسوس طور پر شاہدہ کے مالی حالات کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جیسا کہ شروع میں' میں نے بیان کیا ہے' ٹیکسٹائل مل سے شاہدہ کو پندرہ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وہ ایک فیشن ایبل لڑکی تھی اس لیے اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ وہ لباس اور اشیائے سنگھار پر خرچ کر دیتی ہوگی۔ چھوٹا بھائی ایک ہزار تنخواہ پاتا تھا جس میں سے کبھی وہ چار سو اور کبھی پانچ سو گھر میں دیتا تھا۔ یوسف کریمی کو پرائیویٹ کمپنی سے بارہ سو روپے ملتے تھے۔ اس نے گھر کی تعمیر کے لیے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرضہ لے رکھا تھا جس کی وہ چھ سو روپے ماہوار قسط ادا کرتا تھا۔ اس حساب سے ہر ماہ گھر میں اٹھارہ سو پچاس روپے کی رقم آتی تھی ایسی صورت میں گھر کے اخراجات کو نکال کر یہ ممکن نہیں تھا کہ بیس انچ کا کلر ٹی وی' وی سی آر' ڈیک اور قیمتی قالین و صوفہ

سیٹ خریدے جاسکتے۔اس سامان تعیش کی خریداری کے لیے پیسے کہاں سے آتے تھے۔یہ بات اس گھر کا ہر فرد جانتا تھا۔یہ سہرا یقیناً شاہدہ کے سر ہی بندھتا تھا جو مختلف صاحب ثروت لوگوں کو شادی کا آسرا دے کران سے لمبی لمبی رقمیں اینٹھتی رہتی تھی۔میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے پوچھا۔

''شاہدہ!تم نے جو قیمتی اور عالی شان سامان گھر میں بھر رکھا ہے اس کی ماہانہ قسط کتنی جاتی ہے؟''

وہ چونکی اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔''قسط؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''ہاں قسط۔''

''جناب' میں قسطوں کے چکر میں نہیں پڑتی۔'' وہ تبسم ریز لہجے میں بولی۔''یہ سارا سامان میں نے نقد خریدا ہے۔''

میں نے اس کی دوراندیشی کو سراہا اور بڑی ہوشیاری سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس نے کون سی چیز کس دکان سے اور کتنی قیمت پر خریدی تھی۔

وہ بولی۔''انسان چاہے تو زندگی میں دنیا کی ہر آسائش اسے میسر آسکتی ہے۔بس ذرا کوشش کرنا پڑتی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔''میں تمہاری بات سے صدفی صد اتفاق کرتا ہوں۔''

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی پھر اس سے پہلے کہ شاہدہ جا کر دروازہ کھولتی' ایک دراز قامت نوجوان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور شاہدہ کو دیکھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بولا۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی؟''

''آؤ کاشف۔'' شاہدہ نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''ان سے ملو۔یہ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں۔ساجد حسن مرڈر کیس انہی کے پاس ہے۔''

''اوہ' وکیل صاحب۔'' کاشف نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اتفاق سے اس کیس کے سلسلے میں ابھی تک میرا عدالت جانا نہیں ہوسکا ویسے گواہوں کی فہرست میں میرا نام موجود ہے۔آپ وکیل استغاثہ ہیں نا۔اور سنائیں' فرقان صدیقی کو کب پھانسی پر لٹکوا رہے ہیں؟''

شاہدہ جلدی سے بولی۔''بیگ صاحب!یہ میرے کزن کاشف محمود ہیں۔یہ فائن ٹیکسٹائل مل میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔'' پھر وہ کاشف کی طرف مڑی۔''کاشف!بیگ صاحب اس کیس میں وکیل صفائی ہیں۔''

''وکیل صفائی۔'' کاشف یوں اچھلا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔''وکیل صفائی یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

پھر وہ شک آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔وہ خاصا محتاط اور چالاک دکھائی دیتا تھا۔مقتول کی والدہ کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ کاشف انہیں خاصی دھمکیاں دیتا رہا تھا۔یہ وہی کاشف تھا جو شاہدہ کو پسند کرتا تھا۔وہ نہ تو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی یہ چاہتا تھا کہ کہیں اور اس کی شادی ہو۔اس حوالے سے میری نظر میں وہ خاصا خطرناک آدمی تھا۔

شاہدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''کیوں کاشف!وکیل صفائی ہمارے گھر میں کیوں نہیں آسکتے۔بیگ صاحب کو تم کوئی ایسا ویسا وکیل نہ سمجھو۔یہ بہت اچھے انسان ہیں۔تم ان سے بات چیت کرو گے تو میری بات کے قائل ہو جاؤ گے۔''

''نہ بابا۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔''میں بات چیت کے بغیر ہی ٹھیک ہوں۔میں اتنا نادان نہیں ہوں کہ وکیل مخالف سے گفتگو شروع کر دوں پہلے ہی پولیس والوں نے خوامخواہ میرا نام استغاثہ کے گواہوں میں ڈال دیا ہے۔پتہ نہیں' عدالتوں میں کہاں کہاں دھکے کھانے پڑیں گے۔میں تو اس گھڑی کو پچھتا رہا ہوں جب وقوعہ کے روز یہاں چلا آیا تھا۔نہ میں ان دونوں کی تلخ باتیں سنتا اور نہ ہی خوامخواہ گواہی کے سلسلے میں مجھے گھسیٹا جاتا۔''

وہ روا روی میں ایک اہم انکشاف کر گیا تھا۔یعنی وقوعہ کے روز وہ بھی شاہدہ کے گھر میں موجود تھا۔میرے لیے یہ بات بہت اہم تھی۔میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔''کاشف میاں!وقوعہ کے روز ان دونوں میں کس بات پر تلخ کلامی ہوئی تھی؟''

یہ سوال میں نے محض کاشف کو گھیرنے کے لیے کیا تھا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میرا موکل مذکورہ روز وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

کاشف نے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔''میں نے کہا نا' میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔آپ کو جو کچھ پوچھنا ہو' عدالت کے کمرے میں پوچھیے گا۔''

وہ شاہدہ کی بہ نسبت زیادہ ہوشیار' سمجھدار اور چالاک معلوم ہوتا تھا۔میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے برخوردار!اب تم سے عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔''

شاہدہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر تشویش ناک لہجے میں بولی۔''بیگ صاحب!آپ ناراض ہو کر یہاں سے جا رہے ہیں۔کاشف کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لیں۔اس کی تو مذاق کی عادت ہے۔''

میں نے کہا۔''شاہدہ بی بی!میں نے کاشف کی باتوں کو واقعی سنجیدگی سے نہیں لیا۔''

''آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟'' وہ اپنائیت سے بولی۔''ابھی تو میں آپ کی کوئی خاطر تواضع بھی نہیں کر پائی اور آپ چل دیے۔'' پھر اس نے گھور کر کاشف کی جانب دیکھا۔''تمہیں بھی اسی وقت آنا تھا؟''

''میرا آنا ایسا ہی ناگوار گزر رہا ہے تو چلا جاتا ہوں بھئی۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس وقت وکیل صفائی کے ساتھ مصروف ہو۔''

"بھئی، تم آپس میں یہ لڑائی جھگڑا بند کرو۔" میں نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں جا رہا ہوں، اللہ حافظ۔"

پھر اس سے پہلے کہ شاہدہ مجھے روکنے کی کوئی اور کوشش کرتی، میں اسے کے گھر سے باہر آ گیا۔

دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی ایک ادھیڑ عمر بڑے میاں سے میری مڈبھیڑ ہوگئی۔ رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ گلی میں کوئی روشنی کا معقول انتظام نہیں تھا تاہم بعض گھروں کی روشن بتیاں تھوڑا بہت گلی میں بھی اجالا کر رہی تھیں۔

ادھیڑ عمر شخص نے سر سے پاؤں تک بغور میرا جائزہ لیا پھر شاہدہ کے دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ ابھی اسی دروازے سے نکلے ہیں؟"

"جی ہاں، میں اسی دروازے سے برآمد ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ میں اس کے تیوروں سے سمجھ گیا تھا کہ وہ شاہدہ کا باپ یوسف کریمی تھا۔ میں نے کہا۔ "غالباً آپ یوسف کریمی ہیں؟"

"ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کیا آپ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے پہلے کبھی آپ کو دیکھا نہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔ میں نے کہا۔ "میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔ ساجد حسن مرڈر کیس میں، میں وکیل صفائی ہوں۔"

وہ ایک دم چوکنا ہوگیا۔ "آپ وکیل صفائی ہیں تو یہاں کیوں آئے ہیں۔ آپ تو ایک قاتل کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ ہم اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "آپ تو سیدھے سیدھے فرقان صدیقی کو پھانسی چڑھانے میں مدد دے سکتے ہیں۔"

"جی، کیا کہا آپ نے؟"

میں نے بات بدل دی۔ "قبلہ، میں ابھی ابھی آپ کی صاحب زادی شاہدہ اور آپ کے بھتیجے سے بھرپور ملاقات کر کے آ رہا ہوں۔ ان سے مجھے بڑی مفید معلومات حاصل ہوئی ہے۔"

اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آپ کس بھتیجے کا ذکر کر رہے ہیں؟"

میں یہ بات معلوم کر چکا تھا کہ کاشف سے شاہدہ کی کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ وہ محض دنیاداری اور بہت سے معاملات کی پردہ پوشی کے لیے اسے اپنا کزن بتاتی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی میں نے یوسف کریمی کے سامنے اس کے بھتیجے کا حوالہ دیا تھا اور اس کے الجھنے سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ کاشف ان کا کچھ بھی لگتا لگاتا نہیں تھا۔

میں نے یوسف کے سوال کے جواب میں بتایا۔ "بزرگوار! میں آپ کے بھتیجے کاشف محمود کی بات کر رہا ہوں جو لیاقت آباد میں رہتا ہے۔ وہ اس وقت آپ کے گھر میں موجود ہے۔ میری ابھی

اس سے بات ہوئی ہے۔"

"کیا بات ہوئی ہے؟" وہ خاصا ہراساں نظر آنے لگا۔

میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا۔ "ان دونوں کا خیال ہے کہ فرقان صدیقی ہی نے ساجد حسن کو قتل کیا ہے۔"

وہ بھاری لہجے میں بولا۔ "اس میں شک کی کیا گنجائش ہے۔ مجھے تو فرقان صدیقی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ خواہ مخواہ میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ خیر آپ تو اس کے وکیل ہیں۔ آپ ہمارے دکھ کو کیا سمجھیں گے؟"

میں نے اس کے خیال پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے اپنی گاڑی کا رخ کیا جو گلی کے نکڑ پر کھڑی تھی۔ میں دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اچانک اندھیرے میں سے ایک شخص نکل میرے سامنے آ گیا۔ "السلام علیکم!"

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس نے معنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ "یوسف کریمی سے ملاقات ہوگئی جناب کی؟"

"آپ کون ہیں اور یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"آپ غالباً پہلی مرتبہ اس علاقے میں آئے ہیں۔" وہ شخص محتاط لہجے میں بولا۔ "پہلے کبھی آپ کو آتے جاتے دیکھا نہیں ہے۔"

اس کے انداز میں کوئی خاص بات تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ مجھے کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہو لیکن پوری طرح کھل کر بات بھی نہ کر رہا ہو۔ میں نے اس کی جھجک دور کرنے کی خاطر کہا۔

"جناب اس علاقے میں تو پہلی مرتبہ نہیں آیا البتہ یوسف کریمی کے گھر پہلی بار آنا ہوا ہے۔"

وہ ذو معنی انداز میں بولا۔ "خیر اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔" پھر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نیچی آواز میں کہنے لگا۔ "آپ جانتے ہیں کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میری تو آج پہلی ملاقات تھی۔ آپ یہیں کے رہنے والے ہیں۔ آپ ہی ان کے بارے میں بتا دیں۔"

اس کے لیے اتنی حوصلہ افزائی کافی تھی۔ جلدی سے بولا۔ "صاحب! کیا بتائیں، بے حیائی اور بے شرمی کی انتہا ہو چکی ہے۔ یوسف کریمی کا گھر کیا ہے، فحاشی کا اڈا بنا ہوا ہے۔ ایک کار والا آتا ہے، ایک جاتا ہے۔ یوسف کریمی کی بیٹی جانے کہاں کہاں سے مرغے پھانس کر لاتی ہے۔ آپ بھی شاید رشتے کے چکر میں آئے ہیں۔ آپ شکل سے مجھے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ شاہدہ کے چکر میں نہ پھنسیں۔ اس نے تو جانے کتنوں سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ساجد نامی ایک شخص کا یہاں بہت آنا جانا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بھی منع کیا

تھا مگر اس نے کہا کہ شاہدہ اس کی منگیتر ہے۔ میں ان لوگوں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ مال دار اسامیوں سے اسی طرح مال بٹورتے ہیں پھر دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکتے ہیں۔" پھر وہ دھیمی آواز اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "ساجد نامی اس شخص کو تو لگتا ہے خود ان لوگوں ہی نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

"ٹھکانے لگا دیا ہے، کیا مطلب۔" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اسے قتل کروا دیا ہے؟"

وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا۔ "یہ خبر تو سارے اخباروں میں چھپی تھی۔ ساجد حسن سے شاہدہ نے جھوٹی منگنی کر رکھی تھی، جب ساجد نے شادی پر اصرار کیا تو بے چارہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یوسف کریمی نے تو بیٹی کو کمائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ اس کی شادی کیسے کر سکتا ہے۔ جب ساجد نے اپنی رقوم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو انہوں نے اسے قتل کروا دیا۔ میں اسی لیے آپ کو ابھی سے ہوشیار کر رہا ہوں۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ آپ ان کے چکر میں پڑ کر خود کو خوار نہ کریں۔"

وہ شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ میں شاہدہ کے چکر میں وہاں آیا ہوں۔ میں نے اس کی خوش فہمی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "یاد آ رہا ہے، یہ خبر تو میں نے بھی پڑھی تھی۔ قاتل تو غالباً پکڑا بھی گیا تھا۔"

"جو شخص پکڑا گیا ہے، وہ بھی اسی نامراد کے چکر میں تھا۔" نامراد سے اس کی مراد شاہدہ سے تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ فرقان صدیقی نے ساجد کو قتل کیا ہو۔ وہ تو خاصا سمجھ دار اور شریف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے بھی شاہدہ نے شادی کا جھانسا دے رکھا تھا۔ وہ اچھی خاصی رقمیں شاہدہ پر خرچ کرتا رہا ہے۔"

"میں نے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں ساجد حسن کو کس نے قتل کیا ہوگا؟"

"یہ بات تو میں نہیں جانتا۔" وہ قدرے محتاط ہو گیا۔ "لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ اس قتل میں یوسف کریمی کے گھرانے کا ہاتھ ہے۔"

"کیا آپ یہ بات عدالت میں بھی کہہ سکتے ہیں؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر قدرے سخت لہجے میں بولا۔ "آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے تعارف کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب آپ پوچھ رہے ہیں تو بتاتا ہوں۔ میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ میں ساجد حسن مرڈر کیس میں وکیل صفائی ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "میں ساجد حسن، فرقان صدیقی اور شاہدہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ جائیں اپنا کام کریں۔"

پھر وہ چپکے سے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ شریف شہری تھانوں اور عدالتوں کی خواری سے ڈرتے ہوئے حقائق کو سامنے لانے سے کتراتے ہیں۔ معمولی سی گواہی کے لیے کئی کئی پیشیوں پر حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رضاکارانہ طور پر کوئی اہم اطلاع دینے تھانے چلا جائے تو پولیس والے اس کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس شخص کو بھی جیسے ہی معلوم ہوا تھا کہ میں ایک وکیل ہوں، وہ کان دبا کر شرافت سے ایک جانب ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی کو گلی سے باہر نکالا اور میں نے روڈ پر آ کر اس کا رخ اپنے گھر کی جانب موڑ دیا۔

❀ ❀ ❀

مقدمے کی ابتدائی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے میرے موکل اور اس مقدمے کے ملزم فرقان صدیقی پر فرد جرم عائد کر دی اور باقاعدہ سماعت کے لیے تاریخ دے دی۔ جب ملزم پر فرد جرم لگائی گئی تو اس نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہوں کا تذکرہ ہی کروں گا۔ ان اہم گواہوں میں یوسف کریمی کا پڑوسی صدر الدین، یوسف کریمی، شاہدہ کریمی اور کاشف محمود شامل تھے۔

پوسٹ مارٹم کی فائنل رپورٹ کے مطابق مقتول ساجد حسن کی موت آٹھ اگست کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب اعشاریہ تین دو کی وہ گولی ہی بنی تھی جو فرقان صدیقی کے ریوالور سے چلائی گئی تھی۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ پیشانی میں لگنے والی مذکورہ گولی ہی نے مقتول کی جان لی تھی۔

پولیس نے قتل کا محرک محبت اور رقابت کو قرار دیا تھا۔ پولیس نے عدالت میں جو چالان پیش کیا تھا، اس کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول اور ملزم کے درمیان شاہدہ کے گھر پر اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ ملزم کو اس بات پر سخت غصہ تھا کہ شاہدہ نے شادی کا وعدہ تو اس سے کیا مگر منگنی مقتول سے کر ڈالی۔ پولیس کے مطابق جب مقتول شاہدہ کے گھر پہنچا تو ملزم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مقتول کی آمد نے ملزم کو مشتعل کر دیا اور ان کے درمیان تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ ہونے لگا پھر مقتول تقریباً نو بجے رات ناراض ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے جانے کے تقریباً دس منٹ بعد ملزم بھی وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ ازاں بعد رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو کر ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی لاش کو اپنی گاڑی سمیت ایک ویران سڑک پر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں ریکارڈ کی درستی کی خاطر اس کیس کے آئی۔ او (انکوائری افسر) سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

عدالت نے میری درخواست منظور کرلی۔

عدالت کے حکم پر اس کیس کا تفتیشی افسر مشتاق احمد گواہوں کے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک اے ایس آئی تھا اور سرکاری وردی میں ملبوس وہ خاصا چاق و چوبند نظر آتا تھا۔

میں نے اپنی فائل کھول کر اس کے ایک صفحے پر نظر جماتے ہوئے۔ ''آئی او'' سے سوال کیا۔

''جناب انکوائری افسر صاحب! ایف آئی آر کے مطابق آپ کو اس واردات کی اطلاع تقریباً رات گیارہ بجے پہنچائی گئی تھی اور پولیس تقریباً پندرہ منٹ بعد جائے وقوعہ پر پہنچ گئی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''پولیس نے جائے وقوعہ کا جو نقشہ تیار کیا ہے' اس کے مطابق مقتول کی لاش گرے کلر کی ٹویوٹا کے اندر پائی گئی تھی؟''

''بالکل صحیح ہے جناب۔''

''آلہ قتل بھی گاڑی کے اندر ہی سے دستیاب ہو گیا تھا؟''

''بالکل درست۔''

میں نے کہا۔ ''آلہ قتل جو اعشاریہ تین دو کا ایک ریوالور تھا' اس پر سے ہر قسم کے فنگر پرنٹس صاف کر دیئے گئے تھے؟''

وہ بولا۔ ''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آلہ قتل اور مذکورہ گرے کلر ٹویوٹا ملزم فرقان صدیقی کی ملکیت ہیں؟''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے ہم ملزم کو ناپنے میں کامیاب ہوئے۔''

میں دانستہ گھما پھرا کر یہ غیر اہم سوالات کر رہا تھا۔ اس طرح دراصل میں انکوائری افسر کے دماغ کو الجھانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنے اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی پھر میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے اے ایس آئی مشتاق احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔ کہ ملزم قتل کی واردات کرنے کے بعد اپنی گاڑی کو سہراب گوٹھ کے قریب ایک ویران سڑک پر لاش سمیت چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''بالکل' ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور بوکھلاہٹ میں وہ گاڑی کی چابیاں بھی نکالنا بھول گیا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کیونکہ اس وقت وہ جلد از جلد جائے واردات سے دور چلا جانا چاہتا تھا؟''

''جی ہاں' ملزم نے ایسا ہی کیا تھا۔''

چابیوں والی بات پولیس رپورٹ میں شامل نہیں تھی۔ یہ بات میں نے اپنی طرف سے لگائی تھی۔ میں نے آئی او کو چابیوں کے بارے میں سوچنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور فوراً ہی اگلا سوال کر ڈالا۔

''پولیس رپورٹ کے مطابق ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد آپ نے مذکورہ گرے کلر کی ٹویوٹا اپنے قبضے میں لے لی تھی اور آپ قریباً رات بارہ بجے جائے وقوعہ سے روانہ ہوئے تھے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میری توقع کے عین مطابق وہ میرے سوال کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مذکورہ گاڑی کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد آپ واپس متعلقہ تھانے میں آ گئے تھے۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ گاڑی کو جائے وقوعہ سے کون ڈرائیو کر کے تھانے تک لایا تھا؟''

آئی او نے کہا۔ ''اتنی اہم بات نہیں تھی اس لیے اس کا ذکر ہم نے ضروری نہیں سمجھا۔''

''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری معلومات کے لیے اس پولیس اہلکار کا نام بتا دیں جو ملزم کو جائے وقوعہ سے تھانے تک لایا تھا؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ ''میرا خیال ہے' ہیڈ کانسٹیبل شرافت علی نے مذکورہ گاڑی کو ڈرائیو کر کے تھانے تک پہنچایا تھا۔''

''تھینک یو آئی او صاحب۔''

اس کے بعد میں نے سوالات کا سلسلہ ختم کر دیا۔

استغاثہ کے گواہوں میں سے سب سے پہلے شاہدہ کا پڑوسی صدر الدین گواہی دینے کے لیے آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ اس بات کا گواہ تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے شاہدہ کے گھر کے سامنے ملزم کی گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ چونکہ میرا موکل سرے سے اس روز وہاں گیا ہی نہیں تھا لہٰذا صدر الدین کی گواہی سراسر پولیس کا کارنامہ تھا۔ صدر الدین کی عمر لگ بھگ پینتیس سال تھی۔ وہ شکل سے ایک موقع پرست اور لالچی شخص دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے کچھ رقم دے کر خریدا گیا تھا۔

صدر الدین اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ نے چند رسمی سے سوالات کیے۔ سارا زور اس بات پر تھا کہ وقوعہ کے روز اس نے ملزم کی گاڑی یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑی دیکھی تھی۔
وکیل استغاثہ اپنے سوالات سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مذکورہ روز میرا موکل وہاں گیا تھا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے صدر الدین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''صدر الدین! تم کیا کرتے ہو؟''

''ادھر یو پی موڑ پر پھل کا ٹھیلا لگاتا ہوں جناب۔''

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز تم نے کتنے بجے ملزم کی گاڑی کو یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑے دیکھا تھا؟''

''میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی جناب! لیکن میرا خیال ہے، اس وقت ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تم اس وقت گلی میں ہی کھڑے تھے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''تو پھر تم اس وقت گھر کے اندر ہوگے۔''

''نہیں جناب! میں اس وقت اپنا ٹھیلا کھڑا کر کے واپس گھر آ رہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں نے ایک نظر گاڑی پر ڈالی پھر اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ گاڑی وہاں سے کتنے بجے روانہ ہوئی تھی؟''

''نہیں جناب! میں نے اس گاڑی کو اپنی آنکھوں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ خواہ مخواہ جھوٹ کیوں بولوں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''خواہ مخواہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔'' پھر میں نے دھیمے لہجے میں خود کلامی کی ''اور اگر کوئی فائدہ مند جواز موجود ہو تو جھوٹ بولنے میں دیر بھی نہیں کرنی چاہیے۔''

میرا یہ تبصرہ جج کی سماعت تک نہیں پہنچا تھا البتہ صدرالدین نے واضح طور پر میری بات سن لی تھی جس پر وہ تھوڑا خفیف بھی ہوا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''صدرالدین! جس گلی میں آپ کی رہائش ہے، کیا اس میں اسٹریٹ لائٹس نصب ہیں؟''

''نہیں جناب، ہماری گلی میں روشنی کا ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔''

''کیا آپ لوگوں نے گلی کو روشن کرنے کے لیے اپنے گھروں کے باہر بلب وغیرہ لگا رکھے ہیں؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہماری گلی میں گھروں کے باہر بلب وغیرہ نہیں لگے ہوئے۔''

''آپ نے بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے یوسف کریمی یعنی اپنے پڑوسی کے گھر کے سامنے گرے کلر کی ایک گاڑی دیکھی تھی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سی گاڑی تھی؟''

وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ ''بس وہ گاڑی تھی۔ کون سی کیا مطلب!''

میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب ہے گاڑی کا مارک کیا تھا؟''

''یہ کیا ہوتا ہے جناب؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا۔ ''صدرالدین صاحب! یہ بتائیں وہ گاڑی مزدا تھی، فورڈ تھی، اوپل تھی، ٹویوٹا تھی یا

کوئی اور قسم کی گاڑی تھی۔''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے بے بسی سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ ''میں نے تو بس اتنا دیکھا تھا کہ گاڑی کا رنگ گرے تھا۔''

''آپ نے اس گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟''

''جی نہیں، میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا۔''

''کیا آپ کو ملزم کی گاڑی کا نمبر یاد ہے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو گاڑی کا مارک معلوم نہیں، اس کے نمبر سے آپ واقف نہیں ہیں اس کے باوجود آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے ملزم کی گاڑی کو وقوعہ کے روز یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑے دیکھا تھا۔''

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''میں اس گاڑی کو پہلے بھی یوسف کے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھ چکا تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ شاہدہ کی فیکٹری کے منیجر فرقان صدیقی کی گاڑی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ یہ بات دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی گلی میں کبھی گرے کلر کی کوئی دوسری گاڑی داخل نہیں ہوئی یا یوں سمجھیں کہ کیا آپ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یوسف کریمی کے دروازے کے سامنے ملزم کی گاڑی کے علاوہ کبھی کوئی گرے کلر کی گاڑی کھڑی نہیں ہوئی؟''

''میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں جناب!'' وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''میں سارا دن گلی میں پہرا تو نہیں دیتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''صدرالدین صاحب! کیا آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ گاڑی قتل کی کسی واردات میں استعمال ہونے والی ہے؟''

''جی نہیں، میں یہ بات کیسے جان سکتا تھا۔''

''آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے گلی میں گرے کلر کی گاڑی کھڑی دیکھ کر بس یہ فرض کر لیا کہ ملزم وہاں آیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے وقوعہ کے روز جو گاڑی دیکھی تھی وہ میری تھی تو آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''آپ وکیل ہیں، میں آپ سے بحث تو نہیں کر سکتا۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ کو اس بات کا پورا یقین نہیں ہے کہ آپ نے جو گاڑی یوسف کریمی کے دروازے پر کھڑی دیکھی تھی اس میں ملزم فرقان صدیقی ہی وہاں پہنچا ہوگا؟''

وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ ”جناب! میں نے نہ تو اپنی آنکھوں سے ملزم کو اس گاڑی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی یوسف کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ پوچھا تھا کہ ان کے گھر میں کون آیا ہے۔“

میں نے اسے چکر دینے کے لیا کہا۔ ”میں نے خود اس گلی میں جا کر اہل محلہ میں سے بعض لوگوں سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن کسی نے بھی گرے کلر کی گاڑی کی وہاں موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔“

”دوسروں کے بارے میں میں جواب دہ نہیں ہوں۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے جو دیکھا تھا وہ آپ کو بتا دیا۔“

وہ خاصا پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔

میں نے مزید ایک دو سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ اپنی جرح سے میں نے معزز عدالت کو یہ باور کرا دیا تھا کہ گواہ صدرالدین نے رٹا رٹایا بیان دیا تھا۔ پولیس نے اسے جو سبق پڑھایا تھا اس کی معلومات اس سے زیادہ نہیں تھیں اور صدرالدین کے بیان سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وقوعہ کے روز میرا موکل یوسف کریمی کے گھر گیا تھا۔

اگلی گواہی یوسف کریمی کی تھی۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عدالت میں ایک وقت میں صرف ایک گواہ کی گواہی لی جاتی ہے۔ تاکہ ایک گواہ کی شہادت دوسرے گواہ کو متاثر نہ کر سکے۔

یوسف کریمی نے حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا کہ وقوعہ کے روز اس کا ہونے والا داماد مقتول ساجد حسن تقریباً نو بجے ان کے گھر آیا تھا۔ وہ اپنی ہنڈا ون ٹو فائیو میں وہاں پہنچا تھا۔ گھر میں اس وقت ملزم فرقان صدیقی پہلے سے موجود تھا جو کسی ضروری کام سے وہاں آیا ہوا تھا۔ کسی بات پر ان دونوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ ملزم دراصل مقتول کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ تاہم تھوڑی دیر کے بعد مقتول وہاں سے چلا گیا۔ اس کی موٹر سائیکل خراب ہو گئی تھی اس لیے اسے ٹیکسی میں وہاں سے جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد ملزم بھی اپنی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔

اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد مجھے موقع فراہم کیا۔ میں سوالات کے لیے یوسف کریمی کے کٹہرے کے پاس آیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یوسف صاحب! وقوعہ کے روز ملزم آپ کے گھر کتنے بجے پہنچا تھا؟“

”تقریباً آٹھ بجے۔“

”وہ آپ کے گھر سے کتنے بجے رخصت ہوا تھا؟“

”میرا خیال ہے دس سوا دس بجے وہ چلا گیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ اس روز آپ کا ہونے والا داماد آپ کے یہاں کتنے بجے آیا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ساجد حسن تقریباً نو بجے ہمارے یہاں پہنچا تھا۔“

”اس کی روانگی کتنے بجے ہوئی تھی؟“

”ملزم سے چند منٹ پہلے۔“ یوسف کریمی نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے ساجد کے کوئی دس پندرہ منٹ بعد ملزم بھی وہاں سے چلا گیا تھا۔“

”آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ مقتول اور ملزم کے مابین کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟“

”اصل بات تو مجھے معلوم نہیں۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”ویسے ان کے درمیان اصل مسئلہ رقابت کا تھا۔“

”کیسی رقابت؟“

”ہم نے شاہدہ کی منگنی ساجد حسن سے کر دی تھی اور عنقریب ان کی شادی ہونے والی تھی لیکن ملزم اس بات پر بضد تھا کہ شاہدہ کی شادی اس سے کر دی جائے۔ وہ ساجد حسن کو اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی بیٹی نے میرے موکل سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟“

”یہ سراسر جھوٹ ہے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”ملزم کا گھڑا ہوا افسانہ ہے۔ میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کی بیٹی نے مختلف اوقات میں مختلف افراد سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس کی مل کا منیجر اور میرا موکل تو کوئی مرتبہ اسے اپنی گاڑی میں گھر چھوڑنے بھی آیا تھا اور اس نے شادی کے وعدے کی آس میں آپ لوگوں پر اچھی خاصی رقم بھی خرچ کر دی تھی؟“

”مجھے اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”وکیل صفائی معزز گواہ کی نجی زندگی کو مجروح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے روکا جائے۔“

جج نے مجھے ہدایت کی کہ میں گواہ کو گواہی تک محدود رکھوں۔ میں نے کہا ”جناب عالی! معزز گواہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے اس کے خانگی معاملات کا ذکر از حد ضروری ہے۔ اس سے خدانخواستہ کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔“

جج نے مجھے محتاط سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے یوسف کریمی سے پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ آپ ایک پرائیوٹ فرم میں بارہ سو روپے ماہوار پر کام کرتے ہیں اور آپ کی تنخواہ سے چھ سو روپے ”ایچ بی ایف سی“ کی قسط ادا ہو جاتی ہے۔“

”آپ کی معلومات درست ہیں۔“

”کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ کا چھوٹا بیٹا صدر میں جوتوں کی ایک دکان پر کام کرتا ہے اور وہاں سے ایک ہزار روپے اسے ماہوار ملتے ہیں جس میں سے کبھی اس نے پانچ سو سے زیادہ گھر پر نہیں دیے؟“

اس نے میری معلومات کی تصدیق کی' میں نے کہا۔ ''آپ کی بیٹی شاہدہ کریمی پچھلے چھ ماہ سے فائن ٹیکسٹائل مل میں کام کر رہی ہے اور اس کی ماہانہ آمدنی پندرہ سو روپے ہے۔ جس کا کم و بیش نصف وہ اپنی آرائش و زیبائش پر خرچ کر دیتی ہے؟''

''میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں اس کے شوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔'' وہ قدرے برہم لہجے میں بولا۔

''رکاوٹ بننا یا نہ بننا آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں صرف اس بات کی تصدیق چاہتا ہوں کہ آپ کے گھر میں ماہانہ زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے آتے ہیں یعنی ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی قسط اور شاہدہ کے ذاتی اخراجات نکال کر۔''

''آپ نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں وہ تقریباً درست ہیں۔''

''شکریہ یوسف صاحب!'' میں نے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب اس بات کی تصدیق بھی کر دیں کہ گذشتہ چھ ماہ میں آپ کے گھر میں بیس انچ کا رنگین ٹی وی' وی سی آر' ڈیک' عمدہ قالین' صوفہ سیٹ اور دیگر سجاوٹ کی چیزیں لائی گئی ہیں۔ اس خریداری کے لیے پیسا کہاں سے آیا ہے؟''

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت کی۔ ''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے' وکیل صفائی انتہائی غیر متعلق سوالات کر رہے ہیں۔ یہ انکم ٹیکس کا کیس نہیں ہے۔ معزز گواہ کو فاضل وکیل کے سوال کا جواب دینے کے لیے پابند نہیں کیا جا سکتا۔''

جج نے مجھے تنبیہہ کی کہ میں موجودہ کیس سے متعلق ہی سوال کروں۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں جس جانب عدالت کی توجہ دلانا چاہتا تھا وہ کام ہو چکا تھا۔ میں نے گواہ یوسف کریمی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کریمی صاحب! کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ وقوعہ کے روز مقتول اور ملزم کے علاوہ بھی باہر کا ایک آدمی آپ کے گھر میں موجود تھا۔''

''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اس روز کاشف محمود بھی میرے گھر میں موجود تھا۔''

''کاشف سے آپ کی کیا رشتے داری ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے' وہ آپ کا بھتیجا لگتا ہے؟''

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی معزز گواہ کے اندرونی معاملات میں خواہ مخواہ مداخلت کر رہے ہیں۔ مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔''

جج میرا زاویہ سوال سمجھ گیا تھا۔ اس نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔ میں نے یوسف کریمی کے سامنے اپنا سوال دہرایا تو اس نے جواب دیا۔

''کاشف سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں ہے' بس ہمارے درمیان خاندانی تعلقات ہیں۔''

''کیا کاشف شادی شدہ ہے؟''

''جی نہیں' اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

''میں نے سنا ہے' کاشف بھی آپ کی بیٹی کے چاہنے والوں میں سے ایک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شاہدہ نے اس سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کاشف محمود ہی کی سفارش پر شاہدہ کو فائن ٹیکسٹائل مل میں نوکری ملی تھی۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں سن رکھا۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''نہ ہی میں ایسی باتوں کے بارے میں جانتا ہوں۔''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کاشف کے گھر کا اور کون کون سا فرد آپ کے گھر میں ملنے آتا ہے۔؟''

وہ اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''میں دن بھر دفتر میں ہوتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔''

''آپ کتنی مرتبہ کاشف کے گھر لیاقت آباد گئے ہیں؟'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''آ...... آپ...... مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

اس موقع پر وکیل استغاثہ اس کی مدد کو آیا اور ''آبجیکشن یور آنر'' کہنے کے بعد اس نے مختصری تقریر کر ڈالی لیکن جج نے اس کے تمام اعتراضات کو یکسر مسترد کرتے ہوئے گواہ کو جواب دینے کا حکم دیا۔ دراصل جج میری جرح کے مقصد کو سمجھ گیا تھا۔ میں اسے اپنے خطوط پر سوچنے کے لیے مجبور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یوسف کریمی نے تھوک نگل کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ''میں دن بھر دفتر میں مصروف رہتا ہوں' اس لیے کبھی کاشف کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔''

''آپ کاشف کے کسی اور رشتے دار کو جانتے ہیں؟''

اس نے نفی میں جواب دیا' میں نے پوچھا۔ ''کاشف کا آپ کے گھر کا آنا جانا کس طرح شروع ہوا تھا؟''

''وہ میرے بیٹے عارف کا دوست تھا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ کاشف محمود نے کئی مرتبہ مقتول ساجد حسن کو دھمکی دی تھی کہ وہ شاہدہ سے شادی سے باز آ جائے۔ کیا وہ شاہدہ میں دلچسپی لے رہا تھا؟''

''مجھے ایسی فضول باتوں کا بالکل علم نہیں ہے۔''

جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''بیگ صاحب! ان دھمکیوں کے سلسلے میں آپ کوئی ثبوت

بھی پیش کر سکتے ہیں؟''

''بالکل جناب!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''لیکن سردست اس کا ذکر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جب صفائی کے گواہوں کی باری آئے گی تو میں ثبوت پیش کردوں گا۔''

یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ مقتول کی والدہ قمرالنساء نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اس بات کی گواہی دے سکتی ہے کہ کاشف محمود نے ان کے گھر آ کر یہ شادی نہ کرنے پر زور دیا تھا اور الٹی سیدھی دھمکیاں بھی دی تھیں۔

جج بار بار دیوارگیر کلاک کو دیکھ رہا تھا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ گواہ پر مزید جرح کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میری جرح مکمل ہو چکی ہے جناب عالی!''

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

❁ ❁ ❁

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں شاہدہ کریمی کھڑی تھی۔

اس نے خوبصورت پرنٹ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی...... حسین اور پُراعتماد۔

شاہدہ کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ساجد حسن کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اسے بس یہ معلوم تھا کہ آٹھ اگست کی رات اس کا منگیتر ان کے گھر آیا تھا' اس وقت ملزم بھی گھر میں موجود تھا۔ دونوں میں کچھ دیر تک تناؤ کی سی کیفیت رہی پھر تلخ کلامی شروع ہوگئی۔ نتیجے میں وہ دونوں یکے بعد دیگرے وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا' وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

وکیل استغاثہ نے سرسری سے سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کردی۔ میں اپنی باری پر جج کی اجازت سے جرح کے لیے شاہدہ کے کٹہرے کے قریب آ گیا۔ پھر سلسلہ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

''شاہدہ کریمی! مجھے تمہارے منگیتر مقتول ساجد حسن کی موت کا بہت صدمہ ہے۔''

اس نے کوئی جواب یا تبصرہ نہیں کیا بلکہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں اس کی ہوشیاری اور چالاکی کے بہت سے کارنامے سن اور دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''شاہدہ بی بی! کیا یہ بات درست ہے کہ مقتول ساجد حسن تمہارا اصلی منگیتر ہی تھا؟''

''اصلی اور نقلی منگیتر میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا۔ ''جس کے ساتھ باقاعدہ منگنی کی رسم ادا ہو وہ اصلی منگیتر ہوتا ہے۔ نقلی کے بارے میں تم زیادہ بہتر جانتی ہو!''

وہ بولی۔ ''ساجد میرا باقاعدہ منگیتر نہیں تھا۔ ہاں' یہ ہے کہ اس کے ساتھ میری شادی کی بات چل رہی تھی۔''

اس نے یہ عجیب رنگ دکھایا تھا۔ اس کے تیوروں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اچھی خاصی تیاری کے بعد آج عدالت میں آئی تھی۔ میں نے سوال کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ کچھ لوگوں کو مقتول سے تمہاری شادی پر اعتراض تھا؟''

''شادی بیاہ کے معاملات میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔''

''کیا ان معترض افراد میں تمہارا نام نہاد کزن کاشف محمود بھی شامل تھا؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ سرے سے مکر گئی البتہ ہمارے مل کے منیجر اور آپ کے موکل فرقان صدیقی کو اس شادی پر خاصی تکلیف تھی جس کا وہ گاہے بہ گاہے اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔''

''میرے موکل کا موقف ہے کہ تم نے اس سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟''

''آپ کا موکل جھوٹ بولتا ہے۔''

یہ بھی جھوٹ ہے کہ میرا موکل کئی مرتبہ تمہیں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر چھوڑنے آیا تھا؟''

''یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اکثر فرموں کے مالک اور فیکٹریوں کے گاڑیوں والے افسران ورکرز کو ڈراپ کر ہی دیا کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری بات میں وزن ہے لیکن کبھی کسی ڈراپ کرنے والے نے کسی خاتون ورکر کو اپنا ریوالور نہیں دیا ہوگا۔''

''کون سا ریوالور؟''

''اعشاریہ تین دو کا ریوالور۔''

''پتا نہیں' آپ کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہیں۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تاہم ریوالور کے ذکر پر میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک پرچھائیں لہراتے ہوئے دیکھی تھی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''وقوعہ سے چند روز قبل آپ کو گھر آتے ہوئے ڈرلگ رہا تھا اور آپ ملزم کی گاڑی میں گھر تک آنا نہیں چاہتی تھیں چنانچہ ملزم نے تمہاری حفاظت کی خاطر تمہیں اپنا ریوالور دے دیا تھا جو ابھی تک تم نے واپس نہیں کیا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اسی ریوالور سے مقتول ساجد حسن کی کھوپڑی میں سوراخ کیا گیا ہے؟''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''میں ایسے کسی ریوالور سے واقف نہیں ہوں۔''

وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ''یور آنر! وکیل صفائی خواہ مخواہ معزز لوگوں کو ہراساں کر رہے ہیں۔''

جج نے شاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو بی بی؟''

"میں نے آج تک کسی ریوالور کی شکل نہیں دیکھی۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔ "وکیل صفائی ایک فرضی کہانی کا سہارا لے کر مجھے نروس کر رہے ہیں۔ ان کا موکل جھوٹا اور بہتان طراز ہے۔ میں نے نہ کبھی اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور نہ ہی اس نے میری حفاظت کی خاطر کبھی مجھے کوئی ریوالور یا پستول دیا تھا۔"

میں نے مختصراً جج کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ جواباً اس نے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ نے اپنے کاغذات میں اس ریوالور کا اس انداز میں تذکرہ نہیں کیا؟"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں یہ ذکر نہیں کر سکا۔"

پھر میں نے جج کی اجازت سے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شاہدہ بی بی! مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارا نام نہاد کزن اکثر تمہارے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ کیا تم بھی کبھی اس کے گھر گئی ہو؟"

"نہیں، مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔"

"تمہارے والد اپنی گواہی میں اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ کاشف محمود سے آپ لوگوں کی کوئی باقاعدہ رشتے داری نہیں ہے بلکہ وہ تمہارے چھوٹے بھائی عارف کا دوست ہے۔" میں شاہدہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس بات کی وضاحت کرو گی کہ کاشف کا کس تعلق کس ناتے سے تمہارے گھر آنا جانا ہے؟"

"اگر باقاعدہ رشتے داری نہ ہو تو کیا کوئی شخص گھر میں نہیں آ سکتا؟"

جج نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "بی بی! آپ سوال نہ کریں۔ بیگ صاحب آپ سے پوچھ رہے ہیں، بس اس کا جواب دیں۔"

وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے والد آپ کے سوال کا جواب دے چکے ہیں۔ کاشف میرے چھوٹے بھائی کا دوست ہے۔ وہ اسی ناتے سے ہمارے گھر آتا ہے۔"

"کیا تم اس بات سے انکار کرو گی کہ کاشف تمہارے چھوٹے بھائی عارف اور تمہارے والد کی غیر موجودگی میں بھی گھنٹوں تمہارے گھر میں گزارتا ہے؟"

"تو کیا دروازے پر آئے ہوئے شخص کو واپس لوٹا دیا جاتا ہے؟" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "اہم چیز انسان کے اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کاشف میرے والد اور بھائی کی عدم موجودگی میں گھر آ جاتا ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ...... بلکہ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایک غیر شادی شدہ غیر محرم روک ٹوک آپ کے گھر کس ناتے سے آتا ہے؟"

"بس، وہ ہم سے ملنے آتا ہے۔" وہ برہمی سے بولی۔ "کیوں آتا ہے کا کیا سوال ہے؟"

جج میرا نقطہ نظر سمجھ رہا تھا۔ جب شاہدہ نے میرے سوال کا کوئی واضح جواب نہ دیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ اس سوال کو نظر انداز کر کے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔"

میں نے کہا۔ "شاہدہ بی بی! کیا یہ صحیح ہے کہ کاشف اکثر تمہیں ہوٹلوں میں کھانا کھلانے بھی لے جاتا ہے؟"

وہ اچانک غصے سے پھٹ پڑی۔ "آپ نے انتہائی گھٹیا سوال کیا ہے وکیل صاحب! آپ میری کردار کشی کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو کسی دوست نے کبھی کسی ہوٹل میں کھانا نہیں کھلایا؟"

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔" میں نے اس غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کاشف تمہارا دوست ہے؟" "مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر تمہیں قیمتی تحفے بھی دیتا رہتا ہے؟"

"یہ سراسر جھوٹ ہے، مجھ پر الزام ہے۔"

"شاہدہ بی بی! میں نے سنا ہے کہ تم نے کاشف محمود سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا ہے؟"

وہ روہانسی ہو گئی۔ "بالکل بکواس، جھوٹ...... آپ کو ایک لڑکی سے اس قسم کے سوالات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کو ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔"

میں نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست! عام حالات میں مجھے واقعی ایسے سوالات نہیں کرنے چاہئیں لیکن استغاثہ کے مطابق مقتول ساجد حسن رقابت کا نشانہ بنا ہے۔ اس کے رقیب میرے موکل نے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہی موقف ہے نا استغاثے کا؟" میں نے ایک لمحے کو رک کر سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں جج کی جانب روئے سخن کو موڑتے ہوئے بولا۔

"جناب عالی! اگر میرے موکل اور اس کیس کے ملزم کو مقتول کا رقیب مان بھی لیا جائے تو حالات وواقعات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مقتول کے ایک سے زیادہ رقیب موجود تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قاتل کوئی اور شخص بھی ہو سکتا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "مقتول کو ملزم کے ریوالور سے ملزم کی گاڑی میں قتل کیا گیا تھا۔ قاتل کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "میرے موکل کی گاڑی چوری ہو گئی تھی اور ریوالور کا احوال بھی ابھی بیان کیا جا چکا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "ابھی تک نہ تو یہ ثابت ہوا ہے کہ ملزم کی گاڑی چوری ہوئی تھی اور نہ ہی معزز گواہ شاہدہ کریمی نے ریوالور کے بارے میں آپ کے موقف کی تصدیق کی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے فاضل دوست! آپ خاطر جمع رکھیں، وقت آنے پر ہر بات ثابت ہو

جائے گی۔"

جج نے کہا۔ "آپ لوگ آپس میں الجھنے کے بجائے مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔"

پھر وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! آپ گواہ سے مزید کوئی سوال کریں گے...؟"

"ضرور جناب!" میں نے گردن کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا پھر کٹہرے میں کھڑی شاہدہ کریمی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"شاہدہ بی بی! وقوعہ کی رات مقتول اور ملزم کے علاوہ کاشف محمود بھی آپ کے گھر میں موجود تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گی کہ وہ کتنے بجے آپ کے گھر سے رخصت ہوا تھا؟"

"میرا خیال ہے' وہ ساجد اور فرقان کے جانے کے کچھ دیر بعد چلا گیا تھا؟"

"تقریباً کتنی دیر بعد؟"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ گیارہ بجے تک گیا ہوگا۔"

"کیا اس کے پاس اپنی سواری ہے؟"

"نہیں' وہ اکثر رکشا اور ٹیکسی میں سفر کرتا ہے۔"

"اس روز بھی یقیناً وہ رکشا یا ٹیکسی پر ہی گیا ہوگا۔"

"یہ بات تو آپ اسی سے پوچھیے گا۔" وہ بیزاری سے بولی۔

میں نے اس تذکرے کو یہیں چھوڑا اور سوالات کا زاویہ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "شاہدہ بی بی! تم فائن ٹیکسٹائل مل میں کتنے عرصے سے کام کر رہی ہو؟"

"تقریباً چھ ماہ سے۔"

"اس سے پہلے تم کہاں کام کرتی تھیں؟"

"اس سے پہلے میں کافی عرصہ فارغ رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک سال کی فراغت کے بعد مجھے یہ نوکری ملی تھی۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ مذکورہ نوکری تمہیں کاشف محمود کی سفارش سے ملی تھی؟"

"ہاں' یہ سچ ہے۔"

"فائن ٹیکسٹائل میں تمہیں کتنی تنخواہ ملتی تھی؟"

"پندرہ سو روپے۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر شاہدہ کے لیے ناپسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔ "شاہدہ بی بی! مجھے پتا چلا ہے کہ حال ہی میں تم نے اپنے گھر کے لیے چند نئی چیزیں خریدی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جن لوگوں کا گھر ہوتا ہے وہ اس کی آرائش و سجاوٹ کے لیے ضروری اشیاء خریدتے ہی رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم نے پچھلے دنوں اکائی کا ڈیک' سونی کلر ٹی وی' بیس انچ۔ نیشنل کا وی سی آر' ایک شاندار قیمتی قالین اور نیا آرام دہ صوفہ سیٹ خریدا ہے؟"

"آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔"

"کیا تم معزز عدالت کی بتاؤ گی کہ یہ سامان تم نے نقد خریدا ہے کہ قسطوں پر؟"

وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ "بالکل نقد۔ میں قسطوں کے جھنجھٹ کو پسند نہیں کرتی۔"

میں نے کہا۔ "یہ اتفاق ہے کہ میں یہ تمام سامان اپنی آنکھوں سے تمہارے ڈرائنگ روم میں رکھا دیکھ چکا ہوں اور میرا اندازہ ہے کہ اس کی مجموعی مالیت لگ بھگ ساٹھ ہزار روپے ہوگی' اس قیمتی سامان کی خریداری کے لیے تمہارے پاس رقم کہاں سے آئی تھی؟"

"آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہم گھر کے تین افراد ہیں اور تینوں ملازمت کرتے ہیں۔"

وہ یاددہانی کے انداز میں بولی۔ "ہم نے اپنی تنخواہ سے رقم بچا کر یہ چیزیں خریدی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ تینوں کی تنخواہ سے ماہانہ جو بچت ہو سکتی ہے اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہے۔ چھ ماہ میں زیادہ سے زیادہ آپ چھ ہزار کی بچت کر لیں گے...... ساٹھ ہزار تو اس سے دس گنا زیادہ ہوتے ہیں۔"

"میں ٹیوشن بھی پڑھاتی ہوں۔"

"پھر بھی ایک مشت اتنی رقم اکٹھی نہیں ہو سکتی۔"

وہ برہمی سے بولی۔ "آپ کیا انکم ٹیکس والوں کی طرح کرید کرید کر سوالات کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "آپ اگر جواب نہ دینا چاہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے اگر تم جواب دے دیتیں تو تمہاری پوزیشن واضح ہو سکتی تھی۔"

"میں آپ کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔" وہ رکھائی سے بولی۔

جج بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جب شاہدہ نے کہا کہ وہ میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی تو جج کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ جج میرے سوالات کے مقصد کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔

اس روز عدالت میں ہمارا کیس خاصی تاخیر سے لگا تھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! عدالت کا وقت ختم ہونے میں دس منٹ باقی ہیں' آپ گواہ سے اور کچھ پوچھنا چاہیں گے؟"

میں تمام ضروری سوالات کر چکا تھا اس لیے کہا۔ "دیٹس آل یور آنر۔ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ کاشف محمود کو شہادت کے لیے پیش ہونا تھا۔

❀ ❀ ❀

ٹھیک دس روز بعد کاشف محمود گواہوں کے کٹہرے میں موجود تھا۔ اس نے سیاہ پتلون پر چیک دار شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ ایک اسمارٹ اور قد آور شخص تھا اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔

حلف اٹھانے کے بعد اس نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے وہی بیان دیا جو اس سے پہلے پولیس والوں کو دے چکا تھا۔ اس کا بیان نہایت ہی مختصر تھا جس کے مطابق وقوعہ کے روز وہ شاہدہ کے گھر پر موجود تھا اور سب سے آخر میں وہاں سے گیا تھا۔

جب وہ وکیل استغاثہ کی سرسری سی جرح کا سامنا کر چکا تو میں سوالات کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''کاشف محمود! آپ کتنے عرصے سے فائن ٹیکسٹائل مل میں ملازمت کر رہے ہیں؟''

''تقریباً چھ سال سے۔''

''ملزم مذکورہ مل سے کتنے عرصے سے وابستہ ہے؟''

''مجھے صحیح عرصے کا تو اندازہ نہیں ہے۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہ کافی عرصے سے اس مل سے وابستہ ہے۔''

''کافی عرصہ...... مثلاً دس سال؟''

''اس سے بھی زیادہ۔''

میں نے پوچھا۔ ''کاشف صاحب! آپ اس وقت مذکورہ مل میں سپروائزر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ چھ سال قبل آپ کس حیثیت سے اس مل میں ملازم ہوئے تھے؟''

''شروع میں، میں انڈر ٹریننگ تھا اور میرے سپرد اسٹور کا کام کیا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ترقی کرتے کرتے گزشتہ چھ سال میں، میں سپروائزر بن گیا ہوں۔''

''آپ کی تعلیم کتنی ہے؟''

''میٹرک!'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ سپروائزر ہونے کے باوجود تمہیں میرے موکل فرقان صدیقی کی زیر نگرانی کام کرنا پڑتا تھا؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ متحمل لہجے میں بولا۔ ''مل کا ہر شخص منیجر کی زیر نگرانی ہی کام کرتا ہے۔''

''ایک باس کی حیثیت سے ملزم کا برتاؤ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟''

اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ ''مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔''

''اس کا مطلب ہوا، ملزم کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا تھا؟''

''یہی کہا جا سکتا ہے؟''

وہ بڑی سمجھداری سے سوچ سمجھ کر جواب دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ شاہدہ کریمی کو آپ کی سفارش پر فائن ٹیکسٹائل مل میں ملازمت ملی تھی؟''

''ہاں، یہ سچ ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ وہ اس کی اہل بھی تھی۔ بلاشبہ شاہدہ بہت ہارڈ ورکر اور ذہین لڑکی ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا اور پھر پوچھا۔ ''سننے میں آیا ہے کہ شاہدہ کریمی آپ کی بہت اچھی دوست بھی ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' اس نے تردیدی لہجہ اختیار کرنے کے بجائے بڑے ٹھوس انداز میں اس دوستی کی تصدیق کی۔ ''شاہدہ کے اندر ایک اچھے دوست کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔''

''کیا یہ درست ہے کہ آپ اکثر شاہدہ کو ہوٹلوں میں کھانا کھلانے بھی لے جاتے ہیں؟''

''ہاں، یہ درست ہے۔'' اس کے لہجے سے بلا کا اعتماد جھلکتا تھا۔ ایسے گواہوں کو توڑنے کے لیے بعض اوقات بہت مشکل زاویے سے سوال کرنا پڑتا ہے۔ میں نے پوچھا۔

''کیا یہ بھی سچ ہے کہ آپ اکثر و بیشتر شاہدہ کو تحفے تحائف بھی دیا کرتے ہیں؟''

''سچے دوست تو ایک دوسرے کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تحفوں وغیرہ کی کیا اہمیت ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ آپ شاہدہ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''

وہ مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہاں، میں اس بات سے واقعی انکار کروں گا۔''

''پھر آپ شاہدہ کی شادی میں رکاوٹیں کیوں ڈالتے رہے؟''

''میں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''اس حوالے سے آپ کی معلومات ناقص ہیں۔ شاہدہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ میں اس کی شادی میں رکاوٹ کیوں بنوں گا۔''

''پھر ان دھمکیوں کی کیا حیثیت تھی جو منگنی کے بعد آپ مقتول ساجد حسن اور اس کی والدہ کو دیتے رہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک مرتبہ تو آپ بہ نفس نفیس ان کے گھر واقع گلشن اقبال بھی پہنچ گئے تھے۔''

''آپ صریحاً غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔'' وہ متانت سے بولا۔ ''یا پھر آپ کی معلومات انتہائی ناقص ہیں۔ میں نے کبھی اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔''

''مقتول تو گواہی دینے کے لیے زندہ نہیں ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

کہا۔ ''لیکن اس کی والدہ قمر النساء میری بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔''

''اگر وہ کسی ایسی بات کی تصدیق کرے گی تو یقیناً دروغ گوئی سے کام لے گی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت بھی پیش کر سکتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وقت آنے پر ٹھوس ثبوت بھی پیش کر دیا جائے گا۔ فی الحال آپ یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز آپ شاہدہ کے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''مجھے بالکل ٹھیک وقت یاد نہیں ہے۔'' وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ویسے مقتول اور ملزم کے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ میری موجودگی میں ہی ہوا تھا۔''

''ان کے درمیان کس بات پر تلخی ہوئی تھی؟''

''ظاہری بات ہے، وجہ نزع شاہدہ ہی تھا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''شاہدہ مقتول سے شادی کرنے جا رہی تھی اور ملزم کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں تھی۔''

''آپ کے خیال میں ملزم کیا چاہتا تھا؟''

''وہ شاہدہ سے شادی کا متمنی تھا۔''

''اور شاہدہ کیا چاہتی تھی؟''

''ظاہر ہے، اس کی ساجد سے منگنی ہو چکی تھی۔ وہ اسی سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن ملزم اس بات پر بضد تھا کہ شاہدہ وہ منگنی توڑ دے۔ پہلے ملزم اور شاہدہ کے درمیان نوک جھوک ہوتی رہی پھر مقتول کی آمد کے بعد براہِ راست مقتول اور ملزم کے بیچ ترش جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔''

میں نے کہا۔ ''سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ شاہدہ نے میرے موکل سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی۔'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ورنہ شاہدہ مجھے ضرور بتاتی۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔''

وہ بار بار شاہدہ اور اپنی دوستی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''کاشف صاحب! آپ یہ بات تو جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارا معاشرہ لڑکی اور لڑکے کی دوستی کو اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ خالصتاً مغربی تصور ہے۔''

''اس کے باوجود یہ 'اچھا نہ سمجھا جانے والا' فعل بڑے دھڑلے سے ہمارے معاشرے میں پنپ رہا ہے۔ میں پوش علاقوں میں ایسی بیسیوں کیا سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں...... اور رہی مغربی تصور کی بات تو ہمارے یہاں مشرقی رہ ہی کتنا گیا ہے وکیل صاحب! معاف کیجیے گا آپ بھی میری طرح اس وقت مغربی لباس میں نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں روانی سے اور منہ بگاڑ کر انگریزی بولنے والوں کو معتبر اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنے معاشرے میں رائج مغربی رسوم و رواج کی درجنوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔''

وہ ایک اچھا مقرر تھا۔ اور ہر بات ناپ تول کر اور سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ پوری جرح کے دوران میں اس نے نہ تو کھل کر شاہدہ کی یا کسی بھی اور کی حمایت کی تھی اور نہ ہی کوئی ایسا تاثر دیا تھا کہ وہ ملزم ہی کو صدفی صد قاتل سمجھتا ہے۔ اس نے بڑی ڈپلومیٹک پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں تیار شدہ پلان کے مطابق اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

''کاشف صاحب! استغاثہ کے دیگر گواہان کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ آپ وقوعہ کی رات شاہدہ کے گھر سے رخصت ہونے والے آخری شخص تھے۔ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ وہاں سے کتنے بجے نکلتے تھے؟''

''اس وقت تقریباً رات کے گیارہ بج رہے تھے۔''

''آپ وہاں سے سیدھے اپنے گھر گئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''آپ اپنے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''شاید بارہ بجے۔''

''سنا ہے، آپ بس یا ویگن میں سفر نہیں کرتے۔'' میں نے کہا۔ ''وقوعہ کے روز آپ نے اپنے گھر آنے کے لیے کون سی سواری اختیار کی تھی؟''

''میں اس روز رکشا میں واپس آیا تھا۔''

''یو پی موڑ سے رکشا ایک گھنٹے میں تو لیاقت آباد نہیں پہنچتا۔'' میں نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگنا چاہیے۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میرا رکشا سخی حسن کے پاس آ کر خراب ہو گیا تھا۔ دس منٹ تک میں اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن رکشا ڈرائیور جب کسی بھی طور اپنی مکینکی میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے مجھ سے معذرت کر لی تھی۔ چنانچہ دوسرا رکشا کرنے میں مجھے مزید پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے آدھے گھنٹے کا سفر ایک گھنٹے میں کیا تھا۔''

اس کا طویل جواب ختم ہوا تو میں نے اچانک حملہ کیا۔ ''کاشف صاحب! میرے موکل کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کبھی کبھار اس کی گاڑی بھی استعمال کر لیا کرتے تھے؟''

''میں نے کبھی اپنے ذاتی کام کے لیے ان کی گاڑی استعمال نہیں کی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''انہوں نے جب بھی مجھے گاڑی دی، مل کے کسی کام کے لیے ہی دی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کاشف صاحب! کیا آپ سوچ کر بتا سکتے ہیں کہ میرے موکل نے آخری بار آپ کو گاڑی کب دی تھی؟''

کاشف نے کن انکھیوں سے فرقان صدیقی کو دیکھا پھر پرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے

جولائی کے شروع میں، میں نے آخری بار ملزم کی ٹویوٹا استعمال کی تھی۔''

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے اپنے موکل سے ایک انتہائی اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وکیل استغاثہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا مگر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ جج نے مجھے ملزم سے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

''فرقان صاحب!'' میں نے اپنے موکل کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ نے آخری بار اپنی گاڑی کی مکمل سروس کب کروائی تھی؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''تین اگست کو۔''

میں نے جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! گواہ کاشف محمود کے بیان کے مطابق اس نے ملزم کی گاڑی جولائی کے شروع میں آخری مرتبہ استعمال کی تھی۔ ملزم کا کہنا یہ ہے کہ اس نے تین اگست کو گاڑی کو مکمل سروس کروائی تھی۔ اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ گواہ کی انگلیوں کے نشانات مکمل سروس کے بعد گاڑی پر سے کلی طور پر صاف ہو گئے ہوں گے۔ ان حالات کی روشنی میں معزز عدالت سے میری پرزور استدعا ہے کہ گاڑی پر سے فنگر پرنٹس اتارنے کا حکم جاری کیا جائے۔''

میں نے بات ختم کرتے ہی کٹہرے میں کھڑے گواہ کاشف محمود کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی آمیز الجھن کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے نظر آنے والا اعتماد اب دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی عجیب بات کر رہے ہیں۔ مکمل سروس کے بعد سے اب تک اس گاڑی کو کئی افراد ہینڈل کر چکے ہوں گے۔ اس پر تو متعدد افراد کی انگلیوں کے نشانات موجود ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''انہی متعدد نشانات میں ایک آدھ نشان اس چور کی انگلیوں کا بھی ہوگا جس نے یہ گاڑی چرا کر قتل کی واردات کی تھی۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''وکیل صفائی خواہ مخواہ اس کیس کو غلط رخ پر ڈال رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، آپ کے خیال کے برعکس میں کیس کو صراط مستقیم پر ڈال رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے، میرا موکل بے گناہ ہے۔ آٹھ اگست کو وہ واردات اسی کار چور نے کی تھی جس کی مجھے تلاش ہے۔''

وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست اپنے ملک کی پولیس کو اسکاٹ لینڈ یارڈ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے تو ان کی یہ بات ہی بے معنی معلوم ہو رہی

ہے۔ اگر کچھ مختلف قسم کے فنگر پرنٹس حاصل کر بھی لیے گئے تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ ان میں چور کے پرنٹس کون سے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہمیں سب سے زیادہ نقصان ہمارے احساس کمتری نے پہنچایا ہے۔ اگر ہمارے پولیس والے پوری دیانت داری اور محنت سے کسی کیس کو حل کرنے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیں تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والے ہمارے موزوں میں دبکے ہوئے نظر آئیں گے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! آپ پرنٹس اٹھانے کے احکامات صادر کریں۔ مبینہ چور کے فنگر پرنٹس فراہم کرنا میرا کام ہے۔ میں یہ درخواست کسی شک کی بنیاد پر ہی کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ فنگر پرنٹس کے تجزیئے کے بعد یہ کیس صحیح رخ پر آ جائے گا۔''

جج نے فوری طور پر فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو انکوائری افسر نے مجھے گھیر لیا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے یہ کیا نیا چکر چلا دیا ہے؟''

میں اسے اپنے ساتھ ایک تنہا گوشے میں لے گیا اور رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو ایک ٹپ دینا چاہتا ہوں۔''

اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''ٹپ دینا چاہتے ہیں کہ راہ سے بھٹکانے کا ارادہ ہے؟''

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں تو اصل مجرم گرفتار ہو سکتا ہے۔''

''ہم نے اصل مجرم کو ہی گرفتار کر رکھا ہے جناب!'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔ ''آپ ہمیں چکر نہیں دے سکتے ہیں۔''

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ کو قائل کرتا پھروں۔ ہاں، اگر آپ ایک کام کر سکتے ہیں تو کر ڈالیں۔ انشاء اللہ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔''

''کون سا کام؟'' انکوائری افسر نے بھی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ملزم کی ٹویوٹا آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کی اس گاڑی پر ڈیوٹی لگا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ قاتل مذکورہ گاڑی پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کی کوشش کرے گا۔''

انکوائری افسر نے تمسخرانہ نظر سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی ذہنی سطح پر افسوس

کہا۔ ''لیکن اس کی والدہ قمر النساء میری بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔''

''اگر وہ کسی ایسی بات کی تصدیق کرے گی تو یقیناً دروغ گوئی سے کام لے گی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت بھی پیش کر سکتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وقت آنے پر ٹھوس ثبوت بھی پیش کر دیا جائے گا۔ فی الحال آپ یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز آپ شاہدہ کے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''مجھے بالکل ٹھیک وقت یاد نہیں ہے۔'' وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ویسے مقتول اور ملزم کے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ میری موجودگی میں ہی ہوا تھا۔''

''ان کے درمیان کس بات پر تلخی ہوئی تھی؟''

''ظاہری سی بات ہے' وجہ نزع شاہدہ ہی تھی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''شاہدہ مقتول سے شادی کرنے جا رہی تھی اور ملزم کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں تھی۔''

''آپ کے خیال میں ملزم کیا چاہتا تھا؟''

''وہ شاہدہ سے شادی کا متمنی تھا۔''

''اور شاہدہ کیا چاہتی تھی؟''

''ظاہر ہے' اس کی ساجد سے منگنی ہو چکی تھی۔ وہ اسی سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن ملزم اس بات پر بضد تھا کہ شاہدہ وہ منگنی توڑ دے۔ پہلے ملزم اور شاہدہ کے درمیان نوک جھوک ہوتی رہی پھر مقتول کی آمد کے بعد براہ راست مقتول اور ملزم کے بیچ ترش جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔''

میں نے کہا۔ ''سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ شاہدہ نے میرے موکل سے بھی شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟''

''میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی۔'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ورنہ شاہدہ مجھے ضرور بتاتی۔ وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔''

وہ بار بار شاہدہ اور اپنی دوستی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''کاشف صاحب! آپ یہ بات تو جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارا معاشرہ لڑکی اور لڑکے کی دوستی کو اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ خالصتاً مغربی تصور ہے۔''

''اس کے باوجود یہ 'اچھا نہ سمجھا جانے والا' فعل بڑے دھڑلے سے ہمارے معاشرے میں پنپ رہا ہے۔ میں پوش علاقوں میں ایسی بیسیوں کیا سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں...... اور رہی مغربی تصور کی بات تو ہمارے یہاں مشرقی رہ ہی کتنا گیا ہے وکیل صاحب! معاف کیجئے گا' آپ بھی میری طرح اس وقت مغربی لباس میں نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں روانی سے اور منہ بگاڑ کر انگریزی بولنے والوں کو معتبر اور معزز سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنے معاشرے میں رائج مغربی رسوم و رواج کی درجنوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔''

وہ ایک اچھا مقرر تھا۔ اور ہر بات ناپ تول کر اور سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ پوری جرح کے دوران میں اس نے نہ تو کھل کر شاہدہ کی یا کسی بھی اور کی حمایت کی تھی اور نہ ہی کوئی ایسا تاثر دیا تھا کہ وہ ملزم ہی کو صدفی صد قاتل سمجھتا ہے۔ اس نے بڑی ڈپلومیٹک پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں تیار شدہ پلان کے مطابق اسے گھنے کی کوشش کی۔

''کاشف صاحب! استغاثہ کے دیگر گواہان کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ آپ وقوعہ کی رات شاہدہ کے گھر سے رخصت ہونے والے آخری شخص تھے۔ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ وہاں سے کتنے بجے نکلتے تھے؟''

''اس وقت تقریباً رات کے گیارہ بج رہے تھے۔''

''آپ وہاں سے سیدھے اپنے گھر گئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''آپ اپنے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''شاید بارہ بجے۔''

''سنا ہے' آپ بس یا ویگن میں سفر نہیں کرتے۔'' میں نے کہا۔ ''وقوعہ کے روز آپ نے اپنے گھر آنے کے لیے کون سی سواری اختیار کی تھی؟''

''میں اس روز رکشا میں واپس آیا تھا۔''

''یو پی موڑ سے رکشا ایک گھنٹے میں تو لیاقت آباد نہیں پہنچتا۔'' میں نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا لگنا چاہیے۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میرا رکشا سخی حسن کے پاس آ کر خراب ہو گیا تھا۔ دس منٹ تک میں اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتا رہا لیکن رکشا ڈرائیور جب کسی بھی طور اپنی مکینکی میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے مجھ سے معذرت کر لی تھی۔ چنانچہ دوسرا رکشا کرنے میں مجھے مزید پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے آدھے گھنٹے کا سفر ایک گھنٹے میں کیا تھا۔''

اس کا طویل جواب ختم ہوا تو میں نے اچانک حملہ کیا۔ ''کاشف صاحب! میرے موکل کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کبھی کبھار اس کی گاڑی بھی استعمال کر لیا کرتے تھے؟''

''میں نے کبھی اپنے ذاتی کام کے لیے ان کی گاڑی استعمال نہیں کی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''انہوں نے جب بھی مجھے گاڑی دی' مل کے کسی کام کے لیے ہی دی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کاشف صاحب! کیا آپ سوچ کر بتا سکتے ہیں کہ میرے موکل نے آخری بار آپ کو گاڑی کب دی تھی؟''

کاشف نے کن انکھیوں سے فرقان صدیقی کو دیکھا پھر پرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے

جولائی کے شروع میں، میں نے آخری بار ملزم کی ٹویوٹا استعمال کی تھی۔"

میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے اپنے موکل سے ایک انتہائی اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وکیل استغاثہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟"

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا مگر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ جج نے مجھے ملزم سے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

"فرقان صاحب!" میں نے اپنے موکل کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے آخری بار اپنی گاڑی کی مکمل سروس کب کروائی تھی؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "تین اگست کو۔"

میں نے جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! گواہ کاشف محمود کے بیان کے مطابق اس نے ملزم کی گاڑی جولائی کے شروع میں آخری مرتبہ استعمال کی تھی۔ ملزم کا کہنا یہ ہے کہ اس نے تین اگست کو گاڑی کو مکمل سروس کروائی تھی۔ اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ گواہ کی انگلیوں کے نشانات مکمل سروس کے بعد گاڑی پر سے کلی طور پر صاف ہو گئے ہوں گے۔ ان حالات کی روشنی میں معزز عدالت سے میری پرزور استدعا ہے کہ گاڑی پر سے فنگر پرنٹس اتارنے کا حکم جاری کیا جائے۔"

میں نے بات ختم کرتے ہی کٹہرے میں کھڑے گواہ کاشف محمود کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی آمیز الجھن کی لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے نظر آنے والا اعتماد اب دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

وکیل استغاثہ فوراً بول اٹھا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی عجیب بات کر رہے ہیں۔ مکمل سروس کے بعد سے اب تک اس گاڑی کو کئی افراد ہینڈل کر چکے ہوں گے۔ اس پر تو متعدد افراد کی انگلیوں کے نشانات موجود ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "انہی متعدد نشانات میں ایک آدھ نشان اس چور کی انگلیوں کا بھی ہو گا جس نے یہ گاڑی چرا کر قتل کی واردات کی تھی۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے کہا۔ "وکیل صفائی خواہ مخواہ اس کیس کو غلط رخ پر ڈال رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے، آپ کے خیال کے برعکس میں کیس کو صراط مستقیم پر ڈال رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے، میرا موکل بے گناہ ہے۔ آٹھ اگست کو وہ واردات اسی کار چور نے کی تھی جس کی مجھے تلاش ہے۔"

وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "میرے فاضل دوست اپنے ملک کی پولیس کو اسکاٹ لینڈ یارڈ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے تو ان کی یہ بات ہی بے معنی معلوم ہو رہی

ہے۔ اگر کچھ مختلف قسم کے فنگر پرنٹس حاصل کر بھی لیے گئے تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ ان میں چور کے پرنٹس کون سے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ہمیں سب سے زیادہ نقصان ہمارے احساس کمتری نے پہنچایا ہے۔ اگر ہمارے پولیس والے پوری دیانت داری اور محنت سے کسی کیس کو حل کرنے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائیں تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والے ہمارے موزوں میں دبکے ہوئے نظر آئیں گے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! آپ پرنٹس اٹھانے کے احکامات صادر کریں۔ مبینہ چور کے فنگر پرنٹس فراہم کرنا میرا کام ہے۔ میں یہ درخواست کسی شک کی بنیاد پر ہی کر رہا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ فنگر پرنٹس کے تجزیئے کے بعد یہ کیس صحیح رخ پر آ جائے گا۔"

جج نے فوری طور پر فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو انکوائری افسر نے مجھے گھیر لیا۔ "بیگ صاحب! آپ نے یہ کیا نیا چکر چلا دیا ہے؟"

میں اسے اپنے ساتھ ایک تنہا گوشے میں لے گیا اور رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو ایک ٹپ دینا چاہتا ہوں۔"

اس نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر میری جانب دیکھا اور بولا۔ "ٹپ دینا چاہتے ہیں کہ راہ سے بھٹکانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں تو اصل مجرم گرفتار ہو سکتا ہے۔"

"ہم نے اصل مجرم کو ہی گرفتار کر رکھا ہے جناب!" وہ محتاط لہجے میں بولا۔ "آپ ہمیں چکر نہیں دے سکتے ہیں۔"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اس وقت میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ کو قائل کرتا پھروں۔ ہاں، اگر آپ ایک کام کر سکتے ہیں تو کر ڈالیں۔ انشاء اللہ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔"

"کون سا کام؟" انکوائری افسر نے بھی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ملزم کی ٹویوٹا آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کی اس گاڑی پر ڈیوٹی لگا دی۔ مجھے یقین ہے کہ قاتل مذکورہ گاڑی پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کی کوشش کرے گا۔"

انکوائری افسر نے تمسخرانہ نظر سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی ذہنی سطح پر افسوس

کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ افسوس' ہمارے ملک کی پولیس ذہن استعمال کرنے سے زیادہ ڈنڈے سے کام نکالنے کی عادی ہے!

❀❀❀

جب سے ستارہ نے ٹویوٹا کی اصل چابیاں میرے پاس پہنچائی تھیں۔ میری پوری توجہ اسی بات پر لگی ہوئی تھی کہ کار چور کا پتا لگاؤں۔ اگر کار چور پکڑ میں آجاتا تو میرا موکل بہ آسانی بری ہوسکتا تھا۔ پھر جب فرقان نے مجھے بتایا کہ کاشف کبھی کبھار اس کی گاڑی استعمال کرلیتا تھا تو مجھے کاشف کے بارے میں زیادہ کرید ہوئی۔ کاشف کے رویے اور سرگرمیوں نے بھی مجھے اس کی طرف سے الرٹ کردیا تھا چنانچہ اس کی گواہی پر میں نے وہ فنگر پرنٹس اٹھانے کا شوشہ چھوڑ دیا جس کا خاطر خواہ ردِعمل دیکھنے میں آیا تھا۔ اور کسی نے یہ بات نوٹ کی ہو یا نہ کی ہو لیکن میں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ جب میں جج سے مذکورہ گاڑی پر سے فنگر پرنٹس اٹھانے کا مطالبہ کررہا تھا تو اچانک کاشف کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس طرح تبدیل ہوئے تھے جیسے اس نے سانپ دیکھ لیا ہو۔

اسی شام میری توقع کے عین مطابق کاشف محمود میرے دفتر میں موجود تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے یہ فنگر پرنٹس کا کیا چکر چلا دیا ہے؟''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں' کیا ہوگیا؟''

وہ بولا۔ ''آپ جانتے ہیں' فرقان صاحب میرے باس بھی رہ چکے ہیں اور محسن بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تو پولیس کے دباؤ میں آکر میں نے استغاثہ کے گواہوں میں اپنا نام لکھوا دیا تھا۔''

''تو پھر اس سلسلے میں آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟''

''آپ فرقان صاحب کی مدد کررہے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' وہ رازداری سے بولا۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں مل کر کام کریں؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

''مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کوئی ایسا بیان دے دیتا ہوں جو فرقان صاحب کے حق میں جاتا ہو۔ اس کے بدلے میں آپ وہ فنگر پرنٹس والا سلسلہ ختم کردیں۔''

''فنگر پرنٹس کی وجہ سے تم کسی پریشانی میں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''پریشانی دراصل یہ ہے کہ گاڑی کی سروس کے بعد بھی کئی مرتبہ اس گاڑی پر میرا ہاتھ لگا ہوگا۔ آپ نے عدالت میں فنگر پرنٹس کا نکتہ اس وقت اٹھایا ہے جب مجھ پر جرح کررہے تھے۔ اگر بدقسمتی سے میرے ہاتھ کے نشانات بھی گاڑی پر مل گئے تو پولیس میری جان عذاب کردے گی۔''

''ہوں!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ایسا تو ہوسکتا ہے۔''

وہ بولا۔ ''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قانون میں بہت گنجائش ہوتی ہے۔ وکیل اگر ہوشیار ہو تو اچھے خاصے بے گناہ آدمی کی گردن میں بھی پھانسی کا پھندا فٹ کرسکتا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے کو طول نہ دیں۔''

وہ خود بہ خود میری چال میں آگیا تھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ فرقان کی گاڑی اسی نے چرائی ہوگی۔ میں نے چالاکی سے کہا۔ ''لیکن اس میں میرا کیا فائدہ ہوگا؟''

''فائدہ کیوں نہیں ہوگا؟'' وہ آگے کو جھک آیا۔ ''آپ حکم کریں' کیا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اصل مسئلہ فنگر پرنٹس کا ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ جج فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا حکم دے چکا ہے۔''

وہ بولا۔ ''جج کو فنگر پرنٹس اٹھانے دیں۔ یک طرفہ فنگر پرنٹس سے کچھ ثابت نہیں ہوسکے گا۔ بس آپ اپنی زبان نہ کھولیں۔ اگر آپ خاموش رہیں گے تو معاملہ سیٹ رہے گا۔''

میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ''میری خاموشی سے اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے جس انداز میں جج کو مبینہ چور کے فنگر پرنٹس مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے اس سے جج اور وکیل استغاثہ بہ خوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ اس ضمن میں میرا روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔ اب اگر میں اس معاملے میں خاموش رہا تو جج ازخود بھی آپ کے فنگر پرنٹس لے سکتا ہے۔''

اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ''اس کا بھی ایک حل ہے میرے پاس۔ میں مال خانے کی ڈیوٹی دینے والے سپاہی کی مٹھی گرم کرکے پوری گاڑی ہی صاف کروا دیتا ہوں۔ بس آپ اپنی زبان بند رکھنے کا وعدہ کریں۔ اس کے لیے میں آپ کی خدمت میں آپ کا مطلوبہ نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہوں۔''

میری چال نہایت ہی کامیاب رہی تھی۔ اگر کاشف میرے پاس نہ بھی آتا تو بھی میں اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا تاہم اب اس کے پھنسنے کا میں نے بڑا شافی بندوبست کردیا تھا۔ اس وقت میری ٹیبل کے نیچے ایک ٹیپ ریکارڈر آن تھا جس میں ہمارے درمیان ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہورہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''گاڑی کو صاف کرنے والا کام خاصا خطرناک ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔''

وہ بولا۔ ''ہمارے ملک میں دولت کے بل بوتے پر ہر خطرناک کام نہایت ہی سہل ہوجاتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں' میں پانچ ہزار روپے دے کر مال خانے کے نگران سپاہی کو رام کردوں گا۔ پانچ چھ سو تنخواہ پانے والا سپاہی اتنی رقم میں تو سو گاڑیاں بھی صاف کرنے پر تیار ہوجائے گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد میں نے تسلی تشفی دے کر اسے رخصت کردیا۔

متعلقہ تھانے کا انچارج میرا دیرینہ شناسا تھا۔ میں نے رات کو اسے اپنے گھر پر بلا لیا پھر اسے ریکارڈ شدہ گفتگو سنانے کے بعد ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ تھانہ انچارج نے مجھے یقین دلایا

کہ وہ کاشف کے لیے ایسا چوہے دان تیار کرے گا کہ وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکے گا۔ جاتے ہوئے وہ اس ریکارڈ شدہ کیسٹ کی ایک ڈپلی کیٹ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مجھے اس پر پورا بھروسا تھا۔

دو روز بعد کاشف محمود کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا۔

اسی رات پولیس کی روایتی مہمان نوازی کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے اقبال جرم کرلیا۔ وہ ریکارڈ شدہ ٹیپ کی موجودگی میں کسی بات سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اگلے روز پولیس نے اسے عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کرلیا۔ اب کیس کی نوعیت بالکل تبدیل ہوگئی تھی اس لیے عدالت نے پولیس کو نیا چالان پیش کرنے کا حکم دیا۔

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل فرقان صدیقی کو باعزت بری کردیا۔ ریکارڈ شدہ گفتگو اور میرے فراہم کردہ ٹویوٹا کی اصلی چابیوں کے گچھے نے کاشف کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ کو یہ چابیاں کہاں سے ملی تھیں؟“

جواب میں، میں نے جج کو ستارہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

جج نے اور وکیل استغاثہ نے باری باری ان چابیوں کا معائنہ کیا اور ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی پھر کاشف کا اقراری بیان بھی میرے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ کاشف نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ موقع پا کر اس نے فرقان کی گاڑی کی ڈپلی کیٹ چابیاں تیار کروائی تھیں۔

اس نے پولیس کو جو بیان دیا اس میں اس نے شاہدہ کو بھی قتل کے منصوبے میں ملوث کردیا تھا۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ شاہدہ درحقیقت ساجد حسن سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ صرف اسے بے وقوف بنا کر اس سے لمبی لمبی رقمیں اینٹھ رہی تھی۔ جب ساجد حسن کو اس کے طریقہ واردات کا علم ہوا تو وہ سختی پر اتر آیا، اس نے واضح طور پر مطالبہ کردیا کہ یا تو شاہدہ اس سے شادی کرے یا پھر اس کی رقم واپس کردے۔ اس پر شاہدہ نے ساجد کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور کاشف کو اس طرح اپنا آلہ کار بنایا کہ قتل کے کیس میں فرقان صدیقی پھنس جائے۔

شاہدہ نے اس کے برعکس بیان دیا۔ اس کے خیال میں کاشف محمود، ساجد کو قتل کر کے فرقان کو پھانسی پر لٹکوانا چاہتا تھا تاکہ ازاں بعد وہ شاہدہ سے شادی کر سکے۔ شاہدہ چونکہ وعدہ معاف گواہ بن گئی تھی اس لیے سزا سے بچ گئی۔ سیشن کورٹ نے کاشف کو سزائے موت سنادی!

چلتے چلتے یہ بھی بتاتا چلوں کہ کچھ عرصے بعد میرے موکل نے شاہدہ جیسی خطرناک لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ اب وہ اس کے چار بچوں کی ماں ہے۔

فرقان صدیقی نے شاہدہ سے شادی کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا یا کوئی حماقت کی تھی اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ شاید کاتب تقدیر نے صید اور صیاد کا عمر بھر کا ساتھ لکھ دیا تھا!

❁❁❁

بادِ مخالف

منگل کی شام جو شخص میرے دفتر میں داخل ہوا، اس نے سرمئی رنگ کا بے داغ سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ عمر لگ بھگ بیالیس سال اور صحت قابل رشک تھی۔ اپنی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے وہ آسودہ حال دکھائی دیتا تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔

مصافحے کے بعد وہ میری میز کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی آمد کی غرض وغایت دریافت کی۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

”میرا نام قدیر احمد ہے۔ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہوں۔ ایم اے جناح روڈ کی ایک معروف کاروباری بلڈنگ میں میرا دفتر ہے۔ میں ایک انتہائی نازک معاملے میں آپ کی قانونی مدد چاہتا ہوں۔ کیا آپ ہی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہیں؟“

میں نے کہا؟ ”جی! مجھے مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کہتے ہیں۔“ پھر پوچھا۔ ”آپ کو کس سلسلے میں میری مدد درکار ہے؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ”بیگ صاحب! دراصل آپ کی قانونی مدد کی ضرورت مجھے نہیں بلکہ میرے بڑے بھائی کو ہے۔ وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔“

”ذرا تفصیل سے بتائیں۔“ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ”فرید احمد کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔“

”فرید احمد غالباً آپ کے بڑے بھائی کا نام ہے۔“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا۔ ”پولیس نے آپ کے بھائی کو کس سلسلے میں گرفتار کیا ہے؟“

”ان پر قتل کا الزام ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر استفسار کیا۔ ”قتل کون ہوا ہے، میرا مطلب ہے آپ کے بھائی پر کس کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔“

"مقتولہ کا نام شگفتہ ہے اور وہ میری بھاوج تھیں۔" قدیر احمد نے بتایا۔

"آپ کی بھاوج یعنی ملزم فرید احمد کی بیوی؟"

"جی ہاں' آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔"

"قتل کہاں اور کن حالات میں ہوا ہے؟"

وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ "درحقیقت وہ ایک حادثہ تھا۔ ایک اتفاقی حادثہ۔ اس میں بھائی صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن حالات و واقعات ان کے مخالف جا رہے ہیں اور پولیس نے انہیں اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں تھانے میں بند کر رکھا ہے۔"

"یہ قتل...... میرا مطلب ہے' اتفاقی حادثہ کب وقوع پذیر ہوا ہے؟" میں نے قدیر احمد کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ "آج سہ پہر میں۔ تین اور چار بجے کے درمیان۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا پولیس نے آپ کے بھائی کے خلاف ایف آئی آر کاٹ دی ہے۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے استفسار کیا۔ "آپ کے بھائی کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے اور حادثہ کہاں' کن حالات میں پیش آیا ہے؟"

قدیر احمد نے بتایا۔ "یہ واقعہ بھائی صاحب کے دفتر میں پیش آیا ہے اور وہیں سے انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔"

"آپ کے بھائی کا دفتر کہاں پر واقع ہے؟"

"شارع فیصل پر۔"

"کاروبار کی نوعیت کیا ہے؟"

"وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا قدیر صاحب! آپ نے ابھی تک مجھے حادثے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ جب تک آپ پوری تفصیل مجھے نہیں سنائیں گے' میں آپ کے بھائی کی مدد کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نظر انداز کیے بغیر سب کچھ میرے علم میں لے آئیں۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔" قدیر احمد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ کل پولیس بھائی صاحب کو عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کی ضمانت کے کاغذات تیار کر لیں۔"

میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ "دیکھیں قدیر صاحب! میں ایک بات آپ پر واضح کرتا چلوں کہ جب تک میں کسی معاملے میں مطمئن نہ ہو جاؤں اس وقت تک کوئی کیس ہاتھ میں نہیں لیتا۔ میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو سیاہ و سفید کی تمیز کیے بغیر بس اپنی جیب گرم کرنے کے لیے ہر کیس پکڑ

لیتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کے موکل کو انصاف ملتا ہے یا نہیں۔ انہیں تو بس اپنی فیس کھری کرنے سے مطلب ہوتا ہے۔"

"جی' میں جانتا ہوں۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ کے بارے میں مجھے اشفاق صاحب نے تفصیلاً بتا دیا تھا۔ آپ سے رجوع کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ آپ انصاف پسند اور اصول پرست وکیل ہیں اور اپنے پیشے سے پوری طرح مخلص بھی...... ورنہ وکیلوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ آپ کے پاس آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہمیں عدالت سے انصاف چاہیے۔ اشفاق صاحب خواہ مخواہ کسی کی تعریف نہیں کرتے اور میں انہی کی ہدایت پر آپ کے پاس آیا ہوں۔"

میرے ملنے والوں میں اشفاق نامی تین افراد تھے۔ اشفاق حسین' اشفاق آفندی اور ڈاکٹر اشفاق احمد۔ معلوم نہیں ان میں سے کن اشفاق صاحب نے قدیر احمد کو میرے پاس بھیجا تھا۔ میں نے اپنی معلومات کی غرض سے دریافت کیا۔ "آپ کو میرے پاس بھیجنے والے اشفاق صاحب کا شغل کیا ہے؟"

اس نے استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "کمال ہے' آپ اشفاق صاحب کو نہیں جانتے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ آپ ان کے بہت قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ میں ابھی ان کے اسپتال سے آ رہا ہوں۔"

"اوہ تو آپ ڈاکٹر اشفاق احمد کے ریفرنس سے آئے ہیں۔" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر اسے بتایا۔ "دراصل میرے دوستوں میں اشفاق نامی تین افراد شامل ہیں اس لیے وضاحت کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔"

"اب تو آپ میرے بھائی کا کیس لینے کو تیار ہیں نا!" قدیر احمد نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "قدیر صاحب! ایک بات ذہن میں بٹھا لیں' کیس ٹیکنگ کے میرے اپنے کچھ اصول ہیں۔ میں ان سے کبھی نہیں ہٹتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ پہلی فرصت میں مجھے اس واقعے یا بقول آپ کے اس اتفاقی حادثے کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔"

چند لمحے وہ چھت کو گھورتے ہوئے اپنے ذہن میں خیالات کو مجتمع کرتا رہا پھر اس نے مجھے اس واقعے کی جو تفصیل سنائی میں یہاں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

ملزم فرید احمد اور متوفیہ شگفتہ کی شادی کو پندرہ سولہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا مگر ان کے یہاں ابھی تک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ فرید احمد پہلے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں پارٹنر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن پانچ سال قبل اس نے شارع فیصل کی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں اپنی ذاتی ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کر لی تھی۔ اس کی ایجنسی کا دفتر عمارت کے تھرڈ فلور پر تھا۔ جب وہ بہ حیثیت پارٹنر کام کر رہا تھا تو وہ اپنی آمدنی سے مطمئن نہیں تھا پھر کسی نجومی کے کہنے پر اس نے ایک خودمختار ایجنسی بنالی۔ دیکھتے ہی

دیکھتے اس کا کام پھولنے پھلنے لگا اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ اب اس کی ایجنسی شہر کی ایک معروف و مصروف ایجنسی بن چکی تھی۔ وہ زیادہ تر اشتہاری فلمیں بناتے تھے۔

جب انسان کے پاس دولت کی فراوانی ہو جائے تو اسے بہت دور دور کی سوجھنے لگتی ہے۔ فرید احمد کا تو کام ہی ایسا تھا کہ وہ صبح و شام حسینوں میں گھرا رہتا تھا۔ ایک سے ایک خوب صورت اور طرح دار ماڈل لڑکیاں اس کی ایجنسی میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ مال و دولت کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ حسن پرست بھی واقع ہوا تھا اس لیے دل کھول کر وہ اپنے ارمان پورے کرنے لگا۔

یہ ایسی سرگرمیاں نہیں تھیں جو طویل عرصے تک شگفتہ سے چھپی رہتیں۔ فرید احمد سے جب بھی اس موضوع پر شگفتہ کی بات ہوتی تو وہ بہت خوب صورتی سے اپنا دامن بچا جاتا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اس کے پیشے کا تقاضا ہے کہ وہ ماڈل لڑکیوں میں گھل مل کر رہے۔ وہ اپنے تئیں شگفتہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ ان حسیناؤں سے اس کے بس پیشہ ورانہ تعلقات ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شگفتہ اس کی وضاحتوں اور تسلیوں سے مطمئن نہ ہوئی تو اس نے دفتر ہی میں کچھ ایسا انتظام کر دیا کہ اسے فرید کی سرگرمیوں کی خبریں ملتی رہیں۔ وہ فرید کی حسن پرستی سے واقف تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ یہ حسن پرستی رنگین مزاجی میں تبدیل ہو جائے۔

شگفتہ کی پیش بندیوں کے باوجود فرید احمد کی سرگرمیاں جاری رہیں اور ایک ماڈل کے ساتھ تو وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا۔ وہ ماڈل تھی روحی۔ روحی کے بارے میں شگفتہ کو بتایا گیا کہ فرید اس پر بری طرح فریفتہ ہو چکا ہے اور عن قریب اس سے شادی کرنے والا ہے۔

شگفتہ، فرید احمد کی بے اعتدالیوں کو تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر رہی تھی لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس پر سوتن آنے والی ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے فرید سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس رات ان دونوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی بھی ہو گئی۔ فرید نے اسے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ روحی سے اس کا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن شگفتہ کے مخبر نے اسے پکی اطلاع دی تھی۔ وہ کسی بھی صورت فرید کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔

فرید نے بیزاری سے کہا۔ ”آخر تمہیں کس نے یہ بات بتائی ہے کہ میں روحی سے شادی کرنے والا ہوں۔“

شگفتہ اپنے مخبر کا نام تو نہیں بتا سکتی تھی، بولی۔ ”تم اس بات کو چھوڑو کہ یہ خبر مجھ تک کیسے پہنچی۔ میری ایک بات کان کھول کر سن لو اگر تم اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو میں تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑوں گی۔ تم اس چھنال کے ساتھ فٹ پاتھ پر نظر آؤ گے۔“

”دیکھو اس بے قصور کو خواہ مخواہ ایسے معیوب الفاظ میں نہ تولو۔“ فرید نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کسی نے اس کے بارے میں بالکل غلط اطلاعات دی ہیں۔ روحی میری ایجنسی کی ضرورت ہے۔ آج کل اس کی بڑی مارکیٹ ہے۔ اس کے کمرشلز کی وجہ سے ہمارا بزنس بہت تیزی

سے بڑھ رہا ہے۔“

”میں ایسی کاروباری ترقی سے باز آئی۔“ شگفتہ نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”جو میری ازدواجی زندگی میں زہر گھول دے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے شگفتہ۔“

”ایسا ہے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”میں پھر یہی کہوں گا کہ تمہیں کسی نے خواہ مخواہ میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ روحی......“

”فرید!“ شگفتہ اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولی۔ ”اب میں تمہاری زبان پر اس حرافہ کا نام نہ سنوں۔ بس بہت ہو چکی۔“

”تم روحی کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔“

”کتنی تکلیف ہو رہی ہے تمہیں روحی کی وجہ سے؟“

”تم بہت وہمی ہو گئی ہو شگفتہ۔“

”میں وہمی نہیں ہوئی بلکہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔“ شگفتہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”دیکھو فرید! میں تمہاری چھوٹی موٹی نادانیاں برداشت کرتی رہی ہوں اور انہیں نظر انداز بھی کرتی رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں، مرد اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے لیکن تم اس حد تک بڑھ جاؤ، میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”میں پھر یہی کہوں گا تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”میں تمہارے تیوروں سے بھی محسوس کر رہی ہوں، آج کل خاصے اکھڑے اکھڑے رہنے لگے ہو۔ میں تمہارے رویّے میں خاصی تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ روحی سے تمہارے وہ تعلقات نہیں ہیں جو میں محسوس کر رہی ہوں۔“

فرید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر میں قسم کھا لوں تو کیا تمہیں یقین آ جائے گا؟“

وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ”اس کا دارومدار تمہارے قسم کھانے کے انداز پر ہے۔ میں تمہارے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لوں گی کہ تم نے جھوٹی قسم کھائی ہے یا اپنے قول میں کھرے ہو۔“

”یہ کیسی عجیب بات کر دی ہے تم نے۔“ فرید نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”بات عجیب ہے یا غریب، تم قسم کھا کر دکھاؤ۔“

”کیا فائدہ۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”جب تمہارے ذہن میں شک کا پودا جڑ پکڑ چکا ہے تو میرے قسم کھانے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ تم کہاں میری بات کا یقین کرو گی۔“

شگفتہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ قسم کھا رہے ہو یا نہیں؟“

"میں ایسی چھوٹی موٹی باتوں کے لیے قسم کھا کر خود کو گناہ گار نہیں کرنا چاہتا۔" وہ روکھے پھیکے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے تمہارے دل میں ضرور کوئی چور چھپا بیٹھا ہے۔" شگفتہ معنی خیز انداز میں بولی۔ "دل میں کچھ نہیں...... بلکہ بہت کچھ کالا موجود ہے۔"

"تمہارے وہم کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔"

"مگر تمہارے کرتوتوں کا میرے پاس بہت عمدہ علاج ہے۔" شگفتہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

فرید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "شگفتہ! یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔ آخر کو میں تمہارا شوہر ہوں۔"

"تم میرے شوہر ہو اسی لیے تمہیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی ہوں۔" شگفتہ نے ذو معنی انداز میں کہا۔ "میں تمہیں آخری بار وارننگ دے رہی ہوں، روحی آج کے بعد تمہارے آس پاس کہیں نظر نہیں آنی چاہیے ورنہ......"

"ورنہ کیا؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو ورنہ میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تمہیں میری طاقت اور اختیار کا بہ خوبی اندازہ ہے۔"

فرید اپنی بیوی کے لہجے میں پوشیدہ دھمکی سے آگاہ تھا۔ دراصل فرید نے نجومی کی ہدایت پر اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے تمام مالکانہ حقوق شگفتہ کو تفویض کر رکھے تھے۔ نارتھ ناظم آباد کے جس بنگلے میں ان کی رہائش تھی، وہ بھی شگفتہ ہی کے نام تھا۔ نجومی نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ اگر فرید روز افزوں ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے ان ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ فرید نے ایسا ہی کیا تھا اور حیرت انگیز طور پر اس کا کاروبار دیکھتے ہی دیکھتے ناقابل یقین حد تک پھیل گیا تھا اور اب شگفتہ اسے احساس دلا رہی تھی کہ اگر اس نے روحی کا خیال دل سے نہ نکالا تو وہ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکے گی۔

حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے فرید نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "میں ایسا کرتا ہوں کہ یہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی بند کر کے کسی مسجد کے سامنے ٹوپی، مسواک اور تسبیح وغیرہ کا ٹھیلا لگا لیتا ہوں۔ نہ رہے گا بانس، نہ بجے بانسری۔ پھر تو تم خوش ہو جاؤ گی نا۔ میرے ارد گرد ماڈل لڑکیاں تمہیں بہت بری لگتی ہیں نا۔ یاد رکھو، ہم انہی ماڈل لڑکیوں کے دم قدم سے آج یہ شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ کاش میں نے نجومی کی ہدایت پر عمل نہ کیا ہوتا۔ آج مجھے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔"

شگفتہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم نہ بے بس ہو اور نہ ہی بے کس۔ فرید! مجھے تمہارے ماڈل لڑکیوں میں گھرے رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو صرف روحی کے بارے میں تمہیں تنبیہ کر رہی ہوں۔ میری زندگی میں تم مجھ پر سوتن نہیں لا سکتے؟"

"تم ایک ایسے ایشو پر توانائی ضائع کر رہی ہو جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔" فرید نے

اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

"میں حقیقت سے بہ خوبی واقف ہوں فرید۔"

"میں تمہیں قائل نہیں کر سکتا۔"

"کسی کو قائل کرنے کے لیے جن ٹھوس حقائق کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔" شگفتہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کیوں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔"

وہ بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ویسے شک اور وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ اب ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔" فرید اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیا بات ہو سکتی ہے؟" شگفتہ نے سوال کیا۔

"میں روحی کو ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے لاتعلق کر دیتا ہوں۔"

"اوہ، میں کچھ اور سمجھی تھی۔"

فرید نے سوالیہ نظر سے بیوی کو دیکھا، وہ بولی۔ "میں سمجھی کہ شاید تم نے بھی کوئی شاہانہ فیصلہ کر لیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں، تم خواہ مخواہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔"

شگفتہ بولی "میرا مطلب تھا کہ شاید تم نے بھی اپنی محبوبہ کے لیے تخت و تاج کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے یعنی......"

"میں تمہارے طنز کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شگفتہ۔" فرید نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "ظاہر ہے، تم میرے کاروبار اور گھر بار کی مالک ہو لیکن تمہارا یہ بلیک میلنگ کا انداز مجھے قطعی پسند نہیں آیا۔ ایک بات میں واضح کر دوں کہ نہ تو روحی میری محبوبہ ہے اور نہ ہی اس کی خاطر میں اس جمے جمائے کاروبار سے دست بردار ہونے کی حماقت کر سکتا ہوں۔ تمہارا ذہن اس وقت شکوک و شبہات کی آماج گاہ بنا ہوا ہے۔ میں روحی سے شادی وغیرہ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور ایک مرتبہ پھر تم کان کو کھول کر سن لو کہ میں کل ہی روحی کو اپنے بزنس سے کٹ کر رہا ہوں۔"

"صرف بزنس سے نہیں بلکہ میں چاہتی ہوں کہ وہ منحوس تمہاری زندگی سے بھی کٹ ہو جائے۔" شگفتہ دوٹوک انداز میں بولی۔

فرید نے کہا۔ "جب وہ ایجنسی سے لاتعلق ہو جائے گی تو تمہیں خود ہی یقین آ جائے گا کہ اس سے میرا ایسا سنجیدہ تعلق نہیں تھا جیسا تم سمجھ رہی ہو۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" شگفتہ نے کہا۔

دوسرے روز واقعی فرید نے روحی کو اپنے پروجیکٹ سے کٹ کر دیا۔ فرید نے یہ سب کچھ اپنی بیوی کو دکھانے کے لیے کیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اب بھی گاہے بہ گاہے روحی سے ملتا رہتا تھا۔ یہ ملاقاتیں نہایت ہی خفیہ طور پر بڑے پراسرار انداز میں ہوا کرتی تھیں۔ فرید روحی کے بغیر نہیں رہ سکتا

تھا۔ وہ واقعی اس سے محبت کرنے لگا تھا اور اس سے شادی کا وعدہ بھی کر بیٹھا تھا۔

شگفتہ کی وجہ سے اب اسے جس صورت حال کا سامنا تھا اس میں وہ کھلم کھلا روحی سے شادی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہوشیار عاشق تھا اور عشق میں بھی کاروبار کے سنہری اصولوں کو فراموش کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے جمے جمائے کاروبار سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے روحی کو ٹالتا رہا۔ وہ جلد از جلد شادی پر اصرار کرنے لگی۔ وہ خفیہ شادی کے لیے بھی رضا مند تھی مگر فرید ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ اسی کشمکش میں ایک سال گزر گیا۔ روحی سے خفیہ ملاقاتیں رنگ لے آئیں۔ ایک نازک لمحے میں وہ حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ روحی نے جب یہ تشویش ناک خبر فرید کو سنائی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ اسے نجات کی مختلف صورتوں کے بارے میں پٹی پڑھانے لگا لیکن وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ فرید جلد از جلد اس سے شادی کر لے۔ فرید کی حیل وحجت اور ملاقات سے کترانے کو دیکھ کر وہ ایک روز اس کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی آ دھمکی۔

فرید اس خیال سے اب مطمئن ہو چکا تھا کہ شگفتہ نے اس کی نگرانی موقوف کر دی تھی لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ شگفتہ بدستور اس کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا حساب رکھے ہوئے تھی۔ اسے یہ پتہ چل چکا تھا کہ فرید چوری چھپے اب بھی روحی سے ملتا رہتا ہے۔ وہ رنگے ہاتوں اپنے شوہر کو گرفتار کرنا چاہتی تھی اور اس روز اسے یہ موقع مل گیا تھا البتہ شگفتہ اس بات سے آگاہ نہیں تھی کہ وہ دونوں خفیہ ملاقاتوں میں کس حد تک سفر کر چکے تھے۔

جس وقت روحی فرید سے ملنے اس کے دفتر پہنچی تو شگفتہ کو گھر پر اس کی اطلاع مل گئی۔ اس نے اسی وقت فرید کو فون کیا۔

”فرید! میں آج اپنی آنٹی کی طرف جا رہی ہوں۔ تم رات کو گھر جاتے ہوئے مجھے ان کے گھر سے لے لینا۔“

شگفتہ کی آنٹی کا گھر گلشن اقبال میں تھا۔ شگفتہ نے دانستہ ایسا تاثر دیا تھا کہ فرید اس کی طرف سے مطمئن ہو جائے اور انہیں رنگے ہاتھوں دفتر میں ملاقات کرتے ہوئے پکڑ سکے۔ اس وقت دن کے تقریباً تین بجے تھے۔ وہ فون کرنے کے فوراً بعد گھر سے نکل پڑی تھی۔

فرید روحی کی اپنے دفتر میں آمد سے خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ لیکن شگفتہ کا فون آنے کے بعد اس کی پریشانی میں قدرے کمی آ گئی تھی۔ شگفتہ جب بھی اپنی سلمٰی آنٹی کے پاس گلشن اقبال جاتی تھی تو پھر وہ رات کو اسے اپنے ساتھ ہی لے کر گھر جایا کرتا تھا۔ وہ شگفتہ کی طرف سے تو مطمئن ہو گیا تھا لیکن اس کی پریشانی کا دوسرا سبب روحی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس پریشانی میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روحی کی وہاں آمد کی اطلاع آن واحد میں شگفتہ کو پہنچ چکی ہوگی۔ دراصل اسے یہ بات تو معلوم تھی کہ دفتر میں کوئی آدمی ماضی میں شگفتہ کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیتا رہا تھا لیکن جب سے اس نے

روحی کو اپنے دفتر سے لاتعلق کیا تھا اس کے بعد سے اس نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ ویسے شروع شروع میں اس نے اس جاسوس کو ٹریس کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر ناکامیابی کے بعد تھک ہار کر خاموش ہو بیٹھا تھا۔

آج روحی اچانک ہی اس کے دفتر آ پہنچی تھی اور اس وقت اس کے سامنے سراپا سوال بنی بیٹھی تھی۔ فرید نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

”روحی! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ شگفتہ......“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ”میں شگفتہ کا ذکر سن سن کر اکتا گئی ہوں فرید صاحب! مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کی بیوی اور آپ کے مابین کیا رسا کشی چل رہی ہے۔ میں تو آپ سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ مجھ سے کیا ہوا وعدہ آپ کب نبھا رہے ہیں۔ اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔“

”بس کچھ دن کی بات ہے روحی۔“

”کچھ دن۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔ ”آپ کو میری مجبوری کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔“

”میں نے تمہاری مجبوری کا حل تو پیش کیا تھا لیکن تم نے......“

”میری مجبوری کا بس ایک ہی حل ہے۔“ روحی نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”آپ جلد از جلد مجھ سے شادی کر لیں۔“

”جلد بازی اچھی نہیں ہوگی روحی۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں فرید صاحب؟“

”دیکھو روحی، تم اس وقت یہاں سے چلی جاؤ۔“ فرید نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ ”میں نے اس مسئلے کا ایک نہایت ہی مثبت حل سوچ لیا ہے۔ میں دو چار دن میں شگفتہ کو بھی اس شادی پر رضا مند کر لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس وقت تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“

”آپ مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ روحی نے کہا۔ ”میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ مجھے دولت اور مال و جائیداد کا ذرا بھی لالچ نہیں ہے اور پھر یہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ شگفتہ بھلا کس طرح ہماری شادی پر رضا مند ہو جائے گی۔ اس کی وجہ سے تو آپ نے مجھے اپنی ایجنسی سے لاتعلق کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ ابھی تک مجھے وہ معاوضہ باقاعدگی سے ادا کر رہے ہیں جو میں آپ کے کمرشلز میں کام کر کے حاصل کرتی تھی لیکن ابھی تک آپ نے وہ وعدہ پورا نہیں کیا اور اب تو میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ میں مزید انتظار کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”میں نہ اپنے وعدے سے پھرا ہوں اور نہ ہی تمہاری اہمیت میری نظر میں کم ہوئی ہے روحی۔“ فرید نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم یقین کرو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پلیز، اس وقت تم دفتر سے چلی جاؤ۔ میں رات میں فون پر تمہیں بتاؤں گا کہ میں نے شگفتہ کو رام کرنے کی کیا ترکیب

سوچی ہے۔"

"آپ کی یہ بات سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ کی بیوی آسانی سے آپ کی تجویز پر رضامند ہو جائے گی۔" روحی نے کہا۔

"ابھی میں تمہیں تفصیل سے نہیں بتا سکتا۔" فرید نے کہا پھر پوچھا۔ "تمہیں میرے کمرے تک پہنچتے ہوئے کس کس نے دیکھا ہے؟"

"میرا خیال ہے، صرف آپ کی سیکریٹری نے دیکھا ہے۔" روحی نے جواب دیا۔ "کیونکہ اس کے کمرے سے گزر کر ہی آپ کے کمرے میں آنا ہوتا ہے لیکن آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

فرید نے کہا۔ "دراصل ابھی تک میں اس جاسوس کا سراغ نہیں لگا سکا ہوں جو شگفتہ کو ہمارے بارے میں اطلاعات پہنچاتا تھا اس لیے پوچھ رہا ہوں۔"

"اگر وہ آپ کی سیکریٹری ہی ہوئی تو۔" روحی نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

فرید نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں، فوزیہ میری وہ "مطلوبہ جاسوس" نہیں ہو سکتی۔ اسے تو میں نے ابھی تین ماہ پہلے اپائنٹ کیا ہے۔"

"اوہ، میں نے غور نہیں کیا۔" روحی بولی۔ "کیا انیتا کی آپ نے چھٹی کر دی ہے؟"

"ہاں، وہ کچھ حد سے زیادہ ہی ہاتھ پاؤں پھیلانے لگی تھی۔" فرید نے بتایا۔ "فوزیہ میرے بھروسے کی ہے۔ کیا تمہیں انیتا کی جگہ فوزیہ کو بیٹھے دیکھ کر کچھ تبدیلی محسوس نہیں ہوئی تھی؟"

"میں نے بتایا ہے نا، میں آپ کی سیکریٹری کی طرف بغور نہیں دیکھ سکی۔" روحی نے کہا۔ "شاید اس نے بھی مجھے نہیں دیکھا ورنہ وہ آپ کے کمرے میں داخلے سے پہلے مجھ سے استفسار ضرور کرتی۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" فرید نے کہا۔ "تو پھر ٹھیک ہے، رات کو فون پر بات ہو گی۔"

روحی بادل ناخواستہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو فرید نے کہا۔ "رک جاؤ روحی۔" روحی نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بولا۔ "واپسی کے لیے یہ راستہ استعمال نہ کرو۔" روحی رک کر سوالیہ نظر سے فرید کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے کمرے کے عقبی دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر سے نکل جاؤ، یہ زینے تمہیں عمارت کی عقبی جانب پہنچا دیں گے۔ کسی کو بھی تمہاری واپسی کا علم نہیں ہو سکے گا۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر مذکورہ دروازہ کھول دیا۔

روحی، فرید پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے اس دروازے سے باہر نکل گئی۔ فرید کے کمرے میں آنے اور جانے کے لیے یہ ایک اضافی اور خفیہ راستہ تھا جو بلڈنگ کے عقب میں نکلتا تھا۔ دفتر کے اسٹاف کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے بہ آسانی فرید کے کمرے تک پہنچا جا سکتا تھا۔

فرید، روحی کو رخصت کر کے قدرے مطمئن تو ہو گیا تھا لیکن اس کے دل میں یہ اندیشہ ضرور جاگ چکا تھا کہ اسے یہاں تک آتے ہوئے کسی نے دیکھ نہ لیا ہو۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فرید کا دفتر بلڈنگ کے تیسرے فلور پر تھا۔ "ابھی تک روحی نیچے نہیں پہنچی ہو گی۔" اس نے سوچا اور اپنے کمرے

کے تیسرے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ فرید کے کمرے میں تین دروازے کھلتے تھے۔ ایک دفتر کی جانب جہاں سے روحی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ دوسرا عمارت کی عقبی جانب جہاں سے روحی رخصت ہوئی تھی اور تیسرا دروازہ ایک بالکونی میں کھلتا تھا۔ یہ عمارت کا وہ رخ تھا جس طرف شارع فیصل تھی۔ بالکونی میں ڈیڑھ فٹ اونچی ایک آرائشی و نمائشی ریلنگ بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ بالکونی میں کھڑے ہو کر باہر سڑک کا منظر دیکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے روحی ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے جاتے ہوئے نظر آ گئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسی اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

وہ بالکونی ہی میں کھڑا روحی اور شگفتہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ روحی کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے شگفتہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ شگفتہ کے ساتھ ساتھ وہ تمام کاروبار اور مال و جائیداد بھی اڑن چھو ہو جاتے جنہیں وہ گنوانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ اس کے کمرے میں کوئی داخل ہوا۔ بالکونی میں آتے ہوئے وہ اپنے پیچھے بالکونی والا دروازہ بند کر آیا تھا لیکن اس کے کمرے میں کوئی ایسے طوفانی انداز میں داخل ہوا تھا کہ وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بالکونی کی سمت والے دروازے سے اپنے کمرے میں پہنچا تو سامنے شگفتہ کو کھڑے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"شگفتہ......تم؟"

"ہاں، میں۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی۔ "تم مجھے یہاں دیکھ کر اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟"

"تم تو اپنی آنٹی سلمیٰ کے یہاں......!"

فرید کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شگفتہ تڑخ کر بولی۔ "وہ تو میں نے تمہیں چکر دینے کے لیے فون کیا تھا۔ میں تم دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی۔"

"کون دونوں؟"

"زیادہ ان جان بننے کی کوشش نہ کرو فرید۔" وہ خونخوار لہجے میں بولی پھر دفتر کے در و دیوار کو کھوجی نظر سے تکتے ہوئے غرائی۔ "کہاں ہے وہ حرام زادی؟"

فرید تو شگفتہ کی آمد ہی سے گھبرا گیا تھا اور اب وہ اس سے روحی کے بارے میں استفسار بھی کر رہی تھی۔ گویا روحی کی وہاں آمد ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی اور جاسوس اعظم نے ہی شگفتہ تک اس کی اطلاع پہنچا دی تھی۔ فرید اپنے حواس کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔

"شگفتہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ تم کسی حرام زادی کا ذکر کر رہی ہو؟"

"میری طبیعت تو ٹھیک ہی ہے لیکن میں تمہاری طبیعت ٹھیک کرنے آئی ہوں۔" وہ بہ دستور دفتر میں چاروں جانب نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ "تم نے اپنی محبوبہ نامراد کو کہاں چھپایا ہے؟" اپنی بات

ختم کرتے ہی وہ میز کے نیچے اور دیگر کونوں کھدروں میں تاکا جھانکی کرنے لگی۔

فرید اس وقت بالکونی والے دروازے کی جانب پشت کیے کھڑا تھا اور اندر آنے سے پہلے اس نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ شگفتہ بڑے غضب ناک انداز میں مختلف اشیا کو الٹ پلٹ کر رہی تھی اور ساتھ ہی روحی کو صلواتیں بھی سناتی جا رہی تھی۔

''اس سور کی جنی نے ابھی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا فرید۔ میں آج تمہاری روحی کی روح قبض کر کے چھوڑوں گی۔''

''تمہیں غلط فہمی ہے شگفتہ۔ روحی یہاں نہیں آئی۔''

''تم مسلسل مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔'' وہ غرائی۔ ساتھ ہی چیزوں کی اٹھا پٹخ بھی جاری تھی۔ ''میں جانتی ہوں تم گزشتہ ایک سال سے چھپ چھپ کر اس سے ملتے رہے ہو۔ میں نے دانستہ تمہیں آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ مجھے اس سنہری موقع کا انتظار تھا جب میں تم دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکوں تاکہ وہ تمام اقدامات کرنے میں مجھے آسانی رہے جو کچھ میں نے سوچ رکھے ہیں اور آج وہ سنہری موقع مجھے مل گیا لیکن تم نے روحی کو کہیں چھپا دیا ہے۔ بتاؤ' کہاں ہے وہ؟''

''میں نے کہا نا' تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو۔'' فرید نے بگڑی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''روحی یہاں آئی ہی نہیں تو میں اسے چھپاؤں گا کہاں!''

''مجھے بالکل پکی اطلاع ملی تھی۔''

''تمہیں کس نے اطلاع دی تھی؟''

''میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا سورس بتا دوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کچھ میرے نمک خوار بھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ تم نے کیا مجھے بالکل ہی بے دست و پا سمجھ رکھا ہے۔''

''قطعاً نہیں۔'' فرید نے کہا۔ ''میرے لیے سب کچھ تم ہی ہو شگفتہ۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ دہاڑی۔ ''اپنی ان چپڑی چکنی باتوں سے مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو فرید۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو مجھے فوراً بتا دو روحی کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟''

روحی کو وہ اپنی نگاہ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر رخصت ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے اسے یہ ڈر تو نہیں تھا کہ روحی وہاں سے برآمد ہو کر اس کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر دے گی۔ اسے بس تشویش اس بات کی تھی کہ شگفتہ تک روحی کی آمد کی اطلاع کس نے پہنچائی تھی۔ خیر' اس نے ذرا سخت رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور بولا۔۔۔

''بس' بند کرو یہ تماشا۔ روحی یہاں نہ تو آئی ہے اور نہ ہی میں نے اسے کہیں چھپایا ہے اس لیے اس کا یہاں سے برآمد ہونا بھی ناممکنات میں سے ہے۔ تم خود میرا پورا کمرا کھنگال چکی ہو۔''

وہ ایک لمحے کو متذبذب نظر آئی کیونکہ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ روحی وہاں نہیں پائی گئی تھی تاہم وہ

اپنا رعب داب قائم رکھتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو فرید' میں آخری بار تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ جلدی سے بتا دو' روحی کا تم نے کیا کیا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

''تم خواہ مخواہ ایک فتنہ کھڑا کر رہی ہو۔''

''تم نے ضرور اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے فرید۔'' وہ بے یقینی سے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی پھر چونکتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اوہ' میں نے باتھ روم تو دیکھا ہی نہیں۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ ملحقہ واش روم کی جانب لپکی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ ناکام و نامراد لوٹ آئی۔ اب اس کے غصے اور جھنجلاہٹ نے جنون کی سی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ وہ غضب ناک انداز میں دہاڑی۔

''تو تم نہیں بتاؤ گے روحی کے بارے میں؟''

''میں نے اسے ایک سال سے نہیں دیکھا۔''

''اور میں نے تم سے بڑا جھوٹا نہیں دیکھا۔''

''تمہیں بوگس اطلاعات فراہم کر کے بے وقوف بنایا جا رہا ہے شگفتہ۔'' فرید نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا جو بھی شخص کر رہا ہے وہ انتہائی کمینہ اور بدذات ہے۔ میاں بیوی کے درمیان ناچاقی اور نااتفاقی پیدا کرنے والے کا ٹھکانا جہنم کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔''

''اور جو اپنی بیوی سے بے وفائی کرے؟'' شگفتہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''اپنی محبوبہ کے ساتھ گل چھرے اڑاتا پھرے اور اس سے شادی کا وعدہ کرے' ایسے مرد کا ٹھکانا کہاں ہوگا فرید؟''

''اس وقت تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ قدرے ناراضی سے بولا۔ ''اس لیے کوئی معقول بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔''

وہ تحقیر آمیز لہجے میں بولی۔ ''اے مردِ نامعقول! تمہاری ذہنی حالت تو میں ابھی درست کرتی ہوں۔''

فرید کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ شگفتہ کے چہرے پر طمانیت آمیز ایک رنگ سا آ کر گزر گیا پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''جب میں تمہارے کمرے میں داخل ہوئی تو تم یہاں موجود نہیں تھے پھر تم بالکونی کی جانب والے دروازے سے برآمد ہوئے تم وہاں کیا کر رہے تھے ذلیل انسان؟''

''میں باہر سڑک کا نظارہ کر رہا تھا۔'' وہ اپنی توہین کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

جب سے روحی اور فرید کا چکر چلا تھا وہ شگفتہ کی طرف سے سخت و سست سننے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی وہ دبو قسم کا شوہر تھا اور شگفتہ دباؤ قسم کی بیوی۔ شگفتہ نے جب اسے ذلیل انسان کہا تو اس کے چہرے پر ذلت کے وہ تاثرات پیدا نہ ہو سکے جو ایسے موقع پر کسی غیرت مند مرد کے چہرے پر پیدا ہونے چاہئیں تھے۔ شگفتہ نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہٹو راستے سے‘ ذرا میں بھی تو اس سڑک کا نظارہ کروں جس میں تمہارا دل لگا ہوا تھا۔"

فرید نے رواروی میں پوچھا۔ "تم وہاں کیا دیکھنا چاہتی ہو؟"

فرید کے سوال نے اس کے شک کو پختہ کر دیا۔ وہ تڑخ کر بولی۔ "تم نے اپنی ماں کو وہاں چھپایا ہوگا۔ بس وہی ایک جگہ ایسی ہے جہاں وہ روپوش ہو سکتی ہے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے‘ میں بالکونی میں جا رہی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی شگفتہ نے نہایت سرعت سے اس دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے جو بالکونی میں کھلتا تھا۔ اس کی تیزی کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اسے خدشہ ہو‘ اگر اس نے ایک لمحے کی بھی تاخیر کر دی تو روحی‘ روح میں تبدیل ہو کر غائب ہو جائے گی۔

ایک دھڑاکے سے دروازہ کھول کر وہ بالکونی میں پہنچی لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ہی فرید بھی بالکونی میں پہنچ گیا تھا۔ شگفتہ کی ناکامی پر اس نے طنز کا تیر برسایا۔

"دیکھ لیا تم نے۔ کہاں ہے روحی؟"

شگفتہ اپنی ناکامی پر جھنجلائی ہوئی تھی۔ فرید کے اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا‘ اس کا جنون ساتویں آسمان کو چھو گیا پھر بے اختیار اس کا ہاتھ اٹھ گیا۔ اس نے اپنے شوہر نامدار کو تھپڑ مارنے کی کوشش کی تھی لیکن فرید اس کی طرف سے بالکل غافل نہیں تھا۔ اس نے شگفتہ کا ہاتھ اپنے گال تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی کلائی اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں جکڑ لی۔

شگفتہ اس کی گرفت میں کسمسائی۔ پے در پے ناکامیوں نے اس کا جنون سوا کر دیا تھا‘ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے اپنے بازو کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ سوئے اتفاق‘ فرید کے ہاتھ سے اس کی کلائی چھوٹ گئی۔ اسی وقت ردِعمل کے طور پر شگفتہ کے بدن کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کا توازن بری طرح بگڑ گیا۔ وہ اس وقت بالکونی کی ریلنگ کے بالکل قریب تھی۔ نتیجتاً اس کا جسم ڈیڑھ فٹ کی ریلنگ کے اوپر سے ہوتے ہوئے زمین کی طرف جانے لگا۔

اسی وقت بے اختیار فرید نے شگفتہ کو تھامنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرید کے ہاتھ محض دو تین انچ کے فاصلے سے ہوا میں لہرا کر رہ گئے۔ شگفتہ کا جسم اس کی گرفت میں نہیں آ سکا تھا۔

شگفتہ کا جسم ہوا میں لہراتے ہوئے تھرڈ فلور کی بالکونی سے سیدھا نیچے زمین کی طرف آیا۔ اس وقت نیچے سروس روڈ سے ایک ٹرک کسی دفتر کا فرنیچر لے کر گزر رہا تھا۔ جنگ عظیم میں استعمال ہونے والا وہ کھٹارا سا ٹرک نیلامی کے بعد باربرداری کے کام آ رہا تھا۔ اس میں نیچے سے اوپر تک لکڑی کا سامان رکھا ہوا تھا۔ شگفتہ سر کے بل اسی سامان پر آ رہی اور ایک میز کا کونا اس کے سر کو پاش پاش کر گیا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئی۔

فرید کے لیے یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا مگر یقین نہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا وہ

ہو چکا تھا۔ شگفتہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ یہ بات صرف فرید ہی جانتا تھا کہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا لیکن دنیا والوں نے کچھ اور ہی دیکھا اور سمجھا۔ جن لوگوں نے بھی بالکونی میں وہ منظر دیکھا تھا ان کا خیال یہی تھا کہ فرید نے شگفتہ کو دھکا دے کر اوپر سے نیچے گرایا تھا۔ اور وہ ایسا خیال کرنے میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ اس منظر کو دیکھ کر یہی رائے قائم کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس فرید کو گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔

ان میں سے بہت سی باتیں تو مجھے ملزم کے بھائی قدیر احمد نے ہی بتا دی تھیں اور کچھ نہایت ہی اہم باتیں مجھے اس وقت معلوم ہوئیں جب میں قدیر کی درخواست پر فرید سے ملنے تھانے پہنچا۔ میرے سوال جواب کے نتیجے میں اس نے بہت سی باتیں مجھے بتائی تھیں۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں نے فرید کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ واقعی بے گناہ تھا۔ ایک اتفاقی حادثے میں خواہ مخواہ پھنس گیا تھا۔

حوالات سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے فرید احمد سے پوچھا۔ "کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ مخبر کون ہے جو آپ کی مرحومہ بیوی کو آپ کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاعات پہنچاتا رہا تھا؟"

وہ مایوسی سے بولا۔ "میں کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں لگا سکا اور میری اسی ناکامی نے مجھے آخر اس حال کو پہنچا دیا ہے۔"

"آپ کے دفتر میں...... میرا مطلب ہے ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کل کتنے افراد کام کرتے ہیں؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

وہ بولا۔ "میرے علاوہ میری سیکریٹری فوزیہ‘ جنرل منیجر طیب حسین جو منیجمنٹ کے ساتھ ساتھ اکاؤنٹس کے معاملات کو بھی سنبھالتے ہیں‘ چپراسی مقصود علی اور چوکیدار جبل خان ہے۔ اس کے علاوہ شوٹنگ یونٹ ہے جو اشتہاری فلمیں بناتے ہیں۔ یہ چار افراد کا یونٹ ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آج جس وقت یہ واقعہ پیش آیا‘ آپ کے اسٹاف کے کون کون سے افراد دفتر میں موجود تھے؟"

فرید نے بتایا۔ "شوٹنگ یونٹ تو دو روز سے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ میری سیکرٹری فوزیہ اپنے کمرے میں موجود تھی جبکہ جنرل منیجر لنچ کرنے دفتر سے باہر گیا ہوا تھا۔ چپراسی اور چوکیدار کے بارے میں‘ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ جب روحی میرے کمرے میں آئی تھی اس کے بعد سے میں ذہنی طور پر بہت الجھ گیا تھا۔"

"آپ کا منیجر طیب حسین کتنے بجے لنچ کرنے گیا تھا؟"

"لگ بھگ تین بجے۔"

"کیا اس وقت روحی آپ کے دفتر میں آ چکی تھی؟"

"جی، پہلے روحی آئی تھی۔" فرید نے بتایا۔ "پھر شگفتہ کا فون آ گیا کہ وہ گلشن اقبال اپنی آنٹی سلمیٰ کے پاس جا رہی ہے۔ اس کے بعد انٹرکام پر طیب نے مجھے بتایا کہ وہ لنچ کرنے دفتر سے باہر جا رہا ہے اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شگفتہ آن دھمکی تھی۔"

"کیا آپ کا منیجر روزانہ لنچ کرنے دفتر سے باہر جاتا ہے؟"

"نہیں، ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔" فرید نے بتایا۔ "اور جب ایسا ہوتا ہے تو میں اکثر اس کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔"

"لیکن آج وہ اکیلا ہی باہر لنچ کرنے گیا تھا؟"

"جی، میں اس وقت روحی کو سمجھانے بجھانے میں مصروف تھا۔" فرید نے بتایا۔ "اس لیے میں نے طیب سے زیادہ بات نہیں کی۔"

"آپ کا یہ منیجر کیسا آدمی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ٹھیک ٹھیک آدمی ہے۔" اس نے جواب دیا "مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں رہی۔ میرے بھروسے کا بندہ ہے۔ شگفتہ کا رشتے میں کزن لگتا ہے۔"

"کیا مخبر کے حوالے سے طیب حسین پر شک کیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے، وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سلسلہ سوالات ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر رخصت ہونے سے پہلے میں نے اسے پولیس کی "مہمان داری" سے محفوظ رہنے کے چند آزمودہ کار نسخے بتائے اور کہا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کل پولیس آپ کو عدالت میں پیش کرے گی تو میں اس وقت آپ کی ضمانت کروانے کی کوشش کروں گا۔"

"کیا میری ضمانت ہو جائے گی؟"

"انشاء اللہ۔"

وہ پرامید نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں قدیر کے ساتھ تھانے سے باہر آ گیا۔ حوالات میں فرید سے ملاقات سے پہلے میں تھانے دار سے مل چکا تھا اور کیس کی ابتدائی صورت حال میرے علم میں آ چکی تھی۔ یہ صورت حال میرے موکل کے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ دفتر کے چوکیدار اور منیجر موصوف کا بیان سراسر فرید کے خلاف جاتا تھا۔ میں نے حوالات میں فرید کو دانستہ یہ بات نہیں بتائی تھی تاکہ وہ خواہ مخواہ خود کو ہلکان نہ کرتا پھرے۔

تھانے سے باہر آنے کے بعد قدیر نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! اس کیس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔ "ابھی تو میں نے کیس ہاتھ میں لیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ پولیس کل صبح فرید کو عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ لینے کی کوشش کرے گی۔ اس موقع پر آپ کا عدالت میں

موجود ہونا ضروری ہے اور ہاں، کچھ رقم بھی ساتھ لے آئیے گا۔ ضمانت کے لیے مچلکوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"وہ تو آپ فکر نہ کریں۔ میں اس پروسس سے اچھی طرح واقف ہوں۔" قدیر نے کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ کل عدالت ہی میں ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا پھر اضافہ کیا۔ "ایک بات ذہن میں رکھیں قدیر صاحب۔ آپ کے بھائی کی بریت کے لیے رقم کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنا وقت بھی صرف کرنا پڑے گا۔ میری ہدایات کے مطابق مختلف محاذوں پر آپ کو بھاگ دوڑ کرنا ہوگی۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

آئندہ روز پولیس نے ملزم فرید احمد کو ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے عدالت میں پیش کیا۔ میں اس سے پہلے ہی اپنا وکالت نامہ اور اپنے موکل کی ضمانت کی درخواست دائر کر چکا تھا۔

استغاثہ نے درخواست کی سختی سے مخالفت کی۔ اس کا موقف تھا کہ ابھی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ موصول نہیں ہوئی تھی پھر یہ کہ دو افراد نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو اپنی بیوی کو بالکونی سے دھکا دے کر نیچے گراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دو عینی گواہ چوکیدار جبل خان اور جنرل منیجر طیب حسین تھے۔ فرید کو طیب کے بیان پر حیرت تھی مگر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ میں اپنی کوشش کے باوجود اس صورتِ حال میں اپنے موکل کی ضمانت نہ کروا سکا۔ عدالت نے پولیس کی ریمانڈ کی درخواست منظور کر لی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو قدیر نے کہا۔ "بیگ صاحب! یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "قتل کے ملزم کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب ایک چھوڑ دو عینی شہادتیں موجود ہوں۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا ہوگا۔"

"میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آپ سے میں ذرا دیر بعد میں بات کرتا ہوں۔ آپ ادھر پارکنگ ایریا میں میری گاڑی کے پاس پہنچیں۔"

اس کا جواب سنے بغیر میں فرید احمد کی جانب بڑھ گیا۔ پولیس اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی تھی۔ اس کی ہتھکڑی کا دوسرا سرا ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں تھا اور انکوائری افسر بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔

میں ان کے قریب پہنچ کر گلے کی پوری قوت سے کھنکارا تو وہ تینوں پلٹ کر میری جانب دیکھنے لگے۔ انکوائری افسر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے وکیل صاحب! ہمارا تعاقب کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اگر میں واقعی تعاقب کر رہا ہوتا تو پھر کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس نہ دلاتا۔"

"تو پھر جناب کے کیا ارادے ہیں؟" وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''ارادہ تو خاصا نیک ہے اور نیت بھی صاف ہے اس لیے قوی امید ہے کہ منزل ضرور آسان ہو جائے گی۔''

''یہ لچھے دار باتیں عدالت کے کمرے میں ہی اچھی لگتی ہیں وکیل صاحب!'' وہ روکھے لہجے میں بولا ''یہاں تو مطلب کی بات کریں۔''

میں نے کہا۔ ''قبلہ! مجھے تو آپ لچھے دار باتیں عدالت کے کمرے تک موقوف رکھنے کی تلقین کر رہے ہیں اور خود یہاں پر خالص تھانے کی زبان بول رہے ہیں۔ یعنی مطلب کی بات کریں وغیرہ۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے ایک آنکھ دبائی۔

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! پولیس پر مختلف قسم کے الزامات لگانا تو اب فیشن بن گیا ہے اور رشوت خوری کا الزام تو ان میں سر فہرست ہے۔''

''ارررے...... میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اب آپ منہ ہی سے کہہ رہے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں ویسے ''مطلب کی بات کریں'' کا کچھ اور مفہوم بھی تو نکالا جا سکتا ہے۔''

''میں بخوبی سمجھتا ہوں' آپ کون سے چینل سے بول رہے ہیں۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا ''ویسے ایک بات بتا دوں وکیل صاحب! آپ لوگ بھی ہم سے کچھ ہاتھ آگے ہی ہیں۔ کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ اکثر وکیل الفاظ کی الٹ پلٹ اور چرب زبانی سے مجرموں کو بے گناہ اور بے گناہوں کو مجرم ثابت کر دیتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہوگا لیکن میرا ذاتی تجربہ اس سے مختلف ہے۔ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔''

وہ بولا ''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ جس طرح ایک وکیل' مجرم کو بے گناہ ثابت کر کے اپنی فیس کھری کرتا ہے تو اس کی وہ فیس رشوت کی صورت اختیار کر جاتی ہے بالکل اسی طرح ہمارے محکمے کی چند کالی بھیڑیں بھی اپنے کرتوتوں سے پورے ڈیپارٹمنٹ کو بدنام کرتی ہیں۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو باقاعدہ ایک سازش کے تحت بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

''اچھا جی۔'' میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں پھر پوچھا۔ ''اور یہ سازش کون کر رہا ہے؟''

وہ لاتعلقی سے بولا۔ ''جائیں جی' اپنا کام کریں۔ خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو اپنا کام کرنے ہی یہاں آیا تھا لیکن آپ نے خود ہی رشوت اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس میں میری کیا خطا ہے۔''

''آپ کو ہم سے کیا کام ہے؟''

میں نے ہتھکڑی لگے فرید احمد کی جانب اشارہ کیا اور کہا۔ ''مجھے آپ سے نہیں بلکہ اپنے موکل

سے دو باتیں کرنا ہیں۔''

''ملزم اس وقت ریمانڈ پر ہے۔'' وہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اپنی تفتیش مکمل کر کے چالان پیش کرنے دیں پھر دو چھوڑ چار باتیں کر لیجیے گا۔ ابھی تو معاف ہی کریں۔''

میں نے کہا۔ ''میں فرید احمد کا وکیل ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ تھانے آ کر بھی میں اس سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ خود کو اور مجھے اس زحمت سے بچا لیں۔ میں اپنے موکل کا زیادہ وقت نہیں لوں گا زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ...... بس۔''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے۔''

میں نے فرید احمد کے کان میں سرگوشی کی۔ ''آپ اپنے منیجر کو بہت قابل بھروسا سمجھتے تھے۔ اس نے تو اپنا رنگ دکھایا ہے۔ اب مجھے نئے سرے سے محنت کرنی ہوگی۔ آپ مجھے روحی کا ایڈریس بتائیں۔ وہ میرے لیے خاصی معاون ثابت ہوگی۔''

وہ پریشان ہو گیا۔ ''آپ روحی کو اس معاملے میں نہ ہی گھسیٹیں تو اچھا ہے۔''

''میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ہم روحی کو نظر انداز کر دیں گے تو اس سے بات ختم نہیں ہوگی۔ استغاثے میں اس کا ضرور تذکرہ ہوگا۔ آپ جانتے ہیں وہ اس واقعے کا اہم کردار ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ میں پہلی فرصت میں اس سے مل لوں۔ ممکن ہے اس کی گواہی یا اس کی فراہم کردہ معلومات ہمارے حق میں ثابت ہوں۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔'' فرید نے کہا پھر سرگوشیانہ انداز ہی میں اس نے روحی کے گھر کا ایڈریس مجھے سمجھا دیا۔ روحی پی آئی بی کالونی میں رہتی تھی۔

اسی وقت انکوائری افسر نے آواز لگائی۔ ''وکیل صاحب! پانچ منٹ پورے ہو گئے ہیں۔ اب ہماری جان چھوڑیں۔''

میں نے با آواز بلند کہا۔ ''فرید صاحب! آپ کو پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹ لوں گا۔''

انکوائری افسر نے تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور فرید احمد کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ قریب ہی پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں سوار ہوئے اور گاڑی عدالت کے احاطے سے نکل گئی۔ میں پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے دس منٹ قدیر احمد کے ساتھ گزارے' اسے مختلف ہدایات دیں کہ کس کس شخص کے بارے میں اسے کس قسم کی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ ان میں سر فہرست فرید احمد کے جنرل منیجر طیب حسین کا نام تھا۔ قدیر نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا پھر وہ اپنی گاڑی میں رخصت ہو گیا۔

میں ایک دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

❀❀❀

پی آئی بی کالونی میں ٹاپ ماڈل روحی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ایک مڈل کلاس گھر میں رہتی تھی۔ میری دستک کے جواب میں روحی کی والدہ ثریا بیگم نے دروازہ کھولا۔ جب میں نے بتایا کہ میں روحی سے ملنے آیا ہوں تو اس نے کہا۔

''روحی تو اس وقت گھر میں نہیں ہے۔''

''وہ کہاں گئی ہیں اور کب تک آئیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کہاں گئی ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے۔'' ثریا بیگم نے جواب دیا۔ ''ہاں' جلد آنے کا کہہ کر گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے' جب تک روحی بی بی آئیں' آپ ہی سے باتیں ہو جائیں۔ کیا آپ کے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟''

قصہ مختصر مجھے ثریا بیگم کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اپنا پورا تعارف کروانا پڑا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں فرید احمد کا وکیل ہوں تو وہ جلدی سے مجھے اندر لے گئی اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر بولی۔

''بیگ صاحب! بات یہ ہے کہ ہمیں بھی اس واقعے کا علم ہو گیا ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ روحی کسی بھی حوالے سے اس کیس میں ملوث ہو۔''

''فرید صاحب بھی یہی چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کیا ایسا ممکن ہو سکے گا۔ مجھے نہیں امید کہ استغاثہ روحی کو نظر انداز کر دے گا پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا روحی بھی خاموش رہنا پسند کرے گی؟''

وہ روحی کی ماں تھی اس لیے میں کھل کر اس سے بات نہیں کر سکتا تھا' دراصل میں ثریا بیگم کی توجہ اس خاص پوائنٹ کی جانب مبذول کروانا چاہتا تھا جس کی بنا پر روحی فرید کو جلد از جلد شادی کے لیے اصرار کر رہی تھی مگر مجبوری یہ تھی کہ میں ایک لڑکی کی ماں سے اس موضوع پر واضح گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا اس بارے میں روحی نے اپنی والدہ کو کچھ بھی نہ بتایا ہو۔

میرے سوال کے جواب میں ثریا نے کہا۔ ''میں نے روحی کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب وہ بھی اس بات کے لیے تیار ہے کہ ہمیں فرید احمد کے کیس سے بالکل لاتعلق ہی رہنا چاہیے۔''

''کیا واقعی روحی ایسا چاہتی ہے؟'' میں نے حیرت آمیز نظر سے ثریا بیگم کو دیکھا۔

''ہاں ہاں۔'' وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولی۔ ''اس میں حیرت کی ایسی کیا بات ہے؟''

میں نے غیر یقینی انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ اسی اثنا میں بیرونی دروازے پر اطلاعی گھنٹی کا بٹن

دبایا گیا۔ گھر کے اندر دھیمے سروں کی گھنٹی گنگنائی تو ثریا بیگم نے کہا ''لگتا ہے' روحی آ گئی۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ثریا دروازہ کھولنے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ روحی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر ہمارے درمیان فرید احمد کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی جب مجھے روحی کی زبانی بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ اس کیس سے قطعی لاتعلق رہنا چاہتی ہے تو حیرت کے ساتھ ساتھ مجھے کچھ شک بھی گزرا۔ میں نے ثریا بیگم سے کہا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پانچ دس منٹ کے لیے روحی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ فراخ دلی سے بولی۔ ''آپ دونوں باتیں کریں' میں چائے پانی کا انتظام کرتی ہوں۔''

''اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے ثریا صاحبہ۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا لیکن وہ اس وقت تک ڈرائنگ روم سے باہر نکل چکی تھی۔

''آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' روحی نے سوال کیا۔

میں ایک لمحے تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے روحی کو دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ''کیا واقعی آپ اس کیس سے لاتعلق رہنا چاہتی ہیں؟''

''ہاں واقعی۔''

میں نے کہا۔ ''فرید احمد نے مجھے آپ کے اور اپنے تعلقات کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ اگر آپ واقعی اس کیس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں تو اس ''وجہ'' کا کیا ہوگا جس کے حوالے سے آپ فرید احمد کو جلد از جلد شادی کے لیے آمادہ کر رہی تھیں؟''

میں نے ڈھکے چھپے انداز میں ساری بات کہہ دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''اب یہ کوئی ایسا سنگین مسئلہ نہیں رہا۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک اٹھا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ نے اس مسئلے کو حل کر لیا ہے؟''

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''بیگ صاحب! آپ فرید احمد کے وکیل ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ انہیں باعزت رہا کروانے میں کامیاب ہو جائیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ان سے ایک جھوٹ بولا تھا...... سنگین جھوٹ۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ آسانی سے مجھے اپنائیں گے لہٰذا میں نے انہیں حاصل کرنے کے لیے وہ قصہ گھڑا تھا جب کہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا بعد میں میرے ضمیر نے مجھے بہت ملامت کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ فرید صاحب کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس سے پہلے ہی

وہ گرفتار ہو کر تھانے پہنچ گئے۔ یہ راز میری روح پر ایک بوجھ ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ پہلی ملاقات میں فرید صاحب کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیں۔ میں اب بھی انہیں بے پناہ چاہتی ہوں اور ان کی رہائی کی بے چینی سے منتظر ہوں۔'' بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے کہا۔''روحی صاحبہ! اگر آپ کو واقعی فرید صاحب سے ہمدردی ہے تو وعدہ کریں اگر کسی بھی مرحلے پر ان کو آپ کی مدد کی ضرورت پڑی تو آپ پیچھے نہیں ہٹیں گی۔''

''ٹھیک ہے' میں وعدہ کرتی ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''اب آپ بھی ان کو یہ راز کی بات بتا دیجیے گا۔''

میں نے کہا۔''میرا خیال ہے' یہ بات آپ خود ان کو بتائیں۔''

''مجھ میں ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے' آپ کی طرف سے یہ فریضہ میں پورا کر دوں گا۔'' میں نے کہا۔''آپ ضروری تعاون کے لیے تیار رہیے گا۔''

''میں ہر وقت تیار ہوں۔'' وہ تیقن سے بولی۔

چائے پینے کے بعد میں ثریا بیگم کے گھر سے رخصت ہو گیا۔

❀❀❀

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ اس کے بعد چند ماہ تک یونہی تاریخیں پڑتی رہیں۔ کوئی قابل ذکر کارروائی نہ ہو سکی۔ بالآخر تین ماہ بعد گواہوں کے بیانات کی باری آئی۔ استغاثہ کی جانب سے تقریباً دس گواہوں کی فہرست عدالت میں داخل کی گئی تھی لیکن یہاں میں چند اہم گواہوں کے بیانات کا ذکر کروں گا۔

استغاثہ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ملزم فرید احمد نے دیدہ و دانستہ اپنی بیوی کو بالکونی سے دھکا دے کر ہلاک کیا تھا۔ استغاثہ کے موقف کے مطابق ملزم کا سب کچھ اس کی بیوی کے نام تھا۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسی' گھر و دیگر مال و جائیداد پر صرف اور صرف مقتولہ شگفتہ کو اختیار تھا چنانچہ ملزم نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی بیوی کو قتل کر دیا تاکہ اس کی موت کے بعد وہ ہر چیز کا مالک بن جائے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ شگفتہ کی موت سر کے پاش پاش ہو جانے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ اس سنگین ٹوٹ پھوٹ کے علاوہ بھی اسے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ موت کا وقت سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔

ایک بات میرے لیے شدید حیرت کا باعث تھی اور وہ بات یہ تھی کہ استغاثہ میں کہیں روحی کا ذکر نہیں تھا حالانکہ وہ اس کیس کا ایک بنیادی کردار تھی۔ معلوم نہیں استغاثہ نے اسے کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں اس کی کوئی وجہ نہ آئی۔ مجھے یہ بات انتہائی بے تکی اور غیر معمولی لگی تھی۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے دفتر کا چپراسی گواہوں کے لیے پیش ہوا۔ چپراسی مقصود احمد نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے آگے بڑھا۔ وکیل استغاثہ نے نہایت ہی مختصر جرح کی۔

''مقصود احمد۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''تم کافی عرصے سے اس دفتر میں ملازم ہو۔ اپنے صاحب اور بیگم کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میرا مطلب ہے ان کے باہمی تعلقات کے بارے میں؟''

یہ ایک انتہائی بے تکا سوال تھا۔ گواہ مقصود احمد نے جواب دیا۔''جناب! دونوں میاں بیوی میں خاصی کشیدگی پائی جاتی تھی۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ رٹا رٹایا جواب دے رہا تھا' اس سے وکیل استغاثہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ملزم اور مقتولہ میں انڈراسٹینڈنگ نہیں تھی۔

''مقصود احمد! تم اس کشیدگی کی وضاحت کرو گے؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

گواہ بولا۔''جناب میرے خیال میں کشیدگی کی بنیادی وجہ ملزم کا آوارہ مزاج ہونا ہے۔''

وکیل استغاثہ نے اسی قسم کے دو چار سوالات کیے جن سے وہ یہ جتلانا چاہتا تھا کہ ملزم کوئی اچھے کردار کا مالک نہیں تھا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لیے آگے بڑھا اور کٹہرے میں موجود گواہ مقصود احمد کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ وہ میرے گھورنے سے خاصی بے چینی محسوس کر رہا تھا بالآخر میں نے سوال کیا۔

''مقصود احمد! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ دونوں میاں بیوی میں خاصی کشیدگی پائی جاتی تھی۔ کیا تم اس کشیدگی کی وجہ بیان کرو گے؟''

وکیل استغاثہ نے بیچ میں چھلانگ لگائی۔''میرے محترم دوست! لگتا ہے' آپ کا ذہن کسی اور مقام پر ہے۔ اگر آپ یہاں عدالت کے کمرے میں ذہنی طور پر موجود ہوتے تو آپ یہ سوال نہ کرتے کیونکہ معزز گواہ اس سوال کا جواب دے چکا ہے...... یعنی وہ مقتولہ اور ملزم کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کی وجہ بتا چکا ہے۔''

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔''تھینک یو مائی ڈیئر۔ اس یاد دہانی کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس سے پوچھا۔''کیا قانون میں ایسی کوئی شق موجود ہے کہ میں گواہ سے وہ سوال نہیں کر سکتا جو پہلے آپ کر چکے ہوں؟ ذرا یہ بھی بتاتے چلیں تاکہ میرے علم میں اضافہ ہو۔''

وہ میری چوٹ پر شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے سوالیہ نظر سے جج کی جانب دیکھا' جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کر دیا۔ میں نے گواہ کے سامنے اپنا سوال دہرایا۔

وہ بولا۔ ''ان دونوں کے مابین کشیدگی کی وجہ ملزم کا آوارہ مزاج اور بدچلن ہونا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مقصود احمد! اگر تو آپ سنی سنائی کہہ رہے ہیں تو یہ میرے موکل پر بہتان ہوگا اور اگر آپ اپنے بیان میں واقعی سچے ہیں تو پھر آپ کو اس کا کوئی ثبوت دینا ہوگا۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ ملزم کے اردگرد ہر وقت لڑکیوں اور عورتوں کا میلا سا لگا رہتا تھا اور ان میں سے اکثر اچھے کردار کی مالک نہیں ہوتی تھیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کا میل جول بری عورتوں سے تھا؟''

''جی بالکل، شریف عورتوں کا شوبزنس میں کیا کام۔''

''گویا آپ کے فارمولے کے مطابق جو عورتیں شوبزنس سے تعلق نہیں رکھتیں، وہ سب اچھی عورتیں ہوتی ہیں؟''

''اس میں کیا شک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شوبزنس کا شعبہ ہی دراصل ساری خرابی کی جڑ ہے؟''

وہ آہستہ آہستہ میرے جال میں آ رہا تھا، جلدی سے بولا۔ ''بالکل درست فرمایا آپ نے۔''

میں نے کہا۔ ''مقصود صاحب! آپ بھی اسی شعبے سے متعلق ہیں۔ آپ ایک ایسے ادارے میں ملازمت کر رہے ہیں جہاں آپ کے خیال میں شریف لوگوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر بقول آپ کے، آپ ایک برے انسان ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟''

وہ سٹ پٹا گیا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ نوکری تو میری مجبوری ہے۔ میرا شوبزنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جس پیشے کو آپ غلط سمجھتے ہیں، وہاں نوکری کرنا آپ کی مجبوری کیوں بن گیا۔ آپ ایک چپراسی کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ یہ ملازمت تو کسی بھی دفتر میں آپ کو مل سکتی ہے پھر برے لوگوں کی صحبت میں آپ کیا کر رہے ہیں...... اور وہ بھی ایک طویل عرصے سے؟''

اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، جلدی سے بولا۔ ''آپ تو خواہ مخواہ بال کی کھال نکال رہے ہیں ورنہ میں نے تو ایک عام سی بات کی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کا ڈرائنگ روم نہیں بلکہ معزز عدالت کا کمرا ہے، یہاں اپنے منہ سے ہر لفظ سوچ سمجھ کر نکالیں ورنہ لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ کسی لغزش کی بنا پر آپ پر مقدمہ بھی بن سکتا ہے۔''

وہ سراسیمہ نظر آنے لگا۔ جج نے بھی اسے تنبیہہ کی۔ ''مقصود احمد! اپنے ذاتی خیالات اور نظریات کو بیان کرنے میں عدالت کا وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے بیان کو واقعات اور حقائق تک محدود رکھو۔ جس بات کا تم ثبوت پیش نہیں کر سکتے، اس کا یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مقصود احمد! تم کتنے عرصے سے ملزم کے دفتر میں

کام کر رہے تھے؟''

''تقریباً چار سال سے۔''

''کیا تم دفتر تک ہی محدود تھے یا تمہارا ملزم کے گھر بھی آنا جانا تھا؟''

''میری ڈیوٹی صرف دفتر کی حد تک ہی تھی۔''

''پھر تم اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ دونوں میاں بیوی کے درمیان باہمی تعلقات خوش گوار نہیں تھے یعنی ان کے بیچ کشیدگی کی پائی جاتی تھی؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اکثر انہیں لڑتے جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''یعنی دفتر میں لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیونکہ تم ان کے گھر تو جاتے ہی نہیں تھے۔''

''جی ہاں، میں نے انہیں دفتر میں نوک جھوک کرتے دیکھا تھا۔''

''نوک جھوک اور لڑائی جھگڑے میں بہت فرق ہوتا ہے مسٹر مقصود احمد۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیں اور یہ بھی بتائیں کہ کیا وہ دونوں آپ کے سامنے لڑائی جھگڑا کرتے تھے یا آپ چھپ چھپ کر انہیں دیکھا کرتے تھے؟''

وہ میرے پے در پے سوالات سے گھبرا گیا، الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ جو بھی سمجھ لیں۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔''

جج نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ''مسٹر مقصود! عدالت کے وقار کا خیال رکھو۔ عدالت کو تمہارے بے سروپا خیالات سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ٹو دی پوائنٹ جواب دو۔''

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے کبھی انہیں لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ بس ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔''

''اس سے پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں آپ نے بتایا ہے کہ آپ نے خود دفتر میں انہیں لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ اب آپ اپنے موقف سے پھر رہے ہیں۔ آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟''

وہ میری جرح سے بری طرح نروس ہو رہا تھا۔ پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میرا دوسرا بیان درست ہے۔''

''اس کا مطلب ہے پہلے آپ نے جھوٹ بولا تھا؟''

''بس جی غلطی ہو گئی۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے ویسا ہی سن رکھا تھا۔''

جج نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ پوری احتیاط سے جواب دینا ورنہ عدالت تمہاری گواہی کینسل کر دے گی۔''

وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوال کیا۔ ''مقصود احمد! آپ نے میرے موکل کو آوارہ مزاج

کہا ہے۔آپ کے پاس اس کی آوارہ مزاجی کا کوئی ثبوت ہے؟''

''ثبوت تو کوئی نہیں ہے جی۔'' وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔''پہلے تو آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ ملزم کی آوارگی اور بدکرداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ ہر وقت لڑکیوں اور عورتوں میں گھرا رہتا ہے۔اب آپ اپنے بیان کی تردید کر رہے ہیں۔یہ کیا ماجرا ہے؟''

وکیل استغاثہ اس موقع پر بڑی غضب ناک نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔اس کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا جاتا۔میں نے وکیل استغاثہ کو نظرانداز کرتے ہوئے مقصود احمد سے پوچھا۔''آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''بس جی' میرا خیال یہی ہے کہ ملزم کا خراب عوتوں سے ملنا جلنا تھا۔میں یہ بات ثابت نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا۔''اور تمہارے اس خیال کی وجہ وہی سنی سنائی باتیں ہیں جن کا تھوڑی دیر پہلے تم نے ذکر کیا تھا؟''

''یہی سمجھ لیں جناب۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔''مقصود علی! تم چار سال سے ملزم فرید احمد کے دفتر میں ملازم ہو۔اس عرصے کے دوران میں وہاں آنے والی ماڈل لڑکیوں اور عورتوں کو تم اچھی طرح پہچانتے ہو گے؟''

''اکثر آنے والیوں کے چہروں سے واقف ہوں جناب'' تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''ایک ڈیڑھ سال پہلے تک ایک ٹاپ ماڈل روحی بھی اس دفتر میں بڑے تواتر سے آیا کرتی تھی۔تم اس کی صورت سے تو یقیناً آشنا ہو گے۔''

''جی ہاں' میں روحی بی بی کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے کہا۔''تقریباً ڈیڑھ سال پہلے روحی نے تمہارے دفتر آنا چھوڑ دیا تھا۔اس کی وجہ بتا سکتے ہو؟''

گواہ نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر بولا۔''میں اس کی وجہ نہیں جانتا جناب۔''

میں نے اچانک سوال کیا۔''وقوعہ کے روز بھی روحی بی بی تمہارے دفتر آئی تھی؟''

''جی ہاں' آئی تھی۔''

''کتنے بجے؟''

''تقریباً تین بجے۔'' وہ روانی میں بول گیا۔''صحیح وقت مجھے یاد نہیں ہے۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے فاتحانہ انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا۔''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

مقصود احمد کٹہرے سے نکلا تو اس کا پورا چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔اس کے بعد ایک راہگیر منیر شگفتہ گواہی کے لیے کٹہرے میں آیا۔سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے مختصر سا بیان نوٹ کروایا۔اس کے مطابق جب وہ واقعہ پیش آیا اس وقت وہ اس عمارت کے عین نیچے سے گزر رہا تھا اور جنگ عظیم کی نشانی وہ پھٹیچر ٹرک اس سے چند قدم آگے تھا۔اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے اس سے صرف ایک سوال کیا۔

''منیر شگفتہ صاحب! آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو مقتولہ کو بالکونی سے دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں اپنی جرح کے لیے آگے بڑھا اور جج کی اجازت سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔''منیر شگفتہ صاحب! آپ کے نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟''

اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔''میرا مطلب ہے' شگفتہ اس کیس کی مقتولہ کا نام ہے۔میرے علم کے مطابق آپ کا مقتولہ شگفتہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔کیا میری معلومات درست ہیں؟''

''جی' آپ کا خیال درست ہے۔'' وہ کراری آواز میں بولا۔''میں تو بس اتفاق سے وہاں سے گزر رہا تھا اور نہ میرا ملزم یا مقتولہ سے کوئی تعلق یا رشتہ ناتا نہیں ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔''اور اس سے پہلے کہ آپ پھر کوئی سوال میرے نام کے بارے میں کریں' میں آپ کو بتاتا چلوں کہ میں باقاعدہ شاعری کرتا ہوں اور شگفتہ میرا تخلص ہے۔''

میں نے کہا۔''شگفتہ صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے سوال جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو مقتولہ کو بالکونی سے دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''جی ہاں' میں نے یہی جواب دیا ہے۔''

میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''شگفتہ صاحب! آپ کی آنکھوں پر جو چشمہ نظر آ رہا ہے' وہ دور کا ہے یا نزدیک کا؟''

''یہ دور کا چشمہ ہے۔''

''اس کا نمبر کیا ہے؟''

وکیل استغاثہ کو مداخلت کا موقع مل گیا' وہ جلدی سے بولا۔''مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔وکیل صفائی ایک غیر متعلق سوال کر رہے ہیں۔گواہ کے چشمے کا موجودہ کیس سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔''جناب عالی! گواہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے

میرے موکل کو اپنی بیوی یعنی مقتولہ کو بالکونی سے دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب گواہ آنکھوں سے دیکھنے کی بات کرتا ہے تو اس کا چشمہ بھی زیر بحث آئے گا کیونکہ وہ دور دیکھنے کا چشمہ ہے۔ اس صورت میں میرے خیال میں اگر چشمہ یا چشمے کا نمبر غیر ضروری اور غیر متعلق ہے تو پھر گواہ کی آنکھیں بھی اس کیس سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں کیونکہ ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ اسی چشمے کے توسط سے دیکھا تھا۔"

میرے وضاحتی بیان سے متاثر ہو کر جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے منیر شگفتہ کے سامنے اپنا سوال دہرایا۔ "ہاں تو شگفتہ صاحب! آپ کے چشمے کا نمبر کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "منفی چار۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں؟"

"کون سا دعویٰ؟" الٹا اس نے سوال کر دیا۔

میں نے کہا۔ "یہی دعویٰ کہ ملزم فرید احمد نے اپنی بیوی مقتولہ شگفتہ کو بالکونی سے دھکا دے کر نیچے گرایا تھا؟"

وہ ایک لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ "دیکھیں جناب! میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ یا طریقہ نہیں ہے کہ میں اپنے بیان کو ثابت بھی کر سکوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا، وہ بیان کر دیا ہے۔ مجھے یہی لگا تھا جیسے بالکونی میں کھڑے ایک شخص نے ایک عورت کو نیچے گرا دیا ہو کیونکہ اس شخص کے ہاتھوں اور گرنے والی عورت کے جسم کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "یعنی آپ نے ملزم فرید احمد کو باقاعدہ اپنے ہاتھوں سے مقتولہ کے جسم کو بالکونی سے نیچے دھکیلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟"

"میں نے بتایا ہے نا، میں نے پہلی نظر میں یہی محسوس کیا تھا کہ اس عورت کو بالکونی میں کھڑے مرد نے دھکا دیا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ آگے کو پھیلے ہوئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "ممکن ہے، وہ ہاتھ، نیچے گرنے والی عورت کو بچانے کے لیے پھیلے ہوئے ہوں؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "شگفتہ صاحب! جب آپ نے وہ منظر دیکھا، کیا اس وقت آپ پہلے سے مذکورہ بالکونی کی طرف دیکھ رہے تھے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں دراصل اس وقت ایک ہورڈنگ پڑھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ اس بالکونی کی جانب مڑ گئی۔"

"اور آپ کو یوں لگا جیسے بالکونی میں موجود ایک مرد نے کسی عورت کو نیچے پھینک دیا ہے؟"

"جی ہاں، مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے آپ اس منظر سے پہلے کے واقعات سے قطعی نابلد ہیں یعنی مقتولہ کے بالکونی سے نیچے گرنے سے پہلے وہاں کیا واقعات پیش آئے؟"

"میں یہ کیسے جان سکتا ہوں!"

ایک دو مزید سوالات کے بعد میں نے جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد جنگ عظیم کی نشانی مذکورہ ٹرک کا ڈرائیور قادر لالہ بیان دینے آیا۔ اس کا بیان بھی نہایت ہی مختصر تھا۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا بلکہ کسی چیز کے اپنے ٹرک کے اوپر گرنے کی آواز سنی تھی پھر جب اس نے آس پاس لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے اسے ٹرک روکنے کو کہتے سنا تو وہ ٹرک روک کر باہر آ گیا۔ تب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ ایک انسانی جان اس ٹرک کے سامان سے ٹکرا کر ضائع ہو چکی ہے۔"

قادر لالہ کے بیان اور وکیل استغاثہ کی اس پر جرح میں کوئی قابل ذکر یا اہم بات نہیں ہے اس لیے میں یہاں اس تذکرے سے صرف نظر کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا۔

اس کے بعد وکیل استغاثہ نے دفتر کے چوکیدار جبل خان کو بیان کے لیے پیش کیا۔ جبل خان نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں ایک طولانی بیان ریکارڈ کروایا۔ جبل خان بھی ان افراد میں شامل تھا جنہوں نے مقتولہ شگفتہ کو بالکونی سے نیچے گرتے دیکھا تھا۔ اس سلسلے میں اس کا بیان بھی کم و بیش منیر شگفتہ سے ملتا جلتا تھا۔ جس وقت وہ حادثہ پیش آیا، جبل خان باہر سڑک پر موجود تھا۔

جبل خان کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات پوچھتا رہا۔ مقصد ایک ہی تھا کہ اس نے بھی دیکھا تھا کہ ملزم نے اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گرا دیا تھا۔ وکیل استغاثہ کی جرح ختم ہوئی تو میں آگے بڑھا۔ جبل خان والے کٹہرے کے پاس آ کر میں نے کہا۔

"جبل خان صاحب! کیا میں آپ کو صرف خان صاحب کہہ سکتا ہوں؟"

"او یارا کیوں نہیں کہہ سکتا۔ آپ ام کو خان صیب بول سکتا ہے وکیل صیب۔"

میں نے کہا۔ "خان صاحب! آپ کو ملزم کے دفتر میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"ام ایدرا ابھی نیا آیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کوئی تین مہینہ پہلے وکیل صاحب۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کا صاحب کیسا آدمی تھا؟"

"امارے ساتھ تو اچھا ہی تھا۔"

میں نے کہا۔ "جس وقت وہ حادثہ پیش آیا اس وقت آپ کہاں تھے؟"

"ام اس وقت باہر سڑک پر تھا جناب۔"

"باہر سڑک پر آپ کیا کر رہے تھے؟"

وہ بولا۔ "ہم چھوٹے صیب کے لیے سگریٹ لینے گیا تھا۔"

"چھوٹے صیب کون؟"

"او یارا! اپنے چھوٹے منیجر طیب صیب۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "خان صاحب! جس وقت وہ حادثہ پیش آیا اس وقت دفتر میں چپراسی موجود تھا پھر آپ کیوں سگریٹ لینے چلے گئے۔ اس کی وضاحت کریں گے۔ آپ تو چوکیدار ہیں۔ آپ کی ڈیوٹی تو ذرا دوسری قسم کی ہوتی ہے...... سخت قسم کی ڈیوٹی۔"

وہ بولا۔ "وکیل صیب! وہ بات دراصل یہ ہے کہ ام اس وقت نماز پڑھنے مسجد جا رہا تھا تو دپتر میں کسی کا ہونا ضروری تھا اس لیے چھوٹے صاحب نے سگریٹ کے لیے بھی ام کو ہی بول دیا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ چھوٹے صاحب کے لیے کون سا سگریٹ خرید کر لائے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "گولڈ لیپ۔"

میں نے سوال کیا۔ "خان صاحب! آپ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں نا۔"

"جی! اللہ کے فضل سے ام پکا نمازی ہے۔"

"پھر تو آپ جھوٹ بھی نہیں بولتے ہوں گے۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "ام گردن کٹا سکتا ہے پر جھوٹ نہیں بول سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ آپ نے ملزم کو اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گراتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا واقعی آپ نے فرید احمد کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"سچا بات پوچھیں تو ام نے نہیں دیکھا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "امیں منیجر صاحب نے بتایا تھا۔"

"لیکن آپ نے اپنے بیان میں تو یہی کہا ہے کہ آپ نے خود دیکھا تھا؟"

"وکیل صیب! جب ام چھوٹے صیب کے لیے سگریٹ لے کر آیا تو چھوٹا صیب ایدر نیچے سڑک پر کھڑا تھا اور آس پاس بہت سے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ سب نے اس بوڑھے ٹرک کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ام نے منیجر صیب کو سگریٹ کا پیکٹ دیا اور اس شور شرابے کے بارے میں پوچھا تو اس نے امیں بتایا کہ بڑے صیب نے بیگم صاحبہ کو بالکونی سے نیچے گرا دیا ہے۔ بس! ام اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا جس کے تعزیے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ میں اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے خان صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خان صاحب! آپ کو ملزم کے دفتر میں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ "پھر بھی ان تین ماہ میں آپ نے ملزم کی ذات میں کوئی ایسی بات دیکھی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا کہ وہ عیاش اور بدکردار آدمی ہے؟"

"ام کسی پر خواہ مخواہ الزام لگانا گناہ سمجھتا ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ام نے

فرید صیب میں کوئی غلط قسم کا حرکت نہیں دیکھا۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کے عدالت برخاست کر دی۔ ہم عدالت سے باہر آئے تو میرے موکل کے بھائی قدیر احمد نے کہا۔

"بیگ صاحب! آپ زبردست جا رہے ہیں۔"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!"

وہ بولا۔ "مجھے امید ہو چلی ہے کہ بھائی صاحب باعزت بری ہو جائیں گے۔"

"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

"حالانکہ جب ان کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی تو میں خاصا مایوس ہو گیا تھا۔" قدیر نے کہا۔ "لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کیس پر ہماری گرفت ہر گزرتی پیشی کے ساتھ مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔"

"ہاں جناب! ایسا تو ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک بات کا میں شاید ذکر کرنا بھول گیا۔ روحی سے ملاقات کے بعد میں نے اپنے موکل کو روحی کے انکشاف کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی تھی اور جواباً روحی کی دل کھول کر تعریف بھی کی تھی حالانکہ وہ پہلے فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کیس میں کسی بھی مرحلے پر وہ روحی کو ملوث نہیں کرے گا لیکن میرے مشورے کے بعد وہ اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو تاکید کی تھی کہ وہ عدالت کے سامنے ایک ایک بات سچ سچ بتا دے اس طرح اس کیس میں ہمارا پلڑا بھاری رہے گا۔ فرید نے ایسا کرنے کا مجھے یقین دلایا تھا۔

اگلی پیشی سے پہلے قدیر نے میری ہدایت کے مطابق مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ اس سلسلے میں قدیر نے خاصی مستعدی اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا تھا اور کیوں نہ ہوتا...... معاملہ اس کے بڑے بھائی کا تھا جو ایک ناکردہ جرم کے چکر میں پھنس کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا تھا۔

آئندہ پیشی میں ابھی خاصے دن باقی تھے۔ میرے پاس کیس اسٹڈی کرنے کے لیے بہت وقت تھا۔ فرید احمد کی چونکہ ضمانت نہیں ہو سکی تھی اس لیے وہ جیل کسٹڈی میں چلا گیا تھا۔ اس دوران میں، میں دو مرتبہ جیل جا کر اس سے ملا بھی تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سلسلے میں مجھے اپنے ذاتی تعلقات بھی استعمال کرنے پڑے تھے۔

❀❀❀

منظر اسی عدالت کا تھا!

گواہوں کے کٹہرے میں ملزم کی سیکریٹری فوزیہ درانی کھڑی تھی۔ فوزیہ کی عمر کم و بیش ستائیس سال تھی۔ اس نے پھول دار شلوار قمیض زیب تن کر رکھا تھا۔ غالباً کسی عدالت میں حاضر ہونے کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا اس لیے خاصی گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا نہایت ہی مختصر مگر جامع بیان ریکارڈ کروایا پھر وکیل استغاثہ سوالات کے لیے آگے بڑھا۔

''مس فوزیہ! وقوعہ کے روز جو واقعات پیش آئے' ذرا ان پر روشنی ڈالیے۔''

فوزیہ نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت حسب معمول اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھی کہ اچانک چپراسی مقصود نے آ کر مجھے بتایا کہ باہر ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے جب تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ فرید صاحب نے اپنی بیگم کو بالکونی سے دھکا دے کر نیچے گرا دیا ہے اور وہ موقع پر ہلاک ہو گئی ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ ''جب آپ اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھیں تو اس وقت ملزم کے کمرے میں کون کون تھا؟''

''پہلے تو فرید صاحب اکیلے ہی تھے۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔ ''پھر بیگم صاحبہ بھی آ گئی تھیں۔''

''بیگم صاحبہ یعنی مقتولہ شگفتہ کتنے بجے دفتر پہنچی تھیں؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''میرا خیال ہے اس وقت سہ پہر کے سوا تین بجے تھے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''آپ نے اس روز مقتولہ کے رویے میں کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟''

''میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھی!''

''میرا مطلب ہے' کیا اس روز مقتولہ غصے میں وہاں پہنچی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ان کے انداز و اطوار سے کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی ہو؟''

فوزیہ نے جواب دیا۔ ''جی بالکل نہیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح نارمل انداز میں اس روز بھی آئی تھیں۔ ہماری باقاعدہ علیک سلیک ہوئی تھی پھر وہ فرید صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ مقتولہ کے آنے کے بعد ملزم کے کمرے میں ان دونوں کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوئی ہو گی؟''

''نہیں جناب! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

وکیل استغاثہ نے مزید چند سوالات پوچھنے کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ میں جج کی اجازت سے سوالات کے لیے آگے بڑھا۔ میں فوزیہ والے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہوا' کھنکار کر گلا صاف کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''فوزیہ صاحبہ! آپ کو ملزم کے دفتر میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''وکیل صاحب! معذرت کے ساتھ عرض کروں گی کہ اب میں اس دفتر

میں کام نہیں کرتی۔ عرصہ ہوا وہ دفتر بند ہو چکا ہے۔ اس واقعے کے بعد جب دفتر کھلنے کے کوئی امکانات نظر نہ آئے تو میں نے اپنی ملازمت کا دوسرا بندوبست کر لیا تھا۔''

''مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس واقعہ کو اب لگ بھگ آٹھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس حساب سے فوزیہ کا جواب بالکل درست تھا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مس فوزیہ! آپ میرے سوال کو یوں لیں...... آپ نے ملزم کے دفتر میں کتنا عرصہ کام کیا تھا؟''

اس نے جواب دیا ''کم و بیش تین ماہ۔''

''اوہ' یہ تو خاصا کم عرصہ ہے۔'' میں نے سرسری سے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ سے پہلے اس سیٹ پر کون تھا؟''

وہ بولا۔ ''مجھ سے پہلے اس پوسٹ پر انیتا نامی کوئی لڑکی کام کر رہی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو ان تین ماہ میں دفتر کا ماحول کیسا لگا؟''

''بالکل ٹھیک ٹھاک لگا تھا۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''مس فوزیہ! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتولہ سہ پہر سوا تین بجے دفتر پہنچی تھی؟''

''جی ہاں' میں نے یہی جواب دیا ہے۔''

''کیا آپ نے اس وقت گھڑی دیکھی تھی یا یہ محض آپ کا اندازہ ہے؟''

''میں نے اس وقت باقاعدہ گھڑی دیکھی تھی۔'' اس نے جواب دیا پھر بولی۔ ''اور آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتاتی چلوں کہ میری یہ عادت ہے کہ میں تھوڑی تھوڑی دیر میں گھڑی پر نگاہ ڈالتی رہتی ہوں۔''

مجھے اس کی بات میں صداقت نظر آئی کیونکہ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ وکیل استغاثہ کے سوالات کے جوابات دیتے ہوئے وہ بار بار دیوار گیر کلاک پر نظر ڈال رہی تھی۔ میں نے سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''مس فوزیہ! کیا ملزم کے سارے فون آپ ہی اٹینڈ کرتی تھیں؟''

اس نے بتایا۔ ''فرید صاحب کے پاس ایک بالکل علیحدہ فون سیٹ بھی تھا جس کا تعلق میرے فون سے نہیں تھا البتہ جو فون میرے استعمال میں تھا اس پر میں فرید صاحب کے لیے آنے والی کالیں اٹینڈ کر سکتی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں' وقوعہ کے روز دفتر آنے سے پہلے مقتولہ نے ملزم کو کوئی فون وغیرہ بھی کیا تھا؟''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز میں نے ان کا کوئی فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہاں' فرید صاحب کے پرسنل فون پر ان کی کوئی کال آئی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''فوزیہ صاحبہ! آپ نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز مقتولہ بالکل نارمل انداز میں دفتر آئی تھی اور آپ سے ان کی رسمی علیک سلیک بھی ہوئی تھی۔''

اس نے اثبات میں جواب دیا' میں نے پوچھا۔ ''آپ یہ بات بتا چکی ہیں کہ آپ کو معلوم نہیں دونوں میاں بیوی کے درمیان اندر بند کمرے میں کیا گفتگو ہوئی تھی۔ آپ کو چپراسی مقصود احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ ملزم نے اپنی بیوی کو بالکونی سے دھکا دے کر نیچے گرا دیا ہے اور وہ موقع پر ہلاک ہوگئی ہے۔ کیا میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔''

''جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ مقتولہ کتنا وقت فرید احمد کے کمرے میں رہی تھی؟''

میں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ عدالتی کارروائی کے دوران میں' میں نے ہر جگہ شگفتہ کا مقتولہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے تو یہ قانونی مجبوری ہے جب تک اس کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہوجاتا اس وقت تک استغاثہ کے مطابق فرید احمد ملزم اور شگفتہ مقتولہ ہی تھی۔ اگر میں فرید احمد کو بے گناہ ثابت کردیتا تو پھر شگفتہ متوفی ہوجاتی یعنی اس کی موت کا ذمے دار فرید احمد کو نہیں ٹھہرایا جاتا بلکہ اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دیا جاتا۔ خیر' یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے میرے موکل کی سابق سیکریٹری فوزیہ درانی نے بتایا۔ ''میرا خیال ہے' وہ تقریباً آدھا گھنٹا کمرے میں رہی ہوں گی کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے کہ جب چپراسی مقصود احمد کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میڈم شگفتہ کو بالکونی سے نیچے گرادیا گیا ہے تو حسب عادت میں نے گھڑی دیکھی تھی اور اس وقت پونے چار کا وقت ہوا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''فوزیہ صاحبہ! کیا آپ کو چپراسی کی بات کا فوراً یقین آ گیا تھا؟''

''یقین نہ آنے کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟'' وہ الٹا مجھ سے پوچھ بیٹھی۔ ''حقیقت کو بھلا کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ میڈم شگفتہ واقعی ہلاک ہوچکی تھیں۔''

''آپ میرا سوال سمجھ نہیں سکی ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا' میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ ''دراصل یقین آنے سے میری مراد یہ تھی کہ کیا آپ کو چپراسی کی اس بات پر یقین آ گیا تھا کہ ملزم فرید احمد نے اپنی بیوی کو دھکا دے کر بالکونی سے نیچے گرادیا تھا؟''

''سب یہی کہہ رہے تھے۔'' وہ الجھ گئی۔

''سب کی نہیں' میں آپ کی بات کررہا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''جناب! میں نے خود اپنی آنکھوں سے تو فرید صاحب کو شگفتہ کو دھکا دیتے ہوئے

دیکھا نہیں تھا اس لیے حلفیہ نہیں کہہ سکتی۔ یہ بات تو آپ اس واقعے کے عینی گواہوں سے پوچھیں۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے آپ کے خیال میں ملزم کیسا آدمی تھا۔ میرا مطلب ہے مزاج و عادات واطوار کے حوالے سے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے ان میں منفی طرز کی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی۔''

''میں نے سنا ہے' وہ خاصا آوارہ مزاج تھا؟''

''میں نے ان میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔''

''فوزیہ صاحبہ! کیا آپ کے خیال میں ملزم اپنی بیوی کو بالکونی سے دھکا دے سکتا ہے؟'' میں نے عام سے لہجے میں دریافت کیا۔

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''وقوعہ کے روز ملزم کا موڈ کیسا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے' شگفتہ کے آنے سے پہلے؟''

فوزیہ نے جواب دیا۔ ''صبح جب وہ دفتر آئے تو ان کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ وہ تقریباً گیارہ بجے دفتر پہنچے تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اس لیے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میڈم شگفتہ کے آنے کے بعد ان کے موڈ پر کیا اثرات مرتب ہوئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''مس فوزیہ! ذرا سوچ کر بتائیں۔ ذہن پر زور دیں۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز میڈم کے دفتر آنے سے کچھ دیر پہلے فرید احمد سے ملنے کوئی اور بھی آیا تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے میڈم شگفتہ سے چند منٹ پہلے کوئی خاتون آئی تو تھیں۔''

''وہ خاتون کون تھیں؟''

''میں انہیں نہیں جانتی۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔ ''میں نے اس وقت سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

اس خاتون کا حلیہ کیسا تھا؟''

''معافی چاہتی ہوں' میں اس بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکوں گی۔'' وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نہ تو ان کو اچھی طرح دیکھ سکی تھی اور نہ ہی ان سے بات چیت ہوئی تھی۔''

''کیا وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہی کمرے میں داخل ہوگئی تھی؟''

''جی ہاں' بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' فوزیہ نے بتایا۔ ''دراصل اس سب کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ میں اس وقت کام میں بہت مصروف تھی۔ بس وہ خاتون تیزی سے آئیں اور پلک جھپکتے میں فرید صاحب کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔ میں ان سے ایک لفظ نہ بول سکی۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ملزم نے انٹرکام پر آپ سے کوئی بات کی تھی؟''

''بالکل نہیں...... اور اسی لیے میں ان خاتون کی طرف سے مطمئن بھی ہوگئی تھی۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔ ''ورنہ میں تو توقع کر رہی تھی کہ ممکن ہے اس سلسلے میں مجھے فرید صاحب کی ڈانٹ سننا پڑے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''مس فوزیہ، ذرا سوچ کر بتائیں، وہ خاتون کتنے بجے ملزم کے کمرے سے باہر نکلی تھی؟''

''اوہ!'' میرے سوال کے جواب میں اس نے حیرت آمیز انداز میں ایک طویل سانس خارج کی۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے بتایا۔ ''اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ میں نے اس عورت کو فرید صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے تو دیکھا تھا لیکن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ پتا نہیں، وہ پراسرار عورت کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور کہاں چلی گئی تھی۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ متعجب نظر سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مس فوزیہ! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ پراسرار عوت اس شہر کی ٹاپ ماڈل روحی تھی۔ وہ آپ کی طرف والے دروازے سے فرید صاحب کے کمرے میں داخل ہو کر عقبی دروازے سے باہر نکل گئی تھی اسی لیے آپ اس کی روانگی سے بے خبر رہیں۔ آپ کو اس دفتر میں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے وہ آپ کے لیے اجنبی تھی ورنہ دفتر کا پرانا اسٹاف تو اسے اچھی طرح جانتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے جرح ختم کر دی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ روحی کے ذکر کے دوران میں وکیل استغاثہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوتے رہے تھے جیسے اس کے پیٹ میں شدید مروڑ اٹھ رہی ہو لیکن میں نے اسے قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔

اگلا گواہ ملزم کا منیجر طیب حسن تھا۔

ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ عدالت کے کمرے میں ایک وقت میں صرف ایک ہی گواہ کا بیان لیا جاتا ہے تاکہ اس کے بیان اور بیان کے نتیجے میں ہونے والی جرح کا اثر دوسرے گواہوں کے بیانات پر نہ پڑے۔ فوزیہ جب عدالت کے کمرے سے باہر نکل گئی اور جج نے گواہ طیب حسین کو حاضر کرنے کا حکم جاری کیا تو میں نے روئے سخن جج کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ گواہ طیب حسین سے پہلے مجھے اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔''

جج نے میری درخواست منظور کرتے ہوئے انکوائری افسر کو کٹہرے میں آنے کا اشارہ کر دیا۔

جج کی اجازت حاصل کر کے میں اس کے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے انکوائری افسر سے کہا۔ ''آئی۔او صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟''

اس نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ ''عبدالقدوس۔''

میں نے کہا۔ ''قدوس صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے دی گئی تھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''تقریباً چار بجے۔''

''اور آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''لگ بھگ ساڑھے چار بجے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو فون کے ذریعے اس واقعے کی اطلاع دی گئی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''فون کس نے کیا تھا؟''

''طیب صاحب نے۔''

''طیب صاحب نے آپ کو کیا بتایا تھا؟''

''ہمیں بتایا گیا تھا کہ ان کے دفتر میں ایک قتل ہوگیا ہے۔''

''آپ نے اس قتل کی تفصیل پوچھی تھی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ''اور طیب صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کے باس فرید احمد نے بالکونی سے نیچے گرا کر اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے موقع واردات پر پہنچ کر کیا دیکھا؟''

اس نے کہنہ سال ٹرک، شگفتہ کی لاش، وہاں اکٹھا ہونے والے مجمع اور گواہوں کے بیانات کی تفصیل بتائی۔ میں نے مزید چند سوالات کے بعد اس پر اپنی جرح ختم کر دی۔ اول آخر اس کا سارا زور اسی بات پر تھا کہ فرید نے مال جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ ایسی باتیں پورے وثوق سے استغاثہ میں بھی بیان کی گئی تھیں۔

اس کے بعد ملزم کا جنرل منیجر طیب حسین گواہی دینے کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد ایک طول طویل بیان ریکارڈ کروایا۔ یہ بیان ہو بہو وہی تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ وکیل استغاثہ نے جلد ہی اپنی جرح ختم کر دی۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''طیب صاحب! آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟''

وہ اس غیر متوقع سوال پر الجھ گیا تاہم اس نے جواب دیا۔ ''دہلی مسلم کالونی۔''

''آپ وہاں کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہوئے فوراً مداخلت کی۔ ''آبجیکشن یور آنر!''

میرے فاضل دوست غیر متعلق باتوں کو چھیڑ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔"اگر گواہ کو میرے سوال کا جواب دینے پر کوئی اعتراض ہو تو میں اس کے لیے اصرار نہیں کروں گا۔"

طیب نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔"مجھے دہلی مسلم کالونی میں رہتے ہوئے تقریباً پندرہ سال ہو گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔"طیب صاحب! آپ ملزم کے ساتھ کتنے عرصے سے تھے؟"

"جب سے اس نے ایڈورٹائزنگ ایجنسی بنائی تھی۔" اس نے جواب دیا "تقریباً پانچ سال سے۔"

میں نے کہا۔"مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ آپ پر بہت بھروسا کرتا تھا؟"

"آپ کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔"مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کی مقتولہ شگفتہ سے کوئی رشتے داری بھی نکلتی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔"میں مقتولہ کا کزن ہوں لیکن میں نے اپنی ملازمت کے دوران میں کبھی اس رشتے داری کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس ایجنسی کا ملازم ہی سمجھا تھا۔"

میں نے پوچھا۔"کیا ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے اکاؤنٹس کو بھی آپ ہی دیکھتے تھے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔"طیب صاحب! آپ تو روحی بی بی سے بخوبی واقف ہوں گے؟"

اس نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔"ہاں، میں اس فتنہ سامان کو کیونکر بھول سکتا ہوں۔"

"فتنہ ساماں......کیا مطلب؟"

وہ بولا۔"یہ سارا شر اسی کا پھیلایا ہوا ہے۔ وہ اگر فرید اور شگفتہ کے درمیان نہ آتی تو شاید آج شگفتہ زندہ ہوتی۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ بیزاری سے بولا۔"میں نے اس سلسلے میں اپنے بیان میں وضاحت کر دی ہے۔ ہاں، اتنا ضرور کہوں گا کہ فرید کو گمراہ کرنے والی روحی ہے۔"

میں نے کہا۔"میں نے سنا ہے، ملزم روحی سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا؟"

نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔"

شگفتہ کو یہ بات کسی طور گوارا نہیں تھی؟ ہیں نا!"

ہ بولا۔"کوئی بھی معقول بیوی ایسی صورتِ حال کو گوارا نہیں کر سکتی اور شگفتہ ایک معقول ا

شائستہ عورت تھی۔"

میں نے سوال کیا۔"طیب صاحب! میری معلومات کے مطابق تو روحی لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے آپ کی ایجنسی چھوڑ کر جا چکی تھی پھر آپ اس سانحے کے سلسلے میں اسے موردِ الزام کیوں ٹھہراتے ہیں؟"

وہ بولا۔"روحی ایجنسی چھوڑ کر گئی تھی، یہ شہر یا ملک تو نہیں چھوڑ گئی تھی۔"

"کیا آپ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ایجنسی سے لاتعلق ہونے کے باوجود بھی ان دونوں میں ربط ضبط قائم تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں کیا شک ہے۔"

"کیا آپ نے خود انہیں ملتے جلتے دیکھا تھا؟"

وہ گڑبڑا گیا۔"ہاں......نن......نہیں، میرا مطلب ہے، میں نے تو انہیں نہیں دیکھا تھا لیکن ظاہر ہے وہ ملتے تو ہوں گے اور پھر میں کون ہوتا ہوں اس بارے میں کھوج لگانے والا......"

اپنی بات ختم کر کے وہ پریشان نظر سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً کہا۔"طیب صاحب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ صرف قیاسات کی بنا پر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ روحی، ملزم سے اس دوران بھی ملتی رہی تھی۔"

"چلیں، آپ یونہی سمجھ لیں۔"

جج نے طیب حسین کو تنبیہہ کی۔"طیب صاحب! یہ عدالت آپ کے قیاس سننے کے لیے نہیں لگائی گئی۔ آپ جو بھی بات کریں، ٹھوس بنیادوں پر کریں۔"

"جی، میں اب اس بات کا خیال رکھوں گا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔"طیب صاحب! آپ نے ابھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ روحی کم و بیش ڈیڑھ سال قبل آپ کی ایجنسی سے لاتعلق ہو گئی تھی۔ کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ اس عرصے کے دوران میں آپ نے کبھی روحی کو اپنے دفتر میں دیکھا ہے؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔"طیب صاحب! مجھے پتا چلا ہے کہ وقوعہ کے روز لگ بھگ تین بجے روحی ملزم سے ملنے اس کے دفتر آئی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا۔"آپ کے چپراسی مقصود احمد نے اپنے بیان میں اس امر کی تصدیق کی ہے اور سیکریٹری فوزیہ درانی نے بھی کسی اجنبی عورت کو ملزم کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اجنبی اس لیے کہ وہ روحی کی صورت آشنا نہیں تھی۔ کیا آپ ان دونوں کے بیانات کو جھٹلانا چاہتے ہیں؟"

"میں نے بتایا ہے نا۔" میں نے روحی کو اس روز دفتر میں نہیں دیکھا تھا۔" وہ زچ ہوتے ہوئے

بولا۔

میں نے کہا۔ ''گویا آپ اس کی آمد کی تردید بھی نہیں کر رہے؟''

وہ بولا۔ ''میں تصدیق یا تردید کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ آپ روحی کی آمد کا جو وقت بتا رہے ہیں اس وقت میں اپنے کمرے میں تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کب آئی اور کب چلی گئی۔ یہ آپ انہی سے پوچھیں جنہوں نے آپ کو روحی کے دفتر آنے کے بارے میں بتایا ہے۔''

''طیب صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کہا ہے کہ ٹھیک تین بجے آپ اپنے کمرے میں موجود تھے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں، میں تین بجے اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ اس روز آپ نے لنچ دفتر سے باہر کیا تھا؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔''

''کیا آپ اکثر و بیشتر لنچ کے لیے دفتر سے باہر جاتے ہیں؟''

''نہیں، ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔''

''وقوعہ کے روز آپ کتنے بجے دفتر سے اٹھے تھے۔'' میں نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے لنچ کے لیے کتنے بجے کمرے سے نکلے تھے؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں تقریباً تین بج کر دس منٹ پر دفتر سے نکلا تھا۔''

''کیا آپ روزانہ اسی وقت لنچ کرتے ہیں؟''

''کم و بیش اسی وقت۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے دفتر سے نکلتے وقت اپنے باس فرید احمد کو اطلاع کر دی تھی؟''

''جی ہاں، میں نے انٹرکام پر انہیں مطلع کر دیا تھا۔''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ جب آپ دفتر سے باہر لنچ کے لیے جاتے تھے تو اکثر و بیشتر ملزم بھی آپ کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ کیا اس روز آپ اپنے باس کو ساتھ لے کر نہیں گئے تھے؟''

''میں نے انٹرکام پر ان سے پوچھا تھا۔'' طیب حسین نے جواب دیا۔ ''لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ شاید انہوں نے بتایا تھا کہ وہ بہت مصروف ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ اس وقت روحی بی بی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے جو آپ کے انٹر کام سے پہلے ہی دس پندرہ منٹ سے وہاں موجود تھی۔''

''یہ آپ کو معلوم ہوگا۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے دفتر سے نکلتے ہی شگفتہ بیگم وہاں پہنچ گئی تھیں کیا آپ اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''

''میں جب دفتر میں موجود ہی نہیں تھا تو اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ بے چارگی سے

بولا۔ ''مجھے تو واپسی پر پتہ چلا تھا کہ شگفتہ بیگم نہ صرف وہاں آئی تھیں بلکہ انہیں قتل بھی کر دیا گیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''طیب صاحب! آپ نے کس ریسٹورنٹ میں لنچ کیا تھا؟''

اس نے ایک معروف ریسٹورنٹ کا نام بتایا جہاں نہایت ہی عمدہ قسم کا فاسٹ فوڈ ملتا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''طیب صاحب! آپ لنچ سے واپس کب آئے تھے؟''

وہ بولا۔ ''میں جب دفتر کے نزدیک پہنچا تو اس وقت تقریباً پونے چار بجے تھے، ٹھیک پانچ منٹ پہلے میں ریسٹورنٹ سے نکلا تھا۔''

''آپ ریسٹورنٹ پیدل ہی گئے تھے؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''طیب صاحب! آپ اس مقدمے میں عینی گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا جس میں شگفتہ بالکونی سے نیچے گر گئی تھی؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ گری نہیں تھی بلکہ اسے دھکا دے کر گرایا گیا تھا۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ ملزم نے واقعی اسے دھکا دیا تھا۔'' میں نے پوچھا ''کیا یہ اتفاقی حادثہ نہیں ہو سکتا تھا؟''

''میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے واضح طور پر، دونوں ہاتھوں سے فرید کو، شگفتہ کو دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ سیدھی سیدھی قتل کی واردات تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''طیب صاحب! آپ کے خیال میں فرید احمد نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا ہوگا؟''

''تاکہ اس کے مال و جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کر سکے۔''

''اس کے علاوہ بھی قتل کی کوئی وجہ ہو سکتی تھی؟''

''میرے خیال میں نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ بھی استغاثہ کے حامی ہیں؟''

''صدفی صد۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی دانست اور بیان کے مطابق آپ نے اپنی آنکھوں سے شگفتہ بیگم کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ کیا آپ اس سلسلے میں کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟''

''میں نے شگفتہ کو قتل ہوتے نہیں بلکہ بالکونی سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' وہ تصحیح کرنے والے انداز میں بولا۔ ''اور اسے نیچے گرانے والا ملزم فرید احمد تھا۔ اس کی موت تو اس وقت واقع ہوئی تھی جب اس کا سر ٹرک میں موجود فرنیچر سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سانس درست کی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور اس ضمن میں بھلا میں کیا ثبوت پیش کر

سکتا ہوں۔ کاش اس وقت میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں وہ اہم منظر کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیتا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کے علاوہ بھی کسی شخص نے ملزم کو اپنی بیوی کو دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا کیونکہ اس سلسلے میں جو بھی افراد سامنے آئے ہیں انہوں نے کوئی حتمی بات نہیں کی ہے۔ بیشتر کو تو آپ ہی نے یہ اطلاع دی تھی۔''

''میں اس سلسلے میں آپ کی مزید کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو دیکھا تھا وہ بیان کر دیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ملزم اپنی بیوی کا قاتل ہے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''طیب صاحب! لنچ سے واپس آنے اور وہ اندوہناک واقع دیکھنے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام کیا کیا تھا؟''

''پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کروں۔'' وہ جذبات انگیز لہجے میں بولا۔ ''پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے فوری طور پر اس واقعے کی پولیس کو اطلاع دینا چاہیے۔ اس کے بعد میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور میں نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔''

''آپ نے کتنے بجے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا؟''

اس نے انکوائری افسر کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ اس نے ٹھیک چار بجے فون کیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے فون پر پولیس والوں کو کیا کہا تھا؟''

''میں نے انہیں اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کے الفاظ یہ تھے...... میرے باس نے اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گرا کر قتل کر دیا ہے؟''

''اس میں کیا شک ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''ایسا ہی تو ہوا تھا۔''

میں نے اس کے لہجے کی خشکی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پولیس موقع واردات پر کتنے بجے پہنچی تھی؟''

''تقریباً ساڑھے چار بجے۔''

میں نے کہا۔ ''اس دوران میں آپ کیا کرتے رہے؟''

''کچھ بھی نہیں، میں اپنے دفتر میں بیٹھ کر پولیس کا انتظار کرتا رہا۔''

''بہت خوب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ''اس میں بہت خوبی کی کیا بات ہے؟''

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ طیب صاحب! اس میں خوبی کی بات یہ ہے کہ آپ نے تقریباً پونے چار بجے اپنی مالکن کو بالکونی سے نیچے گرتے دیکھا۔ وہ ٹرک میں موجود فرنیچر سے ٹکرا کر بری طرح زخمی ہو چکی تھی اور آپ بجائے اسے فوری طبی امداد بہم پہنچانے کے اپنے دفتر میں بیٹھے پولیس والوں کا انتظار کرتے رہے۔ کیا اس موقع پر آپ کا فرض نہیں بنتا تھا کہ آپ فوری طور پر شگفتہ

بیگم کو کسی نزدیکی اسپتال کی ایمرجنسی میں پہنچاتے؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کیا فائدہ تھا۔ وہ تو ٹرک میں گرتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔''

''کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟''

''نہیں۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''پھر آپ اتنے وثوق سے یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ شگفتہ ٹرک میں گرتے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی؟''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہی بتاتی ہے۔'' اس نے عجیب جاہلانہ جواب دیا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''طیب صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو بہت بعد میں آئی تھی۔ میں اس موقع کی بات کر رہا ہوں جب انسانیت کے ناتے آپ کا فرض بنتا تھا کہ آپ پہلی فرصت میں شگفتہ کو کسی اسپتال پہنچاتے۔ سمجھ میں آئی بات؟''

وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔ ''کیا سب کچھ میرا ہی فرض بنتا تھا۔ شگفتہ کا شوہر آخر کس مرض کی دوا تھا۔ آپ اپنے موکل سے یہ بات پوچھیں کہ وہ اپنی بیوی کو فوراً اسپتال لے کر کیوں نہیں گیا؟''

میں نے کہا۔ ''جب میرے موکل اور اس مقدمے کے ملزم کے بیان کی باری آئے گی تو وکیل استغاثہ خود اس سے یہ سوال پوچھیں گے۔ فی الحال تو آپ میری جرح کا سامنا کر رہے ہیں۔ آپ کو میرے سوال کا جواب دینا ہو گا۔''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

میں نے ایک مختلف زاویے سے سوال کیا۔ ''طیب صاحب! آپ شگفتہ کے حوالے سے ملزم کے رشتے دار بھی لگتے ہیں یعنی ایک طرح سے ملزم آپ کا بہنوئی بھی ہے۔ وہ اپنے مسائل کا اکثر آپ سے تذکرہ کرتا رہتا ہو گا خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ آپ کو انتہائی قابل بھروسا بھی سمجھتا تھا؟''

''میں نے کہا نا، میرے نزدیک رشتے داری اور ملازمت دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہیں اور میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں نے کبھی ملزم کا رشتے دار ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا۔'' وہ قدرے بیزار کن لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں فائدہ اٹھانے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ وہ اپنے مسائل میں آپ کی مدد تو لیتا تھا نا؟''

''ظاہر ہے، میں اس کی ایجنسی میں کام کرتا تھا تو اس کے کام بھی آتا تھا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پوچھنے والی بات یہ ہے کہ کبھی ملزم نے آپ سے اپنی کسی ایسی پریشانی کا ذکر کیا تھا کہ کسی مخبر کی وجہ سے اسے خاصی مشکلات کا سامنا ہو؟''

وہ میرے سوال کا مطلب سمجھ گیا' خیال افروز لہجے میں بولا۔ ''ہاں' ملزم اس سلسلے میں اکثر پریشان رہتا تھا کہ اس کے اور روحی کے میل تال کی خبریں کوئی نہایت ہی رازداری سے اس کی بیوی تک پہنچا دیتا تھا۔ وہ اس مخبر نما جاسوس یا جاسوس نما ورکر کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔''

اس کے منہ سے ایک اہم بات نکل گئی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''طیب صاحب! ورکر سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا لیکن کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں آسکتے اس لیے بات بناتے ہوئے بولا۔ ''وہ دراصل بات یہ ہے کہ ملزم کو شک تھا کہ اس کے دفتر کا ہی کوئی آدمی شگفتہ تک وہ پراسرار اطلاعات پہنچاتا تھا۔''

''کیا اسے کسی خاص آدمی پر شبہ بھی تھا؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ''لیکن ازاں بعد اس کا شک غلط ثابت ہو گیا تھا۔''

''ذرا اس کی تفصیل سے معزز عدالت کو آگاہ کریں گے آپ؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے استفسار کیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملزم کا خیال تھا کہ اس کی سیکریٹری انیتا اس قسم کی خبر رسانی میں ملوث تھی لیکن جب اس نے انیتا کی چھٹی کر دی تو پھر بھی ان اطلاعات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''غالباً انیتا کو وقوعہ سے تقریباً تین ماہ قبل فارغ کیا گیا تھا؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' وہ بولا۔

''اور وقوعہ سے تقریباً ایک سال پہلے روحی نے آپ کے دفتر آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔'' میں نے کہا ''پھر انیتا کو اتنی تاخیر سے برطرف کرنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟''

وہ بولا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ روحی نے بظاہر تو ملزم سے ہر تعلق ناتا توڑ دیا تھا لیکن درپردہ ان کی ملاقاتیں جاری تھیں اور گاہے بہ گاہے ان ملاقاتوں کی خبریں شگفتہ تک پہنچتی رہتی تھیں اس لیے ملزم کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کے باہمی تعلقات کی مخبری سے انیتا کا کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اس کی برطرفی کے باوجود بھی یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے موکل کا بیان ہے کہ وہ سر توڑ کوشش کے باوجود بھی اس پراسرار مخبر کو ٹریس کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی؟''

''جس حد تک ہو سکتا تھا؟ میں نے مدد کی تھی؟''

''آپ کا کیا خیال ہے' اس معاملے میں دفتر کا کون سا آدمی ملوث ہو سکتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے' وہ کوئی دفتر سے باہر کا آدمی ہو گا جسے میڈم شگفتہ نے ملزم

اور روحی کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہو گا۔''

''میرے موکل کے مطابق شگفتہ اس مخبر کو بھاری معاوضہ بھی ادا کرتی تھی؟'' میں نے سوالیہ نظر سے طیب حسین کو دیکھا۔

وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ ''ظاہر ہے' اس قسم کے کام بھاری معاوضوں پر ہی کیے اور لیے جاتے ہیں کیونکہ اس میں رازداری کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''طیب صاحب! وقوعہ کے روز شگفتہ نے فون کر کے ملزم کو بتایا تھا کہ وہ اس روز اپنی سلمیٰ آنٹی کے پاس جائے گی لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ دفتر میں آن دھمکی اور تلخ و ترش باتوں کے تبادلے میں اس پر یہ بھی انکشاف کیا کہ اس نے وہ فون اس لیے کیا تھا تا کہ رنگے ہاتھوں ان دونوں کو پکڑ سکے۔ اس کا مطلب تھا' شگفتہ کو روحی کی دفتر میں آمد کی اطلاع مل گئی تھی؟''

''ظاہر ہے ایسا ہی ہوا ہو گا۔''

''آپ کے خیال میں یہ اطلاع شگفتہ تک کس نے پہنچائی ہو گی؟'' میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے یہ کوئی ایسا شخص ہو گا جس نے روحی کو دفتر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہو گا کیونکہ یہ بات تو طے ہے کہ وہ پہلے سے بنائے ہوئے پروگرام کے تحت ملزم سے ملنے نہیں آئی تھی؟''

''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ لاتعلقی سے بولا۔ ''یہ تو آپ شگفتہ ہی سے جا کر پوچھیں کہ اس کو دفتر میں روحی کی آمد کی اطلاع کس نے دی تھی!''

''یہ تو اب ممکن نہیں رہا۔'' میں نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''شگفتہ اب سب کی پہنچ سے دور جا چکی ہے۔''

طیب حسین محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

میں نے اچانک پوچھا۔ ''طیب صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شگفتہ اپنے شوہر اور روحی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی اور اسے اس کا سنہری موقع بھی مل گیا تھا لیکن پھر روحی بچ کر کس طرح نکل گئی؟''

''ملزم کی چالاکی سے۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

پھر وہ پریشان نظر سے کبھی وکیل استغاثہ اور کبھی جج کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''ملزم کی چالاکی سے آپ کی کیا مراد ہے طیب صاحب؟''

وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... دراصل میرا مطلب...... میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ...... ظاہر ہے ملزم ہی نے اسے وہاں سے نکالا ہو گا۔''

''مگر کیسے۔'' میں نے اپنے الفاظ پر زور دے کر کہا۔ ''روحی کے وہاں آنے کے تو آثار ملتے ہیں لیکن جانے کے شواہد ندارد ہیں۔ اس مسئلے پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟''

''میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

جج نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ میری طرح جج کو بھی یہ احساس ہوگیا تھا کہ گواہ طیب حسین کوئی بات چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے ایک نئے انداز سے سوال کیا۔

''طیب صاحب! میں جانتا ہوں روحی' ملزم کے کمرے سے کیسے نکلی تھی۔'' تھوڑی دیر رک کر میں نے اسے وہ تفصیل بتائی جو مجھے روحی کی روانگی کے بارے میں اپنے موکل کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ وہ محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے سنتا رہا لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ خاصا الرٹ ہوگیا تھا۔

میں نے پوچھا۔''طیب صاحب! آپ نے اپنے بیان اور بعدازاں میری جرح کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم نے محض مال و دولت' جائیداد اور کاروبار کے حصول کے لیے اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گرا کر ہلاک کیا ہے۔ آپ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ قتل کے کیس میں ملوث کوئی شخص کسی قسم کی جائیداد یا وراثت کا حق دار نہیں ہوتا۔ اب آپ کے خیال میں یہ سب مال ومتاع کس کے کھاتے میں جائے گا؟''

''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''میں وراثت کے قانون کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتا۔''

میں نے اچانک عام سے لہجے میں سوال کیا۔''آپ کون سے برانڈ کا سگریٹ پیتے ہیں؟''

وہ بولا''گولڈلیف۔''

میں نے پوچھا۔''وقوعہ کے روز غالباً آپ نے چوکیدار جبل خان کو سگریٹ لینے کے لیے بھیجا تھا؟''

''ہاں۔''اس نے اثبات میں جواب دیا۔

پھر عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

❁❁❁

اگلی پیشی پر ملزم فرید احمد کا تفصیلی بیان لیا گیا جس میں اس نے میری ہدایت کے مطابق سب کچھ کھول کر بیان کردیا تھا اس نے وقوعہ کے روز پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں کوئی بات نہیں چھپائی تھی حتی کہ روحی کی آمد' اس سے ہونے والی گفتگو' پھر اس کی روانگی اور شگفتہ کی آمد و جھگڑے سے لے کر اس کو پیش آنے والے حادثے تک کے واقعات تمام تر جزئیات کے ساتھ عدالت کے سامنے بیان کردیے تھے۔

وکیل استغاثہ نے اس روز میرے موکل پر بڑی تند و تیز جرح کی لیکن فرید احمد ثابت قدمی سے اس کے سامنے ڈٹا رہا۔ خاص طور پر وکیل استغاثہ نے روحی کے حوالے سے بہت چبھتے ہوئے سوالات کیے تھے لیکن میرے موکل نے بڑی جواں مردی سے اس کی جرح کا سامنا بلکہ مقابلہ کیا تھا۔

آئندہ پیشی پر بعض باتوں کی تصدیق کے لیے روحی کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ صفائی کے گواہ کا کردار ادا کرتے ہوئے روحی نے وکیل استغاثہ اور جج کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیا۔

اس کارروائی کے بعد جج نے دلائل کے لیے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔ اب اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا۔

❁❁❁

آئندہ پیشی پر پہلے وکیل استغاثہ نے اپنے دلائل پیش کیے۔ اس کی پرجوش تقریر میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا گیا تھا کہ ملزم نے شگفتہ کی دولت و جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنے کے لیے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے دلائل کے آخر میں اس نے معزز عدالت سے ملزم کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا۔

وکیل استغاثہ کے بعد میری باری آئی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنے دلائل کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! کئی صفحات پر مشتمل استغاثہ میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ میرے موکل نے ایک طے شدہ اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گرا کر ہلاک کیا ہے لیکن استغاثہ اپنے گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح سے قطعاً یہ بات ثابت نہیں کرسکا کہ میرے موکل نے واقعی ایسا کیا ہوگا۔ اس ضمن میں' میں مرحلہ وار اہم نکات معزز عدالت کے علم میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے بولنا شروع کیا۔''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ اور ملزم کے چپراسی مقصود احمد کے بیان کے مطابق دونوں میاں بیوی کے درمیان کشیدگی پائی جاتی تھی اور ملزم کا کردار اور مزاج تسلی بخش نہیں تھا لیکن میرے سوالات کے جواب میں یہ بات ثابت ہوئی کہ گواہ کا موقف سنی سنائی باتوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے بیان کے حق میں کوئی دلیل پیش نہیں کرسکا پھر گواہ نے اس بات کی تصدیق بھی کی ہے کہ وقوعہ کے روز لگ بھگ تین بجے سہ پہر روحی ملزم کے دفتر میں اس سے ملنے آئی تھی۔ ملزم اپنے بیان میں اس بات کی وضاحت کرچکا ہے کہ اس نے روحی کو کس راستے سے وہاں سے روانہ کیا تھا لیکن پورے استغاثہ میں اس اہم ترین کردار یعنی 'روحی'' کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ یہ ایک توجہ طلب اور قابل غور بات ہے۔

''جناب عالی! راہ گیر منیر شگفتہ کو استغاثہ کی جانب سے بطور گواہ پیش کیا گیا کہ اس نے ملزم کو اپنی بیوی کو دھکا دیتے ہوئے دیکھا تھا لیکن میرے سوالات کے نتیجے میں اس عینی گواہ کا پول کھل گیا۔ وہ اپنے بیان یا موقف کے بارے میں تذبذب کا شکار نظر آتا ہے۔

''یور آنر! ٹرک ڈرائیور قادر لالہ کے بیان سے بھی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی اور چوکیدار جبل خان کے بیان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے محض خانہ پری کے لیے استغاثہ کے گواہوں کی

فہرست میں شامل کیا گیا ہے‘ اسے منیجر طیب حسین کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہاں کوئی حادثہ رونما ہو گیا تھا۔‘‘

ایک لمحے کے توقف سے میں نے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’جناب عالی! اب ملزم کی سیکریٹری مس فوزیہ درانی کے بیان کی طرف آتے ہیں۔ اس کا نام اگرچہ استغاثہ کے گواہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن اسے اس واقعے کا علم چپراسی مقصود احمد کی زبانی ہوا تھا۔ فوزیہ کے بیان سے ایک بات سامنے آتی ہے۔ اس کے مطابق وقوعہ کے روز لگ بھگ تین بجے سہ پہر کوئی خاتون ملزم سے ملنے آئی تھی۔ مقصود احمد کے بیان کے مطابق وہ خاتون روحی ہی تھی۔ فوزیہ چونکہ اس کی صورت آشنا نہیں تھی اس لیے وضاحت نہیں کر سکی۔ فوزیہ کے بیان سے بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وقوعہ کے روز روحی ملزم سے ملنے آئی تھی لیکن استغاثہ میں روحی کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں ملتا۔

’’جناب عالی! استغاثہ کے سب سے اہم گواہ‘ ملزم کے جنرل منیجر طیب حسین کا بیان اور اس پر ہونے والی جرح کا احوال معزز عدالت سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اس بات کا دعوے دار ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو‘ اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گراتے ہوئے دیکھا ہے لیکن وہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا پھر اس کا موقف کہ ملزم نے مال و جائیداد اور کاروبار پر قابض ہونے کے لیے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے قطعاً قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ میں اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ بیان کرنا چاہوں گا۔‘‘

ایک لمحہ توقف کر کے میں نے بولنا شروع کیا۔ ’’جناب عالی! یہ سامنے کی بات ہے کہ جب کوئی شخص باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ خاصی سوچ بچار کے بعد ایسی بے داغ اور شفاف منصوبہ بندی کرتا ہے کہ جس میں ناکامی کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ اس بات کو عام ذہنی سطح رکھنے والا کوئی شخص بھی بہ خوبی سمجھ سکتا ہے۔ اب اس بات کو موجودہ کیس کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملزم نے کسی بھی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل ایسے اقدام کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا جس کی تفصیل میرے موکل نے اپنے بیان میں پیش کر دی ہے۔

’’اگر میرا موکل باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی بیوی کو بالکونی سے نیچے گراتا تو پھر اسے ایسے وقت یا موقع کا انتظار کرنا چاہیے تھا جب اس کی اس کارروائی کو دیکھنے والا وہاں کوئی موجود نہ ہوتا۔ کیا کوئی قاتل‘ قتل کا ایسا منصوبہ بنا سکتا ہے جس میں اس کے پکڑے جانے کے صد فی صد امکانات موجود ہوں۔ اگر استغاثہ کا موقف سچ تسلیم کر لیا جائے تو کیا اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی ہے کہ میرے موکل نے سراسر خود کو پھنسوانے کا منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ اس طرح تو وہی شخص کر سکتا ہے جسے اپنی زندگی کی کوئی پروا نہ ہو۔ میرا موکل بہرحال اپنی زندگی سے بہت محبت کرتا ہے اور ایسی حماقت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

’’جناب عالی! میں ایک اور نہایت ہی اہم پوائنٹ کی طرف معزز عدالت کی توجہ مبذول کروانا

چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے معتدل لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ’’یہ بات روز روشن کی مانند عیاں ہے کہ میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی خوبیوں‘ خامیوں اور کمزوریوں سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی دوسرے کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ دوسرے قاتلوں کی بہ نسبت زیادہ جامع‘ قابل عمل اور بے داغ منصوبہ بندی کر سکتا ہے اور اس سلسلے میں نہایت ہی آسان‘ سہل اور محفوظ طریقہ بھی استعمال کر سکتا ہے جس میں اس کی پکڑ کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوں لیکن موجودہ صورت حال میں استغاثہ کے موقف کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں کیونکہ اگر استغاثہ کا موقف درست مان لیا جائے تو میرے موکل کی ذہنی کیفیت مشکوک ہو جاتی ہے جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ اگر واقعی وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تو ایسا بھونڈا‘ ناقص اور قابل گرفت طریقہ ہرگز ہرگز استعمال نہ کرتا۔

’’یور آنر! ان حالات و واقعات اور شواہد کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قاتل ٹھہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے جب کہ وہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ جس نے شگفتہ کی جان لے لی۔ اگر وہ اپنے جذبات پر کنٹرول رکھتی‘ اشتعال میں آ کر اپنے شوہر پر ہاتھ نہ اٹھاتی تو صورت حال قطعی مختلف ہوتی۔

’’جناب عالی! ان دلائل کی روشنی میں‘ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ میرے موکل کو باعزت بری کیا جائے۔ وہ اس معاشرے کا ایک معزز فرد ہے اور اس مقدمے کی وجہ سے اس کی شہرت کو خاصا نقصان پہنچ چکا ہے۔‘‘

اس کے بعد میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات اور فائلوں کا مطالعہ کرتا رہا پھر اٹھ کر اپنے مخصوص چیمبر میں چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا‘ کرسی انصاف پر براجمان ہونے کے بعد اس نے فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

❁ ❁ ❁

آئندہ پیشی پر عدالت کے کمرے میں خاصا رش تھا۔ اس روز فریقین کے عزیز و اقارب کے علاوہ اخباری نمائندے اور کچھ فوٹو گرافرز بھی وہاں موجود تھے۔ گہما گہمی کا سا سماں تھا۔ میں بروقت عدالت پہنچ گیا تھا۔

جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کیا اور صرف دس منٹ کے اندر اس مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ ناکافی ثبوت کی بنا پر جج نے ملزم اور میرے موکل فرید احمد کو باعزت بری کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

چند روز بعد میں اس مقدمے اور اس کے کرداروں کو بھول گیا پھر اچانک ایک روز اس واقعے کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ تین چار ماہ بعد کی بات ہے۔ ایک شام فرید احمد میرے دفتر میں نمودار ہوا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مٹھائی کا ایک ڈبا میری جانب بڑھایا۔ میں نے سوالیہ نظر سے

اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے ایک کارڈ کی جانب اشارہ کیا۔ پہلے اس کارڈ پر میری نظر نہیں گئی تھی حالانکہ وہ ڈبے کے ساتھ ہی تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ بولا۔ ''میری شادی کا دعوت نامہ ہے بیگ صاحب!''

''اوہ۔'' میری حیرت دوچند ہو گئی پھر پوچھا۔ ''کس سے شادی ہو رہی ہے آپ کی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''روحی سے۔''

میں نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

وہ بولا۔ ''بیگ صاحب! میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ روحی واقعی میرے لیے بہت اچھی بیوی ثابت ہو گی۔''

میں نے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا ۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

فرید احمد نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''بیگ صاحب! میری ایڈورٹائزنگ ایجنسی دوبارہ دوڑنے لگی ہے اور پتا ہے، میں نے اس مرتبہ کس شخص کو اپنا جنرل منیجر چنا ہے۔''

میں نے اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ ''یقیناً روحی کو۔''

''آپ ہار گئے۔'' وہ تبسم ریز لہجے میں بولا۔ ''روحی تو صرف میرے گھر کو رونق بخشے گی۔ میں نے اپنی ایجنسی کے لیے طیب حسین کو منیجر مقرر کیا ہے۔''

''طیب حسین!'' مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

''ہاں بیگ صاحب۔'' وہ ہمدردی آمیز انداز میں بولا۔ ''اس نے اپنی سابق کوتاہیوں کا نہ صرف اعتراف کر لیا ہے بلکہ مجھ سے معافی بھی مانگ لی ہے۔''

پھر اس نے بتایا کہ طیب حسین ہی شگفتہ کے لیے مخبری کیا کرتا تھا اور اس سلسلے میں شگفتہ اسے اچھی خاصی رقم ادا کرتی تھی اور یہ کہ اب اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ فرید احمد کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ آخر میں اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! اس واقعے نے تو طیب کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔ اب وہ ایک بالکل مختلف انسان دکھائی دیتا ہے۔ انتہائی سلجھا ہوا اور معقول۔ مجھے امید ہے کہ وہ میرا سچا ہمدرد ثابت ہو گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

فرید احمد مجھ سے اپنی شادی میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گیا۔

✿ ✿ ✿